کاشف الحقائق

جلد دوم



سید امداد امام اثر مرحوم

از زمین تا بہ آسمان سخن است

کاشفُ الحقائق

معروف بہ

بہارستانِ سخن

مشتمل بر شاعری ہائے مختلف اقوامِ جہان

از تصانیف

عالیجناب نواب سید امداد امام صاحب زیدی واسطی متخلص بہ اثر و مخاطب بہ نواب شمس العلما بحکم گورنمنٹ ہند متوطن نیورہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار و مصنف کتاب مراۃ الحکما و کتاب الاثمار و مصباح الظلم و کتاب الزراعت و ہدیہ قیصریہ و معیار الحق و رسالہ طاعون و دیوان اثر وغیرہ وغیرہ

جلد دوم

مکتبہ معین الادب اُردو بازار لاہور

طبع دوم — جنوری ۱۹۵۶ء — تعداد ۱۰۰۰

حرفِ ناشر

زیرِ نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن میں غلطیوں کی ایک بڑی تعداد باقی رہ گئی تھی جسے "غلط نامہ" کے تحت (جو بائیس صفحات پر مشتمل تھا) کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا تھا۔ طبعِ جدید میں یہ غلط نامہ اڑا کر حتی المقدور متن کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس کے سوا اور کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا گیا۔

معین الدین حزیںؔ کاشمیری

فہرست مضامین کتاب

کاشف الحقائق

جلد دوم

جس میں فارسی اور اُردو کی شاعری کا بیان حوالۂ قلم ہوا ہے

حامداً و مصلیاً

فارسی اور اُردو شاعریاں واحد المذاق

چونکہ دونوں زبانوں کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے اس لیے دونوں کا ذکر اجمالی طور پر کیا جاتا ہے جقیقت حال یہ ہے کہ اُردو کی موجودہ شاعری فارسی کی شاعری کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں زبانوں کی شاعریاں اصناف کے اعتبار سے برابر ہیں اور خیالات کا رنگ تمام تر ایک ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اُردو کے شعرا فارسی کے ہمیشہ متتبع رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُردو کی شاعری باوجود اس کے کہ اس کو فروغ ہندوستان میں ہُوا ہے۔ سنسکرت کی شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ حالانکہ تقاضائے ملکی یہی تھا۔ کہ اُردو کی شاعری سنسکرت کی شاعری

کا انداز پیدا کرتی۔ لاریب اگر اردو کے شعراء شعرائے سنسکرت کا تتبع اختیار فرماتے تو اردو کی شاعری کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی۔ مگر اس عدم تتبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اردو کے شعراء زبان سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے شعرائے فارسی کے سوا انھیں اور کسی دوسری زبان کے شعراء کے تتبع کا موقع حاصل نہ تھا۔ کاش شعرائے اردو شعرائے سنسکرت سے مطلع رہ کر ان کے متتبع ہوتے تو اردو میں اصناف شاعری کا عدد بڑھ جاتا۔ مثلاً ڈراما نگاری اردو شاعری میں داخل ہو جاتی اور اس جدت سے اردو شاعری کا وزن یقیناً اہل یورپ کے نزدیک ترقی کر جاتا اور اس ترقی سے زبان اردو کا شمار اعلیٰ درجے کی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا۔ ڈراما نگاری کے داخل ہو جانے سے اردو کی شاعری بلا شبہہ ممتاز تر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ ڈراما نگاری فارسی میں نہیں ہے اور اگر ہے تو ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ پس اگر ڈراما نگاری اردو میں آجاتی تو فارسی کی شاعری کو اردو کی شاعری کے ساتھ کوئی صورت مقابلے کی نہیں رہتی۔ ڈراما نگاری کے علاوہ سنسکرت میں ایک بہت اعلیٰ درجے کی رزمی شاعری دیکھی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے رامائن اور مہابھارت پڑھی ہیں راقم کے ساتھ اس امر میں ضرور اتفاق رائے فرمائیں گے کہ دونوں تصنیفوں کا جواب فارسی میں نہیں ہے، عربی تو اس صنف شاعری کے اعتبار سے خارج از مبحث ہے اس لئے کہ عربی میں جب مثنوی نگاری نہیں ہے تو ایسی مبسوط کتابوں کا موجود رہنا ہی خلاف توقع ہے۔ فارسی میں جو کتاب شاہنامہ ہے بھی تو اس کی شکل تاریخ نما ہے۔ خاص کسی واقعے کا بیان رزمی شاعری کے

پیرائے میں نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے خود فردوسی کی شاعری بالمکی اور بیاس کی
شاعریوں کو نہیں پہنچتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔ بالمختصر اگر اُردو کے شعرا نے
سنسکرت کے شعرا کا تتبع فرمایا ہوتا تو اس وقت تک اُردو کی شاعری نے بہت
کچھ ممتاز صورت پیدا کی ہوتی شاید ایسی حالت میں اُردو کی شاعری کا جواب
دنیا میں کمتر ملتا۔ لاریب اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری پر من جمیع الوجوہ بہت
غالب آجاتی۔ کس واسطے کہ فارسی کی شاعری سنسکرت کی شاعری کے برابر نہ
رفیع ہے اور نہ وسیع ہے۔ بلا گفتگو سنسکرت کی وہ رفیع شاعری ہے کہ جس کی قوت
کو شعرائے عالم میں صرف شکسپیئر پہنچتا ہے ہومر ورجل اور ملٹن بہت
پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال اُردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میر انیس
صاحب کو شعرائے اُردو کے زمرے سے نکال دیجیے تو اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری
سے بہت پیچھے پڑ جاتی ہے یہ صرف جناب غفران مآب کا کمال ہے کہ جس کی
بدولت اُردو کی رزمی شاعری کا پایہ بہت بلند نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اُردو
کی شاعری نہ صرف فارسی کی رزمی شاعری سے اعلیٰ دکھلائی دیتی ہے۔ بلکہ یونانی،
لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے بھی بہ اعتبار بالا ارفع پائی جاتی ہے لاریب
حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھلایا ہے کہ جس کے مشاہدے
سے عقل دنگ ہو جاتی ہے اگر حضرت نے کوئی کتاب رامائن مہا بھارت
ایلیڈ اینیڈ شاہنامہ یا پیریڈائز لاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی ہے تو
بھی رزمی شاعری کا خاتمہ کر دکھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی رزمی
شاعری کا جواب دنیا میں بالمکی اور بیاس کی تصنیفات کے سوا کہیں نہیں پایا

جاتا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ میر انیس صاحب کی شاعری کی بحث آئندہ آئے گی۔ جس سے حقیقت حال ظاہر ہوگی۔

ملک فارس کا بیان

براعظم ایشیا کے ملکوں سے فارس بھی ایک نامی ملک ہے۔ اس کے غرب میں ملک شام اور شمال میں ملک قاف و بحر کیسپین اور شرق میں افغانستان و بلوچستان اور جنوب میں بحیرۂ فارس و بحیرۂ عرب واقع ہیں۔

ہندوستان سے پچھم میں فارس سے کوئی ملک ایشیا میں متمول تر نہیں ہے یہ ملک بارہ حصوں میں تقسیم ہے یعنی آذربیجان۔ عراق عجم۔ لورستان خوزستان۔ فارس۔ لارستان۔ کرمان۔ گیلان۔ مازندران۔ استرآباد۔ قروستان خراسان۔ اس کا رقبہ ۵ لاکھ میل کا ہے اور قریب دس کروڑ کے اس کے سکنا کا عدد ہے۔ کوہستان کی کثرت ہے۔ کوہ قاف کی شاخیں اس ملک میں نکل آئی ہیں اور شمال کی جانب کوہ البرز بھی واقع ہے یہ وہی پہاڑ ہے جس کا ذکر علاوہ قاف کے شعرائے فارس اکثر کرتے گئے ہیں۔ علاوہ کوہستان کے بڑے بڑے صحرا بھی ہیں جن کی زمینیں محض شور ہیں۔ کوہستان و صحرا و دشت کی اراضی تمام ملک فارس کے تیسرے حصے سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے، خاص ملک فارس میں کوئی بڑا دریا اٹک یا گنگا کے انداز کا نظر نہیں آتا ہے گو چھوٹے دریا، ندی، چشمے، جھیل کی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے اسی لئے ملک کی شادابی میں کوئی فتور نہیں پڑتا ہے۔ پرورده جانور اس ملک کے وہی ہیں جو اور اقالیم میں ہوا کرتے ہیں، لیکن یہاں کے خچر، اونٹ اور گدھے بہت ممتاز صورت ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کے بکریاں

اس قدر عمدہ ریشم پیدا کرتی ہیں کہ تبت کی بکریوں سے برابری کرتی ہیں۔ صحرائی جانور از قسم آہو وغیرہ کثیر الوجود ہیں اور درندوں سے قابل ذکر شیر، خرس، ببر، پلنگ، یوز، گرگ۔ شغال، روباہ اور کفتار ہیں۔ پیداوار ملک میوہ جات کے اعتبار سے بہت ہے انگور بکثرت ہوتا ہے اور چونکہ توت کی کھیتی آسانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریشم کے کیڑے بکثرت پرورده کئے جاتے ہیں۔ ریشم کی تجارت ایران میں بڑی فراغت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ نیشکر کی کاشت بھی بعض حصوں میں حسب مراد ہوتی ہے اور افیون کے پیدا کرنے کی نظر سے لالے کی کاشت بڑی مستعدی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایران کی تجارت افیون کی اسی لئے قابل امتیاز معلوم ہوتی ہے۔ پھولوں میں گلاب کی کاشت تجارت کی نظر سے بکثرت کی جاتی ہے حتیٰ کہ ایران کے عطر گلاب کی شہرت ہند تک پھیلی ہوئی ہے، اہل عجم گلاب کو اپنی زبان میں گُل کہتے ہیں اور گلاب اس عرق کو کہتے ہیں جو اس سے تیار کیا جاتا ہے، اردو کے شعرا بھی گلاب کو گل کہتے ہیں، مگر عموماً زیادہ گلاب ہی بولا جاتا ہے۔ ایران کی معدنی پیداوار مختصر معلوم ہوتی ہے۔ سنگ نمک کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ قیمتی پتھروں کی بھی کانیں ہیں مگر فیروزہ جس قدر ملک ایران میں اچھا اور بڑا دستیاب ہوتا ہے کسی ملک میں نہیں ہوتا۔ دستکاری کے اعتبار سے اہل ایران ایک ممتاز قوم ہیں۔ یہاں عمدہ اقسام کے ریشمی اور پشمی کپڑے خوب بنے جاتے ہیں۔ آلات حرب اچھے بنتے ہیں۔ شال، دوشالے دری قالین نفیس سے نفیس تیار ہوتے ہیں، ظروف چینی یہاں کے چین کے ظروف کا جواب دیتے ہیں اس ملک کی تعلیم یافتگی اہل یورپ کی تحریر کے رو سے تمام ایشیائی ملکوں کی تعلیم یافتگی پر غلبہ رکھتی ہے الا زمانہ حال میں جاپان کہ جس نے

ایک عرصۂ قلیل میں ایک حیرت انگیز ترقی کا عالم دکھایا ہے۔ اہل ایران بالطبع خوش پسند، خوش طبع اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ درس وتدریس سے شوق رکھتے ہیں، اور اقسام علوم کی طرف اُن کی طبیعت میں ایک خلقی میلان پایا جاتا ہے۔ اس وقت کے ایران کا مذہب دین محمدی ہے اہلسنت کے اعتبار سے امامیہ مذہب والے زیادہ اس ملک میں پائے جاتے ہیں بلکہ شاہی مذہب اس ملک کا بزبان حال امامیہ ہے۔ سلطنت شخصی انداز رکھتی تھی یعنی شاہ کو ہر امر میں اختیار کامل رہتا تھا۔ مگر حال میں پارلیمنٹ وغیرہ کی پابندی کا رنگ دکھلائی دیتا ہے واضح ہو کہ ملک ایران صدہا صدیوں سے مشہور دیار و امصار رہا ہے۔ کیانیوں کی سلطنت ایک وقت میں منتہائے عروج کو پہنچی تھی۔ پھر عہد دارا میں سکندر اعظم نے اس ملک کو فتح کیا، پھر ساسانیوں نے اپنا سلسلۂ حکومت قائم کیا، اس کے بعد اہل عرب نے اسے اپنا کر لیا۔ پھر اس پر چنگیز اور تیمور حملہ آور ہو کر مالک ملک ہوتے گئے ترکوں نے بھی اس کے مغربی حصے پر یورشیں کر کے اس کی حالت بدل ڈالی آخر کار ۱۵۰۱ء میں اسمٰعیل صفوی نے اپنی سلطنت قائم کی۔ خاندان صفوی ایک عرصے تک حکمران رہا۔ مگر جب شاہان صفوی میں ضعف لاحق ہو گیا تو اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں افغانوں نے ملک ایران پر سخت حملہ کیا اور بہت کشت وخون کے بعد قابض ملک ہو گئے اس ہنگامے کا ذکر شیخ محمد علی حزین اپنے سوانح عمری میں فرماتے ہیں۔ افغانوں کا قبضہ ایران پر بہت مختصر رہا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد نادر شاہ نے افغانوں سے خوب بدلہ لیا۔ نادر شاہ کے انتقال کے بعد ملک میں سخت خانہ جنگیاں شروع ہوئیں آخر کار بہت رگڑے جھگڑے کے بعد آغا محمد خواجہ سرا بڑی

بڑی حکمت عملیوں سے اس ملک پر مستولی ہو گیا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا بھتیجا اُس کا جانشین ہوا۔ یہ بھتیجا وہی نامی گرامی فتح علی شاہ تھا جس کے خاندان میں اس وقت ایران کی سلطنت ہے۔

اگر کسی قوم کو شاعری کی طرف میلان نہیں ہے تو اس کی نسبت یہ بات تمام تر صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس قوم کے فطری تقاضوں میں ضرور کسی نہ کسی قسم کا نقصان لاحق ہے، لاریب روح کو سچی خوشی بخشنے والی اور اسفل سے اعلیٰ کی طرف لیجانے والی کوئی شئے شاعری سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جتنی ممتاز قومیں دنیا میں گزری ہیں یا اس وقت موجود ہیں شاعری کے میلان سے خالی نہیں ہیں ایسی صورت میں اہل ایران کا شاعری کی طرف مائل ہونا کوئی امر خلاف توقع نہیں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اہل ایران کو شاعری کی طرف بہت بڑا میلان ہے کم ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ ایرانی ہوگا جو کچھ نہ کچھ کہہ نہ لیتا ہوگا یا اُستادوں کے کلام سے لذت یاب نہ ہوتا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک ایران شاعری کا ملک ہے فطرت نے اُسے ایسی خوبیاں بخشی ہیں کہ وہاں شاعروں کی کثرت خلاف فطرت نہیں سمجھی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظوم کتابیں زبان فارسی میں بے حساب ہیں۔ تذکروں میں معروف شعراء کے ناموں کے علاوہ غیر معروف شعرا کے اس قدر نام دیکھے جاتے ہیں کہ اُن کا یاد رکھنا دشوار ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ایران کو شاعری کی طرف میلان عظیم رہا ہے، اُن کی مضمون نگاریاں بھی ایسی ہیں کہ علمائے اہل یورپ لکھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگوں کو مشرقی شاعریوں کی نازک خیالیوں سے کماحقہ آشنائی نہیں پیدا ہوئی ہے اور

خیالات کے ایسے ایسے میدان پڑے رہ گئے ہیں کہ جہاں ہم لوگوں کا ابھی گزر نہیں ہُوا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اصناف شاعری سے بعض ایسی ہی ہیں کہ اُن کی ہوا بھی اہل یورپ کو نہیں لگی ہے مگر فارسی شاعری کے نقصانات بھی اُسی درجہ کے ہیں کہ ان کی اصلاح کی بڑی حاجت ہے مثلاً اصناف شاعری سے ڈراما نگاری ہے جو فارسی میں کبھی موجود نہ تھی۔ البتہ اس وقت کچھ حضرات اہل زبان نے اس صنف شاعری کی طرف توجہ شروع کی ہے۔ اسی طرح منجملہ دیگر نقصانات کے فارسی شاعری پر کثرت مبالغہ پردازی کا الزام سخت عائد ہوتا ہے مولف کی دانست میں مبالغہ پردازی راستی کی قوت اور لطافت کو زائل کرنے والی شے ہے اس سے جس قدر شاعر اجتناب کرے انسب و اولی ہے اسی مبالغہ پردازی کی بدولت بیشتر فارسی کی شاعری معیوب معلوم ہوتی ہے سوا سعدی اور حافظ کے کمتر ایسے شعراء نظر آتے ہیں جن کی شاعری کثرت مبالغہ پردازی سے پاک ہے، ان دونوں شاعروں کے مقبول ہونے کی زیادہ وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر اُن کے مضامین عدم مبالغہ پردازی سے فطری رنگ رکھتے ہیں علاوہ اس کے عموماً فارسی شاعری میں ایک بڑا نقصان یہ پایا جاتا ہے کہ فطری خوبیوں سے بیشتر معرا ہے، فارسی کے اکثر شعراء یہ جانتے ہی نہیں کہ نیچرل بیانات کیا کیا دل آویز تاثیرات پیدا کر سکتے ہیں۔ مولف کی دانست میں کوئی مثنوی زبان فارسی میں ایسی نہیں ہے کہ سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک کی دلکش فطرت نگاری کا جواب دے سکے۔ نظم تو نظم فارسی کی نثروں کی بھی وہی حالت دیکھی جاتی ہے مثلاً سہ نثر ظہوری کہ ایک مشہور کتاب ہے اور اس کی نثر بہت تعجب

خیز بھی جاتی ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ بامذاق تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ایک ایک جملہ اُس کا سوہانِ روح متصور ہے بالمختصر یہ بات نہایت صحت کے ساتھ حوالہ قلم کی جا سکتی ہے کہ اہل ایران شاعری کی طرف ایک میلانِ عظیم رکھتے ہیں۔ اور اُن کی شاعریاں قابل توجہ بھی ہیں مگر اُن کی شاعری کا مذاق مختلف پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر بہت کچھ اصلاح طلب ہے اگر حضرات اہل زبان اِس امر کی طرف کوشاں ہوں تو اِس توجہ فرمائی سے نہ صرف فارسی کی شاعری ترقی کر جائے گی۔ بلکہ قومی معاملات اخلاق و تمدن میں بھی حسب مراد انقلابات ظہور میں آئیں گے

ملک ہندوستان کا بیان

براعظم ایشیا کے ملکوں سے ہندوستان بھی ایک ملک ہے مگر یہ ایسا ملک ہے کہ خود براعظم کا حکم رکھتا ہے آب و ہوا فصل موسم جبال بحور دشت صحرا جنگل آبادی قوم علم فضل پیشہ حرفہ تجارت زراعت صناعی تمدن نباتات حیوانات معدنیات وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے یہ ملک تمام دنیا کا خلاصہ کہے جانے کا استحقاق رکھتا ہے، تمام دنیا کی بوقلمونیاں اس کے احاطہ کے اندر پائی جاتی ہیں اگر ہر مد کی تفصیل کی جائے تو راقم کی عمر اس کی تحریر کو اکتفا نہیں کر سکتی۔ بہر حال جاننا چاہیئے کہ ہندوستان جو برٹش انڈیا کہلاتا ہے اس میں چند ملک جزائر وغیرہ بھی شامل ہیں مگر ہندوستان خاص کے حدود اربعہ اس طرح پر قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ اُس کے مغرب میں ملک کابل بلوچستان اور بحیرۂ عرب اور شمال میں کوہ ہمالیہ اور شرق میں ملک برما اور جنوب میں خلیج بنگالہ اور بحر ہند واقع ہیں۔ ملک ہندوستان جزیرہ نما ہے اس کے دو

جانب میں سمندر پایا جاتا ہے۔ اس ملک وسیع کا طول شمالاً و جنوباً دو ہزار میل ہے اور عرض شرقاً و غرباً اٹھارہ سو میل۔ مربع اس کا چودہ لاکھ میل یعنی ملک فارس سے نو لاکھ میل زیادہ ہے انتظام سلطنت کے خیال سے یہ ملک تین پریسیڈنسیوں میں تقسیم ہوا ہے یعنی پریسیڈنسی بمبئی و پریسیڈنسی مدراس و پریسیڈنسی بنگال، پریسیڈنسی سے مراد احاطہ ہے، علاوہ ان پریسیڈنسیوں کے کچھ صوبے ہیں جو چیف کمشنروں کے زیر حکومت رہتے ہیں علاوہ ان پریسیڈنسیوں اور چیف کمشنریوں کے جو حصہ ہائے ملک باقی رہ جاتے ہیں، ان میں خود مختار راجگان و نوابان زیر نگہبانی سرکار انگلشیہ ابھی تک حکمران ہیں۔ اس ملک وسیع میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں معروف زبانوں سے بنگلہ، اوڑیا، اردو، پنجابی، گجراتی، سندھی، مرہٹی۔ مارواڑی تلنگانی وغیرہ وغیرہ ہیں مگر ہندوستان کے زیادہ حصوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، ہندوستان میں اردو زبان فرانس کا حکم رکھتی ہے جو یورپ کے اکثر ملکوں میں ذریعۂ ہم کلامی ہوا کرتی ہے اردو زبان کی حقیقت آئندہ عرض ہوگی مگر یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ہر چند یہ زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور لکھنؤ کی طرف کی جاتی ہے، جاننا چاہیے کہ دہلی پریسیڈنسی میں بنگال واقع ہے۔ اور لکھنؤ اودھ کی چیف کمشنری کا صدر تھا اور اب اضلاع متحدہ میں داخل ہے۔ پریسیڈنسی بنگال تین حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ ایک لفٹنٹ گورنر کے زیر حکومت رہتا ہے پہلے حصہ کو لفٹنٹی بنگال دوسرے کو لفٹنٹی اضلاع متحدہ اور تیسرے کو لفٹنٹی پنجاب کہتے ہیں۔ دہلی لفٹنٹی پنجاب میں واقع ہے۔ ان دونوں شہروں کے سوا اور جگہوں کے اردو بولنے والے اہل

زبان کے جاننے کا حق نہیں رکھتے ہیں۔ مثلاً ساکنین صوبہ بہار کہ ہر چند زبان اُردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ مگر اہلِ زبان اُن کی زبان کو کسی طرح سند نہیں مانتے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہلِ لکھنؤ یا اہلِ دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی۔ ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زبان داں کہلائیں۔ اہلِ زبان ہونا تو تمام تر خارج از امکان ہے۔ واضح ہو کہ عموماً شرفائے بہار کی اُردو یہی ہے کہ جس میں فقیر یہ کتاب لکھ رہا ہے مگر ہمارے وہ اہلِ وطن جو حضرات اہلِ زبان کے فیضانِ صحبت سے مُدت مدید تک بہرہ مند رہے ہیں وہ البتہ راقم کی زبان سے کوئی علیحدہ زبان بولتے اور لکھتے ہیں بہر حال جاننا چاہیئے کہ صرف لکھنؤ اور دہلی ہی میں۔ سندی اُردو بولی جاتی ہے اور انھیں دونوں شہروں میں اُردو کے دو بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں جن کے نام نہایت فخر و امتیاز کے ساتھ لیئے جاتے ہیں۔ واضح ہو۔ کہ سوا اُردو کے اور جتنی زبانیں ہندوستان میں مروج ہیں اُن کو اِس صدی میں بڑی ترقی نصیب ہوتی گئی ہے۔ چنانچہ بنگلہ زبان کو وہ اوج نصیب ہوا ہے کہ اب یہ زبان جو سو برس پہلے کچھ نہ تھی دنیا کی ممتاز زبانوں میں شمار کی جانے لگی۔ آلان کوئی علم یورپ کا نہیں ہے کہ اس زبان میں کم و بیش طور پر منتقل نہیں ہوا ہے۔ شاعری اور ناول نگاری نے تو بہت ترقی پائی ہے۔ ترقی کے اعتبار سے اُردو نے زبان بنگلہ کے مقابل میں گویا کچھ بھی ترقی نہیں کی ہے۔ اُردو نے ابھی تک جو کچھ ترقی کی ہے وہ اُسی قدر ہے۔ جتنا فارسی کے متتبع ہونے سے حاصل کر سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپین علوم سے خاص کر فن شاعری کے لگاؤ میں ترقی اُردو کے لیئے گویا کچھ بھی مدد نہیں لی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اہلِ بنگالہ نہ صرف سنسکرت

سے اقتباس مضامین کرتے گئے ہیں۔ بلکہ یورپین شعرا کے تتبع سے دائرۂ شاعری کو وسیع کر ڈالا ہے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی مروج زبانوں میں صرف اُردو ہی ایک ایسی جامذ زبان ہے جس کی شاعری نے سنسکرت اور انگریزی سے کوئی صورت استفادہ کی پیدا نہیں کی۔ ورنہ جتنی اور زبانیں ہیں، سب کی سب اِن دونوں زبانوں سے مستفید نظر آتی ہیں، جیسا کہ اُن کی شاعریوں کا رنگ قول راقم کی صحت پر گواہی دیتا ہے ؎

ہندوستان بعہدِ حکومتِ انگلشیہ

واضح ہو کہ ملک ہندوستان پر اوقاتِ مختلفہ میں بیرونی اولوالعزم قومیں یکے بعد دیگرے حکمران ہوتی آئی ہیں اور جب ایک قوم کی سلطنت ضعیف ہوتی گئی ہے تب دوسری قوم زور آور اُس پر قابض اور مالک ہو بیٹھی ہے ہنود کے مختلف اقوام جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں ان کے بزرگ بھی مسلمانوں کی طرح اس ملک کے فاتح تھے اور اُن کی اولاد اور احفاد نے یہاں بود و باش اختیار کر کے صدہا سال ہندوستان کے مختلف حصوں میں سلطنت رانی کی ہے۔ بہت سے نامان ہنود کے نام مثلاً راجہ وسرتھ۔ مہاراجہ رام چندر راجہ چندر گپت۔ راجہ بکرماجیت راجہ پتھورا وغیرہ وغیرہ السنۂ خلائق پر جاری ہیں اور اُن کی علوم پروری اور عدل گستری کے حالات کتب تواریخ میں موجود ہیں بہرحال جب ہندوؤں کی سلطنتوں میں ضعف آیا تو مسلمان اُن پر غالب آئے اور چند صدیاں اس ملک میں حکمران رہے۔ مسلمانوں میں بھی ہنود کی طرح چند قومیں یکے بعد دیگرے فرمان روائے ملک ہندوستان ہوتی گئیں

آخر میں خاندان تیمور کو عروج ہوا اور اسی خاندان کے ساتھ اس ملک کی سلطنت اسلامیہ بھی معدوم ہوگئی۔ بلاشبہ دولت تیموریہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی ثروت سے خبر دیتی ہے مسلمان شاہان ہند میں کسی کو وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ جو دولت تیموریہ نے حاصل کی۔ اکبر کے وقت میں سلطنت اسلامیہ کو آئینی استحکام نصیب ہوا اور جہانگیر کا زمانہ اکبر کے حسن جہانبانی کا نتیجہ معقول تھا۔ شاہجہان کی خوبیوں نے سلطنت کو رونق بخشی۔ اورنگ زیب کی حوصلہ مندی نے اُسے بہت وسیع کر دیا۔ مگر اس بادشاہ کی غیر مدبرانہ کارروائیوں سے ہندو رعایا دل شکستہ ہوگئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مرتے ہی سلطنت میں زوال بھی شروع ہو گیا۔ آخر کار یہ کیفیت ہوگئی کہ ہندو اقوام نے دہلی کو بھی لے لیا اور بادشاہان دہلی کو محض بے اختیار و بیکار بنا ڈالا۔ دولت تیموریہ کے زوال سے ہندوؤں کو ایسا زور ہو گیا تھا کہ اگر احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوتا تو پھر ہندوؤں کی عملداری ہو جاتی۔ اس قومی حملہ آور نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ مرہٹے نہایت ضعیف ہو گئے اس پر بھی شاہان دہلی کی مزاج پرسی کے واسطے کافی تھے، اگر حکام انگلشیہ شاہان دہلی کی حفاظت نہ کرتے رہتے تو مرہٹے کب نہ دہلی کو غارت کر چکے تھے۔ بالمختصر جب عنانِ سلطنت ہندوستان کی حکام انگلشیہ کو منتقل ہوئی اُس وقت ہنود کی چند قومیں اس ملک میں بر سر غلبہ تھیں۔ اسی باعث ایک مورخ انگریزی نے لکھا ہے کہ "ہم لوگوں نے یعنی انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت ہندوؤں سے نہ کہ مسلمانوں سے پائی ہے" یہ قول بالست مولف پورا صحیح تو نہیں ہے۔ مگر اس میں شک

نہیں کہ سلطنت تیموریہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی اور ہر مسلمان صوبہ دار بادشاہ بن بیٹھا تھا اور بہت سے اعضائے سلطنت اولوالعزم اقوام ہنود کے ہاتھ آگئے تھے، اور اسی وجہ سے ہنوز زور آور ہورہے تھے ایسا قیاس ہوتا ہے کہ اگر حکام انگلشیہ سلطنت ہندوستان کی طرف التفات نہ فرماتے تو آخرکار ہنود ہی فرمانروائے ہندوستان ہوجاتے۔ مالک ہندوستان ہوکر کس طور پر سلطنت کرتے، یہ خدا کو معلوم۔ لیکن اگر وہی مرہٹیا طور قائم رہتا تو رعایائے ہند کو عافیت کا نصیب ہونا ایک امر محال ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نہایت رحیم ہے کسی حالت میں اپنے بندے کو بے معین و مددگار نہیں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جب ملکی قوموں میں جہانبانی کی صلاحیت مفقود پائی تو دور و دراز ملک سے ایسی قوم کو عدل پروری اور داد گستری کے واسطے معین کیا۔ جس نے بار جہانداری کو آسانی کے ساتھ اٹھا لیا۔ اور فرضِ منصبی کی بجا آوری میں کوئی کوشش دریغ نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ از گنگ تا سنگ تمامی ہندوستان مرأت امن و امان بن گیا۔ جان و مال و آبرو کے استحفاظ کی شکل پیدا ہوئی۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے مرتے ہی اُن کے بیٹوں کی خانہ جنگیوں سے سلطنت مغلیہ کا زور جاتا رہا اور جس وقت محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ نے حملہ کیا، اُس وقت یہ سلطنت ضعیف ہوچکی تھی۔ اِس حملہ سے جو کچھ سلطنت کی وجاہت باقی رہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اِس حملہ کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی کی صورت نظر آنے لگی یعنی صوبہ داران اودھ و بنگالہ وغیرہ خود مختار بن بیٹھے۔ سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ جاٹوں نے دہلی اور اطراف دہلی میں ہنگامے مچائے۔ مرہٹوں

نے ہندوستان کے ایک جزو اعظم کو زیر حکومت کر لیا، اسی طرح بہت سے سرداروں
قلعہ داروں نے جن کو جس طرح موقع ملا، اپنے کو خود سر کر ڈالا۔ اس طوائف الملوکی
کے زمانہ میں ہندوستان کو امن و امان سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ صوبے داروں کے
آپس کے خون ریز جھگڑے جاٹوں کی یورشیں سکھوں کی طغیانیاں، روہیلوں کی
فساد انگیزیاں راجاؤں کی سرکشیاں، نوابوں کی بے عنوانیاں، فرانسیسیوں کی
دست اندازیاں تمامی ہندوستان میں قیامت مچائے ہوئے تھیں، کیسی سیاست
کیسا انتظام ہر کسی کے جان پر آ بنی تھی۔ نہ دادرسی کا کوئی طریقہ باقی رہا تھا
نہ فریاد سے کچھ کام نکلتا تھا۔ جس سے جو بن آتی تھی کر گزرتا تھا۔ شہروں میں
ایسے ایسے ڈاکو رہتے تھے جو دن دوپہر دولت مند اشخاص کے مکانات
میں گھس کر جس کو پاتے تھے تہ تیغ کر دیتے تھے، قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں
مفسدان سرکش عافیت خلائق میں رخنہ ڈالے ہوتے تھے، شاہراہوں پر راہزنوں
کا پورا قبضہ تھا، جنگل اور ویرانے ٹھگوں کے دم سے آباد تھے دریاؤں
کو دریائی ڈاکوؤں نے سراسر پرخطر بنا رکھا تھا۔ پہاڑوں میں کوہی قوام خرس و
کفتار کو بھی خون خواری میں شرمندہ کئے ہوئے تھے، کیسا تھانہ کیسی فوجداری
کیسی نالش، کیسی فریاد، نہ زمین پر پناہ نہ پانی پر امن، آئین و قانون کا کیا ذکر،
زبردست کا جوتا سر پر اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا مضمون پیش نظر
تھا۔ اس وقت کے اہل حکومت بھی کچھ ڈاکو اور قزاقوں سے کم نہ تھے، اگر
کسی رعیت کے پاس دولت پاتے حسب خواہش اپنے گھر اٹھا لاتے، عورتوں
کی عزت بھی خدا ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اہل قدرت کے لئے جوروؤں کو شوہر

سے یا بیٹیوں کو باپ سے چھین لینا کوئی تردد طلب امر نہ تھا۔ اس وقت میں بہت سے گیت سنے جاتے ہیں جو اُس وقت کے جباروں کے ظالمانہ فعل سے خبر دیتے ہیں پس ایسے زمانہ میں کہ اہل حکومت ہی اس وضع کی بد اخلاقی میں مبتلا تھے، راہزنوں و بدمعاشوں کا کیا ذکر ہے مختصر یہ ہے کہ ملک ہندوستان اس طور پر دار الفساد ہو رہا تھا کہ اُس کی اصلاح دیسی منتظمان سے ممکن نہ تھی لیکن رحمت عامہ الٰہی اپنے کرور در کرور بندوں کو کب اس طرح پر گرفتار آلام پریشانی رکھنا قبول کر سکتی تھی۔ اس واسطے اس ملک وسیع کو ایک ایسی قوم کو سپرد کر دیا جو پورے طور پر داد جہانبانی دینے لگی۔ قوم انگلشیہ کے ہندوستان میں آنے کی سرگذشت یہ ہے کہ عہد ملکہ ایلزبیتھ میں جو انگلستان کی فرمانروا اور سلطان جہانگیر ابن اکبر شاہ کی ہمعصر تھیں، ایک کمپنی اس غرض سے قائم ہوئی کہ درمیان انگلستان اور ہندوستان کے سلسلہ تجارت جاری کرے یہ مجمع تجارتی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے قائم ہوا اور اجازت تجارت دربار ملکہ ممدوحہ سے اس کمپنی کو ۱۶۰۰ء میں ملی۔ ایک سفیر بھی سر طامس رو نامی شاہ انگلستان کی طرف سے دربار جہانگیر میں بھیجا گیا۔ مختصر یہ کہ کمپنی مذکور پہلے تو اپنے تجارتی کاروبار کو نہایت شعور مندی کے ساتھ ایک عرصہ تک انجام کرتی رہی اور جب دیسی فرمانرواؤں میں سلطنت کی صلاحیت باقی نہیں رہی، تب بار حکومت کو اپنے کاندھے پر لے لیا، ۱۸۵۷ء تک یہ کمپنی بہ نیابت شاہ انگلستان فرمانروائے ممالک ہندوستان رہی۔ بعد بغاوت کے ۱۸۵۸ء میں حضرت علیا ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے سلطنت ہندوستان کو زیر حکومت خاص

فرمالیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک اسی طور پر یہ ملک زیر انتظام شاہی ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں گورنر جنرل کو صرف کورٹ آف ڈائرکٹرس کی ماتحتی تھی، اس افسر اعلیٰ کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا اور کسی قسم کی جوابدہی کا تعلق سلطنت انگلیشیہ سے یہ عہدہ دار نہ رکھتا تھا۔ البتہ ڈائرکٹران کو اپنی کارروائی کی جوابدہی یا شرکاء کمپنی کو یا بذریعہ بورڈ آف کنٹرول کے شاہ انگلستان اور پارلیمینٹ انگلشیہ کو بھی۔ لیکن جب ۱۸۵۸ء میں حضرت علیا ملکہ معظمہ نے ممالک ہندوستان کو کمپنی کی حکومت سے منتزع فرمالیا، تب سے لقب گورنر جنرل کے ساتھ خطاب وائسرائے یعنی نائب سلطان کا بھی ضم کیا گیا۔ بہرحال طوائف الملوکی کے زمانے کے بعد جب رفتہ رفتہ صوبجات ہندوستان احاطہ حکومت انگلیشیہ میں داخل ہوتے گئے۔ تو ہر طرح کی بُرائیاں بھی دُور ہوتی گئیں، حفظ و امان خلائق کے لئے قوانین ایسے نفاذ پائے جن سے جان و مال و آبرو سب کی حفاظت کی شکل پیدا ہوئی۔ والیان ملک کے باہمی جدال و قتال کا انسداد پُورا کیا گیا۔ ڈاکو، راہزن۔ قزاق۔ دزدان بری و بحری سب نیست و نابود ہو گئے۔ غریب و امیر سب کو امن نصیب ہُوا۔ مظلوموں کی داد رسی کے قواعد مقرر کئے گئے۔ زمینداران و رعایا کے حقوق کی نگہداشت کے واسطے قاعدے اجرا پائے۔ تجارت اور مہاجنی کے کاروبار کے لئے آئین نفاذ پائے، مختلف اقسام کے دعاوی کے ارجاع کے لئے مختلف محکمات قائم ہوتے گئے، نابالغوں کے استحفاظ جان و مال کے واسطے قانونی انتظامات عمل میں آئے، کاشتکاری کی ترقی کی طرف توجہ شاہی جو مبذول ہوئی تو ہزارہا بیگھہ اراضی جو جھاڑ جنگل سے

بھری ہوئی تھیں کاشتکاری کے اغراض کے لئے آباد کی گئیں۔ سیرابی زراعت
کے لئے ایسے سامان فراہم کئے گئے کہ ہزاروں بیگھہ افتادہ اراضی حسب مراد
زرخیز ہوگئیں۔ نئے نئے اقسام کے غلے اور اثمار کی کاشت ہندوستان میں
مروج کی گئی۔ صدہا ندی نالوں میں پل تیار کئے گئے، نئی نئی سڑکیں اور راہیں نکالی
گئیں۔ مسافروں کیواسطے سراؤں کا انتظام ہوگیا۔ کثرت سے تالاب و چاہ کی
تعمیر ہوتی گئی۔ اقسام ڈاک کے سامان ظہور میں آئے۔ مریضوں کے واسطے شفاخانے
تیار کئے گئے۔ شہروں اور قریوں کی صفائی میں کدو کوشش کو راہ دی گئی نامطبوع
رسوم کے اندر اس کا سامان کیا گیا، چنانچہ ستی اور بردہ فروشی کا نام تک باقی نہ
رہا۔ قحط اور وبائی عارضوں کے دفع کرنے کے اسباب مہیا کئے گئے، سیر و سفر کے
واسطے عمدہ کلیں پیدا کی گئیں، مراسلات اور جلد خبر رسانی کے طریقے ایجاد پائے
ممتاز مقامات میں آب مصفا کے بہم پہنچانے کے لئے کارخانے قائم کئے گئے
تفریح طبع خلائق کے لئے نادر نادر تفرج گاہیں آراستہ کی گئیں اور اسی طرح
عیش و آرام کے بے انتہا سامان بہم پہنچائے گئے اور سب سے بڑا کام سرکار انگلیشیہ
کے عہد میں یہ ہوا کہ علوم یورپ کی اشاعت اس وسعت کے ساتھ تمامی ہندوستان
میں کی گئی کہ ہزارہا رعایائے سرکاری اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ ہوکر اپنے خانگی اور ملکی
حقوق کو خوب سمجھنے لگی۔ اور اپنی مالی اور ملکی خرابیوں کی اصلاح میں کوشاں ہونے لگی
یہ اسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتگی کا نتیجہ ہے جو ہندوستان کے اقوام مختلفہ میں مرابطت
اور یکجہتی کی صورت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اہل بنگالہ و اہل مدراس و اہل بمبئی میں
مرانست و یکدلی کا سلسلہ قائم ہوتا جاتا ہے اور سبھوں کو ملک کی بہتری و بہبودی

کا خیال مرکوز خاطر ہو رہا ہے، تعلیم یافتہ سکنائے ہندوستان طرح طرح کی تمدنی کمیٹیاں اور جلسے منعقد کرتے جاتے ہیں۔ اخباروں کے ذریعے سے بڑے بڑے مدبرانہ کام لئے جا رہے ہیں۔ معقول تصنیفات سے ہندوستان کی مختلف زبانیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اجرائے شاہی زبان کی بدولت تمام ممالک ہندوستان میں ہم خیالی زور پکڑتی جاتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اشاعت علوم یورپ نے ہندوستان کو ترقی کی ایسی راہ دکھلائی ہے کہ یوماً فیوماً اس کی تمدنی خوبیاں بڑھتی ہی نظر آتی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ ترقیاں اس ملک کو مراحم خسروانی کی بدولت نصیب ہو چکی ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں ؏

فارسی کی نظم و نثر کے تاریخی حالات

فارسی کی نظم کی ابتداء کی نسبت بعض کا قول ہے کہ پانچویں صدی مسیحی میں بہرام گور نے وزن اور قافیہ کو ایجاد کیا، مگر بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ابو الحفص سمرقندی نظم کا موجد گزرا ہے۔ بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ آخر کے شاہان ساسانی کو فارسی کی انشاء کی طرف میلان تھا، لیکن جب ملک فارس پر قوم عرب کا قبضہ ہو گیا، تو کچھ عرصہ تک اہل فارس کا یہ میلان دب رہا، آخر کار جب سلطنت خلفائے عباسیہ کو ضعف لاحق ہوا اور فارس نے رفتہ رفتہ سر نو قومی آزادی حاصل کر لی تب پھر اہل فارس قومی لٹریچر کی ترقی کی طرف توجہ کرنے لگے، خراسان میں اس کی ترقی کا سلسلہ قائم ہوا۔ مرو میں ایک شخص مسمیٰ بہ عباس نے ۱۹۳ھ صلعم مطابق ۸۰۹ء میں نظم نگاری شروع کی۔ اس کے بعد خلیفہ مامون ابن

ہارون الرشید کی تعریف میں محمد موفی نے اشعار لکھے، پھر حنظلہ حکیم فیروز اور ابوسالک نے رباعی، غزل اور قصائد لکھے، اس کے بعد ابوشکور بلخی مثنوی کا موجد ہُوا۔ یہ صنفِ شاعری اہلِ عرب میں نہ تھی، اِس کے ایجاد سے فارسی شاعری کو ادائے خیالاتِ مسلسل کا ایک بڑا میدان ہاتھ آیا، جس کے سبب سے شاہنامہ وغیرہ جیسی مبسوط کتابیں فارسی میں لکھی جا سکیں، امیر نصیر دوم کے عہد میں از ۹۱۳ء تا ۹۴۲ء مطابق از ۳۰۱ھ ہجری تا ۳۳۱ھ ہجری مسلم سلطنتِ ایران کو استحکام حاصل ہُوا۔ اِس عہد کے نامی شعرا عباس بخارائی۔ ابوالمظفر نصر نیشاپوری ابوعبد اللہ محمد جنیدی۔ معنوی۔ خسروانی۔ ابوالحسن شاہد بلخی اور رودکی تھے۔ اوّل اوّل حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق جس شاعر نے اپنی غزلوں کو مدون کیا، ابوالحسن شاہد بلخی تھا۔ رودکی کی روشِ کلام حکیم خباز نے اختیار کی پھر ابوشعیب ہراتی رونقی بخارائی، ابوالفتح بستی، امیر ابوالحسن علی النخاص عمر مروزی اور کسائی اسی دسویں صدی مسیحی میں شعر لئے نام آور ہوتے گئے اسی خاندان سامانی کے نوح دوم کے عہد میں دقیقی نے بھی شاعری کی شہرت پیدا کی، اس کے بعد خاندان سبکتگین کو عُروج ہُوا۔ محمود غزنوی کے عہد میں فردوسی نے کتاب شاہنامہ لکھی ۱۰۱۱ء میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی، فردوسی کے ہمعصر شعرا عنصری، عسجدی تھے، ہرچند یہ سب بڑے درجہ کے شاعر تھے، مگر فردوسی کی طباعی کے سامنے دربارِ محمود میں پھیکے پڑ گئے، شاہنامہ کی تصنیف سے ہر شاعر کے دل میں رزمی شاعری کا جوش پیدا ہُوا شعرا عام طور پر فردوسی کا تتبع کرنے لگے، بلکہ یہ کوششیں ہونے لگیں کہ فردوسی پر بھی سبقت

سے جاییے، علی بن احمد الاسدی نے گرشاسپ نامہ لکھا۔ پھر سام نامہ جہانگیر نامہ
فرامرز نامہ برزو نامہ، شہریار نامہ وغیرہ تصنیف ہوتے گئے۔ ان سب کتابوں
میں شاہنامہ کی طرح کے مضامین منظوم ہیں اور یہ مضامین تمام تر ایران قدیم کے
قصص و حکایات پر مشتمل ہیں جب ایران کے خیالی معاملات لکھتے لکھتے شعرائے
فارس تھک گئے تب یونانی حالات تاریخی وغیر تاریخی کی طرف متوجہ ہوتے اکثر شعرا
نے سکندر کے حالات منظوم کیے، اسی لئے فارسی میں بہت سے سکندر نامے دیکھے
جاتے ہیں، ان سکندر ناموں میں سب سے ممتاز تصنیف نظامی کا سکندر نامہ ہے یہ
کتاب ۱۲۰۲ء مطابق ۵۹۹ھ ہجری صلعم میں اختتام کو پہنچی، جب سکندر کی
حالات نگاری کا خاتمہ کر چکے تب شعرا نے رزمی شاعری کے دھارے کو فن سیر
کی طرف پھیرا، حسن شستری نے انبیا نامہ لکھا ابن ہشام نے خاور نامہ میں
امیر المومنین علیہ السلام کے معاملات جنگ حوالۂ قلم کیے، باذل نے حملہ حیدری تصنیف
کیا اور کاظم نے فرخنامہ، جب حالات سیر منظوم ہونے سے باقی نہ رہے تب
شاہانِ وقت کے حالات منظوم کیے جانے لگے، ہاتفی نے تیمور نامہ لکھا، قاسمی
نے شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ کے وقائع منظوم کیے، کمال سبزواری نے شاہ عباس
اعظم کا شاہنامہ تصنیف کیا اور عشرتی نے شاہنامہ نادری، اسی طرح عہد
فتح علی شاہ قاچار میں شاہنشاہ نامہ لکھا گیا، ہندوستان میں بھی شاہنامہ کے
رنگ کی چند تصنیفیں ظہور میں آتی گئیں، عہد ہمایوں میں یعنی درمیان ۱۵۳۰ء و
۱۵۵۶ء کے اس قسم کی شاعری نے اس ملک میں رواج پکڑا، اس کے بعد
ہر عہد میں کچھ نہ کچھ اس رنگ کی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ عہد شاہ جہان میں

قدسی نے ظفر نامہ شاہ جہانی اور طالب کلیم شاہنشاہ نامہ لکھتے گئے۔ بیجاپور میں آتشی نے عادل نامہ لکھا۔ عہد عادل شاہ کی ابتدا ۱۶۲۹ء ہے۔ پھر ایک منظوم تاریخ موسوم بہ تواریخ قلی قطب شاہ لکھی گئی، یہاں تک کہ آخرکار ۱۲۰۷ھ میں غلام حسن نے فتح نامہ طیبو سلطان لکھا ؛

واضح ہو کہ فردوسی کی رزمی شاعری نے نہ صرف اہل ایران کو اس رنگ کی شاعری کے برتنے کی راہ بتلائی، بلکہ بزمی شاعری کی طرف بھی شعرا کے دلوں میں میلان پیدا کر دیا۔ کتاب شاہنامہ ایسی مبسوط کتاب ہے کہ اس میں بزمی شاعری کے تخم بہ کثرت موجود ہیں۔ چنانچہ فردوسی کے بعد عماق بخارائی، جامی موجی، قاسم خان ناظم ہروی شوکت حاکم شیرازی بزمی مثنویاں حضرت یوسف اور زلیخا کے حالات میں لکھتے گئے۔ یہ سب تصنیفات یوسف و زلیخا نام رکھتی ہیں جاننا چاہیے کہ اس کے علاوہ وہ یوسف زلیخا ہے جو فردوسی کی تصانیف سے ہے بہرحال ان شعرا کے علاوہ فصیحی، جرجانی، دمیری، نامی وغیرہ نے اپنے زمانے میں وامق و عذرا کے عشق کی کہانیاں بشکل مثنوی منظوم کیں المختصر ہر قسم کی مثنوی نگاری کے مذاق کے پیدا ہونے کا باعث فردوسی کا شاہنامہ ہوا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ صرف عاشقانہ مثنویوں کے مروج ہونے کی صورت فردوسی کی شاعری نہیں ہوئی ہے بلکہ اس نے پند و موعظت کے رستے بھی شعرائے مابعد کو دکھائے ہیں۔ شاہنامہ میں بہت مقامات ایسے ہیں کہ بہترین واعظ ان سے بہت کچھ پند لے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں مقامات کے تتبع سے فارسی کے بہت سے شعرا نام آور ہوتے گئے ہیں۔ سعدی مولانائے

روم، فرید الدین عطار وغیرہ سب کے سب اس خدائے سخن کے پوجنے والے نظر آتے ہیں۔ المختصر تمام اقسام مثنوی نگاری کو اسی کتاب شاہنامہ سے ہدایت ملی ہے اور واقعی فردوسی وہ بڑا شاعر ہے کہ شعرائے فارس اُسے جس قدر عظمت کی نگاہ سے دیکھیں عین انصاف ہے۔ درحقیقت فارسی میں فردوسی کا جواب کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس شاعر گرامی سے بہتر شاعر ڈھونڈنے کے لئے تلاش کنندہ کو سرزمین ایران سے باہر جانے کی حاجت ہے۔ بزمی اور رزمی شاعریوں کے علاوہ قصیدہ گوئی بھی زور و شور کے ساتھ ہر طبقۂ شاہان اسلام میں مروج رہی ہے۔ ذیل میں بعض ممتاز شعرائے قصیدہ گو کے نام اور ان کے زمانے درج کیے جاتے ہیں :-

نمبر (۱) فخر الدین اسد جرجانی بعض شاہان سلجوق کا مداح تھا یہ قصیدہ گو گیارھویں صدی مسیحی میں زندہ تھا ؛

نمبر (۲) ابو الفرج لاہوری و مسعود بن سعد بن سلمان عہد سلطان ابراہیم غزنوی میں تھے، اس بادشاہ کا عہد حکومت از سنہ ۱۰۵۹ء تا سنہ ۱۰۹۹ء ہے ؛

نمبر (۳) ادیب صابر عہد سلطان سنجر میں تھا اس بادشاہ کے حکم سے ۱۱۴۵ء مطابق سنہ ۵۴۰ھ ہجری میں پانی میں ڈبا دیا گیا ؛

نمبر (۴) جوہری امیر معزی سنہ ممات ۱۱۴۷ء رشید وطواط سنہ ممات ۱۱۷۲ء عبد الواسع سنہ ممات ۱۱۶۹ء اوحد الدین انوری سنہ ممات قریب ۱۱۶۹ء یہ سب کے سب عہد سلطان سنجر کے شعرا ہیں ؛

نمبر (۵) خاقانی سنہ ممات ۱۱۹۹ء انوری کا ہمعصر تھا ؛

نمبر(۶) بیلقانی خاقانی کا ہمعصر تھا ؛

نمبر(۷) ظہیر فاریابی ایضاً ؛

نمبر(۸) کمال الدین سنہ ممات ۶۳۶ھ ؛

نمبر(۹) سیف الدین سنہ ممات ۶۶۶ھ ؛

علاوہ ان شعرائے قصیدہ گو کے اور بھی ہزاروں شعرا گزرے ہیں، جن کے ناموں کی فہرست طولانی ہے اِن تمام شعرا کے کلام کم و بیش طور پر جادۂ فطرت سے انحراف پذیر معلوم ہوتے ہیں اور اس انحراف درزی کا سبب یہی ہُوا ہے کہ انہیں مدح بادشاہان وقت میں طرح طرح کے مضامین گھڑنے پڑے ہیں۔ ہر طرح کے استعاروں کو اختیار کرنا پڑا ہے اور مبالغہ پردازی کی اُن راہوں میں چلنا پڑا ہے جن کو فطرت کی راہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے، راقم کی دانست میں ایسی شاعریاں کسی صاحب مذاق صحیح کو پسند نہیں آسکتی ہیں اور درحقیقت یہ وہ شاعریاں ہیں جن سے نفس شاعری کو ضررِ عظیم مترتب ہوتا گیا ہے ؛

مدحی اور بزمی شاعریوں اور قصیدہ نگاریوں کے ساتھ ساتھ تصوف آمیز شاعری بھی زور پکڑتی گئی، تصوف کا مذاق اہل اسلام میں اوّل اوّل ملک فارس کیطرف سے داخل ہُوا مگر اس مذاق کے پیدا ہونے کا سبب بھی وہی شاہنامہ ہُوا ہے۔ فردوسی نے بہت مقالوں پر اخلاقی اور متصوفانہ مضامین حوالہ قلم کیے ہیں، چنانچہ کیخسرو کی نسبت اس کا یہ بیان دیکھا جاتا ہے کہ جب اس بادشاہ کو ہر طرح کی ثروت دنیاوی حاصل ہو چکی، تب دنیاوی بے حقیقتی پر لحاظ کر کے اُس نے دفعتہً ترک دنیا کیا اور تمنائے آرام ابدی میں وہ ایک سرچشمہ پر پہنچ کر چشم عالمیاں

سے نہاں ہوگیا، اسلام میں تصوف کا مادہ تمام تر زردشتیوں سے پہنچا ہے، جب اہل عرب اہل فارس سے میل جول کرنے لگے تو ناچار فارسیوں کے مذہبی خیالات اُن کے دلوں میں اثر کرنے لگے، یہ تو نہ ہُوا کہ عقیدہ توحید اسلامیوں کا زوال پذیر ہوسکا، مگر اندازِ توحید ضرور بدل گیا۔ بہت سے جدید خیالات از قسمِ وحدت وجود وحدت شہود وہمہ اوست وغیرہ پیدا ہوتے گئے۔ شعرا نے اپنی طباعیوں سے اِن عقائد کو بہت کچھ زور بخشا، حتیٰ کہ ہزاروں منظوم کتابیں اِس رنگ کی احاطۂ تصنیف میں در آئیں۔ بہر حال پہلا شاعر جس نے تصوف کے اصول منظوم کیے فردوسی کا ہم عصر ابوسعید بن ابوالخیر جہانی تھا (۳۵۷ - ۴۴۰ ہجری نبوی علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام) اس نے متصوفانہ مذاق کی رباعیاں لکھیں۔ پھر ناصر بن خسرو نے مثنوی موسوم بہ روشنائی نامہ تصوف میں لکھی۔ پھر علی بن عثمان نے کشف المحجوب لکھی، عمر خیام نے سینکڑوں رباعیاں لکھیں، افضل الدین کاشی نے بھی اس مذاق میں کتابیں تصنیف کیں، حکیم سنائی نے حدیقہ تصنیف کیا، اور جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی مبسوط لکھی (۱۲۰۷ - ۱۲۷۳ء مطابق ۶۰۴ - ۶۷۲ ہجری) اس کے پہلے فرید الدین عطار منظوم وغیر منظوم کتابیں لکھ چکے تھے۔ عطار نے عمر طویل پائی تھی۔ ۱۱۴ برس زندہ رہ چکے تھے کہ قوم مغولیہ نے انھیں قتل کیا۔ پھر سعدی نے متصوفانہ مذاق کی کتابیں لکھیں، معلوم ہوتا ہے کہ سعدی نے ۱۱۰ برس عمر پائی تھی۔ اُن کے انتقال کا سنہ ۱۲۹۲ء مطابق ۶۹۱ھ ہے۔ سعدی نے خاص کر علم تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے اُن کا اصل مذاق اخلاق آموزی سے خبر دیتا ہے مگر اِس مذاق کو چونکہ تصوف کے مذاق سے

مشابہت ہے اس لیئے اُن کی تحریر تصوف نما معلوم ہوتی ہے، شیخ کی مشہور کتابیں گلستان اور بوستان کریما اور دیوان ہیں، گلستان اور بوستان کے تتبع میں اکثر کتابیں لکھی گئی ہیں مگر کوئی بھی نقل مطابق اصل کا حکم نہیں رکھتی ہے، متبعان سعدی سے بعض مصنفین ذیل ہیں :-

نمبر (۱) ہزاری کوہستانی نے کتاب دستور نامہ تتبع بوستان میں لکھی یہ شاعر ۱۳۳۰ء مطابق ۷۲۰ھ ہجری میں راہی ملک بقا ہُوا ؛

نمبر (۲) کاتبی نے کتاب دہ باب بوستان کے جواب میں لکھی اس شاعر کا سال وفات ۱۴۳۴ء مطابق ۸۳۸ھ ہجری کے ہیے ؛

نمبر (۳) حیرتی نے بھی تتبع بوستان میں کتاب گلزار لکھی، یہ شاعر ۱۵۵۴ء مطابق ۹۶۱ھ ہجری میں مقتول ہُوا ؛

نمبر (۴) معین الدین نے گلستان کے تتبع میں کتاب نگارستان لکھی، سال وفات اس شاعر کا ۱۳۲۵ء مطابق ۷۲۵ھ کے ہیے ؛

نمبر (۵) جامی نے بہ تتبع ایضاً بہارستان لکھی. سال تصنیف اس کتاب کا ۱۴۸۷ء مطابق ۸۹۲ھ ہجری ہے، متاخرین شعرا و نثار سے بعض اشخاص نے بوستان اور گلستان کے تتبع میں کتابیں لکھی ہیں مگر کسی کی تصنیف سعدی کی تصنیفوں کو نہیں پہنچتی ہے بہرحال متصوفانہ مذاق کو ہمیشہ ترقی ہی رہی۔ اور آج تک بھی یہ مذاق محمود سمجھا جاتا ہے ۔ذیل میں بعض متصوفانہ مذاق کے مصنفوں کے نام درج کیئے جاتے ہیں :-

نمبر (۱) عراقی نے لمعات لکھی، سال وفات عراقی کا درمیان ۱۲۸۷ء

اور سنہ ۱۳۰۹ء مطابق سنہ ۶۸۶ء اور سنہ ۷۰۹ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۲) حسینی نے زاد المسافرین لکھی، سال وفات اس مصنف کا سنہ ۱۳۱۸ء مطابق سنہ ۶۸۶ اور سنہ ۷۱۸ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۳) محمود شستری نے گلشن راز لکھی، سال مصنف سنہ ۱۳۲۰ء مطابق سنہ ۷۲۰ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۴) اوحدی نے کتاب جام جمشید لکھی، سال وفات مصنف سنہ ۱۳۳۸ء مطابق سنہ ۷۳۸ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۵) قاسم انوار نے انیس العارفین لکھی سال وفات مصنف سنہ ۱۴۳۴ء مطابق سنہ ۸۳۷ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۶) عارفی نے گوئی وچوگان لکھی سال تصنیف سنہ ۱۴۳۸ء مطابق سنہ ۸۴۲ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۷) فتاحی نیشاپوری نے حسن ودل لکھی۔ مصنف کا سال وفات سنہ ۱۴۴۸ء مطابق سنہ ۸۵۲ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۸) اہلی شیرازی نے شمع وپروانہ لکھی، سال تصنیف کتاب سنہ ۱۴۸۹ء مطابق سنہ ۸۹۴ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۹) ہلالی نے شاہ وگدا لکھی۔ اس شاعر کے مقتول ہونے کا سال سنہ ۱۵۳۲ء مطابق سنہ ۹۳۹ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۱۰) بہاء الدین آملی نے نان وحلوا شیر وشکر وغیرہ لکھی، وفات مصنف کا سن سنہ ۱۶۲۱ء مطابق سنہ ۱۰۲۰ ہجری کے ہے ؛

شاعری ہائے اصناف بالا کے علاوہ غزل سرائی بھی ہر وقت میں مروج رہی۔ رودکی کے زمانے سے آج تک اِس صنف شاعری کو شعرا برتتے رہے ہیں۔ ذیل میں کچھ غزل گو شعرائے معروف کے نام و سال وفات اندراج پاتے ہیں :-

نام متغزلین	سنہ وفات عیسوی	سنہ وفات ہجری
سعدی شیرازی	۱۲۹۲	۶۹۱
حافظ شیرازی	۱۳۸۹	۷۹۱
سلمان ساوجی	۱۳۷۷	۷۷۹
کمال خجندی	....	۷۸۴
محمد شیریں مغربی	۱۴۰۶	۸۰۹
نعمت اللہ ولی	۱۴۳۱	۸۳۴
امیر شاہی	۱۴۵۳	۸۵۷
بابا فغانی شیرازی	۱۵۱۹	۹۲۵
نرگسی	۱۵۳۱	۹۳۸
لسانی	۱۵۳۴	۹۴۱
وہیری اصفہانی ملا محتشم کاشی وحشی	اِن تینوں شاعروں نے دسویں صدی ہجری کے اخیر میں رحلت فرمائی۔	
اہلی شیرازی	۱۵۳۵	۹۴۲

امیر حسن } شعرائے دہلی سے تھے	۱۳۲۷	۷۲۷
امیر خسرو }	۱۳۲۵	۷۲۵
خواجہ کرمانی	۱۳۵۲	۷۳۵
عبدالرحمن جامی	۱۴۹۲	۸۹۸
غزالی مشہدی	۱۵۷۲	
عرفی شیرازی	۱۵۹۱	
فیضی	۱۵۹۵	
زلالی	۱۵۹۲	
صائب تبریزی	۱۶۷۷	
ہاتف اصفہانی	۱۷۸۵	

واضح ہو کہ ہر چند اقسام بالا کی شاعریوں کو ہر عہد میں فروغ رہا، مگر کسی شاعر نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ نہ کی، اس صنف شاعری کے عدم موجودگی سے فارسی کی شاعری ذلیل اور حقیر معلوم ہوتی ہے، مگر اس صدی کی ابتدا میں اس صنف شاعری کی طرف بھی حال کے شعرائے ایران نے توجہ شروع کی ہے عجب کیا کہ اپنے وقت پر ڈراما نگاری مروج ملک ایران میں ہو جائے اُس وقت اس زبان کی شاعری کو یونانی لاطینی سنسکرت، انگریزی وغیرہ وغیرہ کی شاعریوں کے ساتھ ساتھ مقابلہ کی صورت پیدا ہو سکے گی، اس وقت ڈراما نگاری جو ملک ایران میں مروج ہو چکی ہے وہ معاملات کربلا سے تعلق رکھتی ہے اور اس طرح کچھ تورات کے قصے بشکل ڈراما موزون ہوتے گئے ہیں، ظاہر

ہے کہ جب ڈرامانگاری حسب مراد اس طور پر مروج ایران ہو جائے گی تو فطری شاعری کے رواج پانے کے باعث امید کی جاتی ہے کہ ایرانی شعرا کے حال کا غیر فطری مذاق زوال پذیر ہو جائے گا ؛

جاننا چاہئے کہ زبان فارسی میں بہت سی کتابیں علوم مختلفہ کی موجود ہیں. منطق، طبعیات، فلکیات، ہندسہ، اخلاق سیر و تاریخ وغیرہ وغیرہ کی کتابیں نہایت علمی تقاضوں کے ساتھ تصنیف پائی ہیں، مگر لٹریچر یعنی انشا، کی کتابیں کمتر مذاق صحیح سے خبر دیتی ہیں وہی مبالغہ پردازیاں وغیرہ جن سے فارسی کی شاعری معیوب ہو رہی ہے، فارسی کی نثروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں سوا گلستان سعدی کے بیشتر فارسی کی کتب ادبیہ فطری مذاق تحریر سے بے بہرہ نظر آتی ہیں مثلاً سہ نثر ظہوری کہ بلاشبہ طومار بد مذاقی ہے یہی حال مینا بازار وغیرہ کا ہے تعلیم یافتہ اشخاص کو ایسی کتابوں سے تمام تر وحشت پیدا ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاء پردازان فارس مطلق مذاق صحیح سے بہرہ مند نہ تھے، اُن کے قصے اور کہانی کی تصنیفیں بھی نیچرل رنگ سے علیحدہ معلوم ہوتی ہیں، حتیٰ کہ انوار سہیلی ایسی کتاب بھی بہت مقاموں میں خوش مذاقی سے مُبّرا معلوم ہوتی ہے ؛

چونکہ فارسی اور اُردو کی شاعریاں واحد المذاق ہیں تو اُن کے اصناف میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں کی معروف صنفیں ذیل میں درج ہوتی ہیں :-

فارسی اور اُردو کے اصناف شاعری ، غزل[1] . قصیدہ[2] . قطعہ[3]

رباعی۔ مخمس۔ مسدس۔ مثنوی۔ واضع ہو کر تقسیم بالا عروضی ترکیب پر مبنی ہے۔ مگر مضامین کی رو سے شاعری کی حقیقت ہر صنف کے بیان سے ظاہر ہو گی اصناف مختلفہ کے وضع کئے جانے کی وجہ پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سوال ہوتا ہے، کہ اتنے اصناف کے ایجاد کئے جانے کا باعث کون سا امر ہوا۔ اگر سب اصناف کا تقاضا ایک ہی تھا تو اتنی صنفوں کے وضع کرنے کی حاجت کیا تھی، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنف کا ایک تقاضائے خاص ہے، ضرور کوئی امر ایسا ہے کہ ہر صنف کے برتنے میں شاعر کو اس کا ملحوظ رکھنا واجبات سے ہے، ورنہ اصناف شاعری کا مضمون باطل ہو جائے گا، اب ذیل میں ہر صنف سے بحث کی جاتی ہے، حضرات ناظرین سے توجہ فرمانے کی خواستگاری ہے،

غزل یہ وہ صنف شاعری ہے کہ فارسی اور اردو کے سوا کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے سوا کسی زبان کی ایسی ترکیب بھی نہیں واقع ہوئی ہے۔ جو اس صنف شاعری کے حقوق کو پورے طور پر ادا کر سکے، عربی میں غزل گوئی بشکل امکان رکھتی ہے مگر کسی اہل زبان نے غزل گوئی نہیں کی۔ عجمی شاعروں نے جو زبان عربی میں کچھ غزلیں لکھی ہیں وہ صرف ان کا ایجاد۔۔۔ ہی ایجاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی کو غزل گوئی کے ساتھ پوری مناسبت بھی نہیں ہے، اس صنف شاعری کے ساتھ فارسی ایک خصوصیت رکھتی ہے اور چونکہ اردو کو فارسی کے ساتھ ترکیب زبان و سلسلۂ خیال کے اعتبار سے مشارکت حاصل ہے اس زبان میں بھی غزل گوئی کا لطف بخوبی اٹھتا ہے زبان انگریزی میں شاعری کی

ایک صنف ہے جسے سانٹ (SONNET) کہتے ہیں یہ صنف غزل گوئی سے مشابہت رکھتی ہے۔ مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے کس واسطے کہ سانٹ کو جو کچھ مشابہت غزل کے ساتھ ہے وہ اسی قدر ہے کہ مضامین ذہنیہ از قسم واردات قلبیہ وغیرہ اُس میں قلم بند کئے جاتے ہیں، مگر اس کا پیرایہ غزل سے علٰحدہ ہوا کرتا ہے، سانٹ کی ترکیب کچھ عشقیہ مثنوی کی ہو جاتی ہے، کس واسطے کہ التزام قطعہ بندی غزلیت کی ترکیب ظاہری تمام رہنے نہیں دیتا۔ خیر اب دیکھنا چاہیے کہ خود غزل گوئی کیا شے ہے اور اس صنف شاعری کے کیا کیا تقاضے ہیں ؛

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے کلام کرنا ہے مگر اصطلاح میں اس سے وہ صنف شاعری مراد ہے۔ جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔ جو قلم کیے جاتے ہیں یہ صنف شاعری تمام تر داخلی پہلو (SUBJECTIVE) رکھتی ہے۔ اسی لئے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے چونکہ اس صنف کا یہی تقاضا ہے ذرا سی لغزش سے غزلیت کا رنگ .... کلام قصیدہ نما ہو جاتا ہے یا مبتلائے پست خیالی ہو کر احاطۂ شاعری سے نکل جاتا ہے۔ غزل گو کی شان سے ہے کہ وہ اعلیٰ قسم کا دل و دماغ رکھتا ہو۔ اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت پاک طینت شوخ مزاج نازک خیال گداختہ دل اور برشتہ جگر ہو، امور ذیل غزل گوئی کیلئے ہدایت نامہ متصور ہیں ؛

نمبر (ا) ادائے مطلب کے لئے غزل گو کی زبان کو سلیس ہونا چاہیے

کس واسطے کہ واردات قلبیہ کے بیانات مغلقات سے بے تاثیر ہو جاتے ہیں؛

نمبر(۲) جس قدر ممکن ہو زبان کی سادگی ملحوظ رہے، غزل گوئی کو صنائع بدائع کی حاجت نہیں ہوتی؛

نمبر(۳) حتی الامکان تشبیہ استعارہ دخل نہ پائیں یہ چیزیں شاعر عجز طبیعت سے خبر دیتی ہیں؛

نمبر(۴) مبالغہ پردازی سے جس قدر اجتناب ممکن ہو عمل میں لایا جائے۔ اسی مبالغہ پردازی سے فارسی اور اُردو کی شاعری حقیر اور ذلیل ہوگئی ہے؛

نمبر(۵) اگر تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو اُن کا استعمال فطری خوبیوں کا مخل واقع نہ ہو؛

نمبر(۶) پھبتی ضلع جگت وغیرہ سے اجتناب واجبات سے ہے؛

نمبر(۷) رعایت لفظی بالندار و ہو یا محض طبعی انداز رکھتی ہو ایسا نہ معلوم ہو کہ رعایت لفظی کا کوئی التزام کیا گیا ہے۔ اگر فطری انداز بیان کے ساتھ بلا آورد رعایت لفظی کی شکل پیدا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں؛

نمبر(۸) غزل کے جتنے مضامین ہوں داخلی ہوں، مگر ایسے رفیع درجہ کے ہوں جس سے انسان کے عالم باطنی کا شرف ظاہر ہو سکے، جن سے انسان کی بزرگی اور عظمت ہویدا ہو سکے، جن سے انسان کا دل عرش اللہ تعالیٰ ثابت ہو سکے، جن سے انسان نمونہ قدرتِ خداوندی سمجھا جائے، جن سے انسان کے قویٰ اخلاقیہ کی خوبیوں کا انکشاف مقصود ہو۔ جن سے انسان کی وسعت ادراک کا پتہ مل سکے۔ جن سے عرفان حق کی راہ دکھائی دے سکے، جن سے

عالم روحانی کا اندازہ حسبِ قوتِ بشریہ پاسکے ۔

نمبر (۹) مضامین عشقیہ ایسے نہ ہوں کہ معشوقانِ بازاری کی طرف محمول کئے جاسکیں۔ فسق و فجور سے تمام تر لگاؤ ہوں عشق پیرایہ فسق میں نہ دکھایا جائے، بلکہ اس عظمت اور بزرگی کی شان سے بندش پائے جو اس کی شان ہے ۔ تعالےٰ العشق عن فہم الرجال۔ اسی طرح وہ مضامین جو حسن سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے انداز ایسے عالی ہوں کہ فوراً خیال سامع معشوقِ حقیقی کی طرف کھنچ جائے ۔

جاننا چاہئے کہ حسن و عشق بہ تغیرِ الفاظ صفات خداوندی سے ہیں اس لئے کہ حسن و جمال شئے واحد ہے اور عشق و محبت بھی متحد ہیں جمال کی نسبت حدیث میں وارد ہے ۔ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ اور محبت کے متعلق متعدد آیات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ مثلِ یُحِبُّہُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ، المختصر جو کچھ حسن و عشق کے مفہوم میں شامل و دیگر غیر محدود صفات خداوندی کے عین ذات خداوندی ہیں اور ذاتِ خداوندی کی طرح قدیم ہیں، کس واسطے کہ اگر صفات خداوندی عین ذات خداوندی نہیں ہیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے ۔ خیر اپنا مذہب یہی ہے ۔ بلکہ حسن و عشق کے معاملے میں خیال راقم یہ ہے کہ حسن و عشق شئے واحد ہیں اور بصورت وحدانیت خود خدا ہیں اور تمام ذات و صفات انہی سے مراد ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہیں لاریب وہ بڑا اوچھا شاعر ہے جو مضامین حسن و عشق کو ان کے تقاضے کے مطابق نہ باندھے اور اپنی ترکیب بندش سے انھیں ایسے درجہ ابتذال کو پہنچا دے ۔

کہ سامع کا ذہن معشوقانِ بازاری کی طرف منتقل ہو جائے' اس عہد میں، ایسے غزل گویوں کی کمی نہیں ہے' کمتر ایسے طبیعت دار ہیں جو مضامین حسن و عشق کو اُن کے تقاضوں کے مطابق باندھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے بدمذاق غزل گو ہیں کہ اُن کی دماغی اور دلی بدترکیبی پورے طور پر ان کی کم بینی، خیرہ چشمی بیحیائی بدخلقی بدنفسی اور فرومایگی کا اظہار کرتی ہے ؛

نمبر(۱۰) وصال و فراق کے مضامین فطرت کے احاطہ سے باہر نہ جائیں' وصال و فراق کی فطری کیفیتیں کیا کم لذت خیز ہیں جو غیر فطری اعانتوں کی محتاج قیاس کی جاسکتی ہیں۔

نمبر(۱۱) وصال و فراق کے بیانات بے حیائی کے ساتھ رقم نہ ہوں۔ کہ جس سے طبیعت کو اکراہ لاحق ہو ؛

نمبر(۱۲) ہوا۔ ہوس۔ حسرت۔ رنج۔ ملال' عداوت۔ رشک' جنوں وحشت۔ رغبت۔ نفرت۔ حسد۔ غرور وغیرہ کی بندشیں ایسی نہ ہوں کہ مذاق صحیح سے خارج پائی جائیں (مذاق صحیح عبارت ہے تبعیت فطرت سے)

نمبر(۱۳) کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ غزل گو کو لازم ہے کہ ہمیشہ عالی مضامین پر نظر رکھے اور جس قدر بلند پروازی احاطۂ امکان میں ہو اُسے اپنا شیوہ جانے ؛

نمبر(۱۴) شوخی ضروریات کلام سے ہے' مگر شوخی سے مراد بے حیائی نہیں ہے۔ دیوانِ حافظ شوخی کلام سے بھرا ہوا ہے، مگر حافظ کی شوخی سے مراد بے حیائی نہیں جو مرکوز عوام ہو رہی ہے' بعض شعرا نے شوخی اور بیحیائی کو امر واحد سمجھ لیا ہے اور بے تکلف بیحیائی کے مضامین منظوم فرما گئے ہیں اور

طرہ یہ ہے کہ اُن کے مداحین ان کی بے حیائیوں کو شوخی سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور واہ واہ کی صدا بلند رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کلام میں شوخی نہیں ہوتی ہے وہ کلام تمام تر بے لطف ہوتا ہے۔ مگر شوخی چیزے دیگر۔ بے حیائی چیزے دیگر۔ سعدی کے مقطع میں ذیل میں شوخی ہے بے حیائی نہیں ہے ؎

سعدیا نوبت امشب دہل صبح نکوفت | یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

اسی طرح اُستادوں کے کلاموں میں کم و بیش طور پر شوخیاں دیکھی جاتی ہیں لیکن ایسی شوخیاں فحش و بے حیائی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ فحش و بے حیائی کی مثالیں ایسے ایسے مضامین ہیں، جیساکہ ایک شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے ؎

رات کا خواب الہیٰ توبہ | آپ سنئے گا تو شرمایئے گا

خدارا یہ کیسی شوخی ہے، اگر یہ بے حیائی نہیں ہے تو پھر بے حیائی اور کیسی ہوتی ہے، اس پر طرفہ یہ ہے کہ فقیر نے بعض دعوبداران سخن کو اس نامراد شعر پر وجد کرتے دیکھا ہے۔ لاحول ثم لاحول۔ اسی طرح اور بھی بہت شعر ہیں جو فحش و بے حیائی کے نمونے ہیں، مثالاً ایک اور شعر کا مضمون یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یار ہم سے اس قدر بدگمان ہے کہ اُس نے ہمیں اپنی پوری تصویر نہیں بھیجی، جو تصویر بھیجی ہے وہ صرف اُوپر کے دھڑ کی ہے، استغفر اللہ، کس قدر بد مذاقی نے ترقی کی ہے کہ مذاق صحیح معرض خطر میں جا پڑا ہے۔ المختصر شوخی کو شوخی کی حد میں رہنا چاہیے۔ اگر شوخی درجہ اعتدال سے گزر جائے تو پھر شوخی نہیں رہتی، بے حیائی ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر عوام جسے شوخی سمجھتے ہیں، وہ اقسام بے حیائی سے ہوتی ہے۔ بلاشبہ مرزا غالب

ہیں بڑی شوخی ہے مگر اُن کی شوخی کو بازاری شوخی سے کیا علاقہ۔ بعض شعرا کے کلام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سرسری طور پر دیکھنے میں شوخ نظر آتے ہیں، مگر اُن پر جب نظر ڈالیئے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ اُن میں صرف نمائشی شوخی ہے، سچی شوخی جو لوازم خوش خیالی سے ہے، اس کا نام و نشان بھی اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا ہے، ایسے شعراز مرۂ عوام الناس سے ہوتے ہیں۔ محصل شخص اُنھیں نہ شاعر نہ حکیم مان سکتا ہے، البتہ بازاری اشخاص انھیں شاعر جانتے ہیں اور ان کے جاہلانہ کلام سے حظ اٹھاتے ہیں ؛

نمبر (۱۵) مکروہ مضامین سے اجتناب واجبات سے ہے، اسی طرح ان الفاظ سے بھی احتیاط درکار ہے جو مکروہ مفہومات کے لیئے موضوع کئے گئے ہیں ؛

نمبر (۱۶) غزل گوئی کی سرسبزی کے لیئے اس کی حاجت ہے کہ جو واردات قلبیہ قلم بند ہوں۔ انھیں مجرد شاعر ہی کی زبان سے تعلق نہ ہو، ضرور ہے کہ وہ مضامین فی الواقع دلی انداز بھی رکھتے ہوں۔ تاکہ سامعین کے دلوں میں جگہ کر سکیں ؛

جاننا چاہیئے کہ جس قدر واردات قلبیہ کی بندش شاعر کے قلبی تقاضے کے ساتھ ہوگی، اُسی قدر سامع کے دل میں اس کا اثر پیدا ہوگا " آنچہ از دل خیزد، بر دل ریزد " ایک نہایت منفع اور راست قول ہے۔ اگر کسی شاعر میں سوز و گداز درد خستگی کی کیفیتیں موجود نہیں ہیں تو مجرد اُس کی مضمون بندی حسب مراد تاثیر نہیں پیدا کر سکتی، اُستاد غالب نے خوب فرمایا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ　　　پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

نمبر (۱۷) جس قدر ممکن ہو غزل گو کو چاہیئے کہ تبعیت فطرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔ بعض غزل گو حضرات ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ خلاقِ سخن تو ہیں مگر سخن سنجی میں فطرت کی پیروی کمتر کرتے ہیں تبعیت فطرت کی ضرورت صرف غزل گوئی ہی میں نہیں ہے بلکہ جمیع اصناف شاعری کو اس ضرورت ہے اہل یورپ کی شاعری اسی تبعیت فطرت کی بدولت فروغ عظیم پکڑا ہے۔

نمبر (۱۸) غزل گوئی کی شان سے ہے کہ مضامین حکمت آگیں شاعری کے پردے میں قلم بند کیئے جائیں، اگر کوئی غزل گو حکیم طبیعت نہیں ہے تو اُس کی غزلیں محض عوام پسند ہوں گی اور اہل مذاق کو زنہار پسند نہ آئیں گی، حافظ علیہ الرحمہ کا دیوان کا دیوان اخلاقی فلسفہ ہے۔ اسی لیئے کسی کی تاب نہیں ہے کہ خواجہ کے کمالات کا منکر ہو۔ تمام دنیا میں خواجہ کی خوش کلامی کی شہرت ہے۔ خواجہ کو لندن اور پیرس کے علماء اُسی طرح جانتے ہیں، جتنا کہ شیراز و اصفہان کے اہل علم اُن سے واقفیت رکھتے ہیں؛

نمبر (۱۹) غزل گو کو عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے عاشق مزاجی سے یہ مراد نہیں ہے کہ کسی زن بازاری پر فریفتہ ہو کر کوچہ گردی کرنا اور اس کے وصال و فراق کے مضامین سے اپنے دفتر شاعری کو سیاہ کرنا، اکثر غزل گوئی کے دعویدار شامت اعمال سے اس طرح کی بوالہوسی میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ عاشق مزاجی اسے نہیں کہتے کہ چُنّی گُنّی، لڈن وڈن کی صحبتوں میں اوقات ضائع کی جائے، یہ سب فسق و فجور

کی باتیں ہیں، اُن کو شاعری سے کیا علاقہ۔ جو غزل گو اس طرح کی بداوقاتی ہیں مبتلا ہے گا وہ اعلیٰ درجہ کے مضامین عشقیہ کیونکر موزوں کر سکے گا، پست خیال سے عالی مذاقی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ جاننا چاہیے کہ عاشق مزاجی سے مراد ہے عالم فطرت کے حسن پر محویت کا پیدا ہونا، یہ محویت عشق مجازی ہے۔ لیکن جب وہی محویت حسن فطرت سے منتقل ہو کر سبب حسن فطرت کی طرف رجوع کر جاتی ہے تو درجہ عشق حقیقی کو پہنچ جاتی ہے۔ واضح ہو کر حسن فطرت کے احاطہ وسیع میں حسن انسانی بھی ہے، انسان کا عشق انسان کے ساتھ خلاف فطرت امر نہیں ہے، بخوبی مرد کو عورت کے ساتھ اور عورت کو مرد کے ساتھ عشق پیدا ہو سکتا ہے انسان کا عشق صادق مصائب میں شمار ہونے کے عوض بڑے حسن و اخلاق سے خبر دیتا ہے۔ سیپفو (SAPPHO) جو ملک یونان کی ایک مشہور شاعرہ ہے کسی جوان رعنا سے عشق صادق رکھتی تھی۔ عالم عشق میں غزل سرائیاں کیا کرتی تھی، تمام شعرائے یونان میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے کہ سوز و گداز دردمندی اور نشتریت میں اس کا جواب سمجھا جائے، اُس کے مضامین عشقیہ ایسے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شاعرہ کے کلام میں اس قدر دلیری کا سبب اس کا عشق صادق تھا ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

نمبر ۱۰،۲ غزل گو کا فرض منصبی ہے کہ قرب سلطانی سے تا حد امکان کنارہ کش رہے کسی مصنف شاعری کو قرب سلاطین اور امرا سے اس قدر ضرر

نہیں پہونچتا جس قدر غزل گوئی کو۔ حافظ اور میر تا حد امکان سلاطین و اُمرا سے کنارہ کش رہے اور اگر ملے بھی تو محض واجبی طور پر، خواجہ حافظ کے پاس شاہزادے اور امیرزادے آتے تھے، مگر ان کے ساتھ خواجہ اُس طور پر برتاؤ نہیں فرماتے تھے جیساکہ درباری شعرا کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ ایک بار خواجہ کو شاہ دکن نے ہندوستان میں مدعو کیا تھا۔ خواجہ نہ آئے اور شاعرانہ عذر شاہ کو شعر ذیل کے ذریعہ سے لکھ بھیجا ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم خاک مصلےٰ و آب رکنا باد

اگر زر اندوزی کی ہوس خواجہ کو ہوتی تو سفر کی تکلیفوں کو گوارا کر کے داخل دکن ہو جاتے، بالمختصر یہ کہ خواجہ کی قناعت و رزی گوشہ گیری عزلت پسندی، آزاد مزاجی، سیر چشمی، بے غرضی، بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ اُن کی غزل گوئی کا نظیر دنیا میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اگر خواجہ کو قرب سلطانی کی ہوس ہوتی تو بلاشبہ اپنے حیرت انگیز کمالات سے محروم رہتے اور اُن کی غزل گوئی بھی عرفیؔ، ظہوریؔ، نعمت خاں عالیؔ کی غزل گوئیوں کی طرح بے تاثیر ہو جاتی، میر صاحب بھی سلاطین اور اُمرا کی صحبتوں کے طالب دل سے نہ تھے، چنانچہ جب بحالتِ مجبوری دہلی سے لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ کی دربار داری نہ کر سکے، ایک بار کا ذکر ہے کہ میر صاحب نواب وقت سے ناخوش ہو کر اپنے مسکن پر چلے آئے، اور کثرت ملال سے محموم ہو گئے، جب اُن کی بدمزگی کی خبر نواب کو ہوئی نواب عیادت کے لئے آئے۔ اور ساتھ ایک مرصع لیشب کی نادعلی بھی لاتے

جس بوریا پر میر صاحب پڑے ہوئے تھے، نواب بھی اُس کے ایک کنارے پر بیٹھ گئے ۔ میر صاحب بخار سے آنکھیں بند کیٔے پڑے تھے، جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ نواب سامنے بیٹھے ہیں ۔ مزاج پرسی کے بعد نواب نے اُس نادعلی کو میر صاحب کے گلے میں ڈال دیا ، میر صاحب نے برجستہ یہ مطلع فرمایا ؎

دیوانہ پن ہمارا آخر کو رنگ لایا	جو دیکھنے کو آیا مٹھی میں سنگ لایا

حضرات اہل دانش پر ہویدا ہے کہ دل کی عمدگی کو انسان کے اقوال و افعال سے بڑا تعلق ہے، غزل گوئی خستہ جگر، گداختہ دل، آزاد مزاج عزلت نشین قناعت پیشہ الم کش اشخاص کا شیوہ ہے، ہوسناکی، جاہ طلبی، زر اندوزی وغیرہ سے اس شیوہ کو کیا علاقہ، پس تقرب سلطانی اور غزل گوئی کا انجام ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ فارس کے درباری شعرا کا حال ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ اُن میں سے ایک شاعر بھی اس صنف شاعری میں حافظ یا سعدی کا جواب نظر نہیں آتا ہے، غزل گوئی کیلئے قابلیت علمی کی اس قدر حاجت نہیں ہے کہ جس قدر عمدگی دل کی ۔ عمدگی دل عبارت ہے ان اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان انسان کہلاتا ہے، عمدگی دل کا تقرب سلطانی کے ساتھ برقرار رہنا نہایت غیر متوقع امر ہے، حکیم قاآنی کو دیکھیے کہ کتنا بڑا شاعر تھا، کس قدر استعداد علمی رکھتا تھا اور کس قدر معمر ہو کر مرا ! مگر اس حیرت افزا شاعر کی غزلوں کو جو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا تھا اُس کی وجہ اور نہ تھی، الّا یہ کہ درباری شاعر ہونے کے باعث اُسے آزادی قناعت ودزی، عزلت نشینی خودداری بے پروائی وغیرہ کی صفتوں کو برقرار

رکھنے کا کبھی موقع حاصل نہ تھا جس شاعر کی یہ اوقات ہو کہ بادشاہوں کی تقریبات میں قصیدہ نگاری کی زحمت ہمیشہ گوارا کیا کرے وہ اپنی عمدگی دل سے کیا کام لے سکتا ہے۔ ایسے شاعر کا غزل گو ہونا محال عقلی سے ہے، اگر ایسا شاعر غزلگو ہُوا ہے نہ ہوگا۔ چنانچہ حکیم قاآنی کی غزل گوئی راقم کے اس دعوی کی پوری معین معلوم ہوتی ہے۔ اوّل تو اس شاعر کی غزلیں بہت تھوڑی ہیں اور جو ہیں بھی، اُن سے آشکارا ہے کہ اُسے واردات قلبیہ اور معاملات روحانیہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کم نصیب ہوئی ہے، ساری غزلوں میں شاعری کا خارجی پہلو (OBJECTIVE) پایا جاتا ہے اسی لئے کمتر سوز وگداز درد وخستگی وغیرہ کی کیفیتیں اُن میں درک ہوتی ہیں بخلاف حافظ کے کہ اُن کی تمام غزلیں داخلی رنگ (SUBJECTIVE) میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس سبب سے حق غزل گوئی کو دام دام ادا کر رہی ہیں، واضح ہو کہ فارس ہی کے درباری شعرا کی یہ حالت نہیں ہے کہ غزل گوئی میں پھیکے نظر آتے ہیں بلکہ کم وبیش طور پر تمام درباری غزل گویوں کا یہی حال دیکھا جاتا ہے، ایشیائی درباروں میں آزادی کہاں اگر فردوسی بھی ہو تو اُسے پائے پیل سے پیسے جانے کے لئے مستعد رہنا چاہیئے پس غزل گوئی جس کا مدار روح کی آزادی پر ہے، فردوسی سے بھی حسب مراد انجام نہیں پا سکتی ہے۔ یورپین درباروں میں ایشیائی درباروں کے اعتبار سے بہت زیادہ آزادی ہے، مگر درباری شاعر ہو کر پورے طور پر آزادی کو قائم رکھنا بہت خلاف توقع ہے، انگلستان ایک بہت آزاد ملک ہے مگر وہاں بھی ابھی تک ایک شخص تنخواہ دار دربار سے متعلق رہا کرتا ہے کہ جس

کی خدمت یہ ہے کہ بادشاہ وقت کے محل میں جو شادی اور غمی کی تقریبیں ہوں اُن کے متعلق اشعار تہنیت و تعزیت لکھا کرے، اس شخص کا لقب "پوئٹ لاریٹ" ہے یہ اسی طرح کا کام ہے کہ جیسے مثلاً قاآنی فارس میں یا ذوق دہلی میں انجام کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ اس پابندی کے ساتھ غزل گوئی نہ ہندوستان نہ انگلستان نہ ایران میں انجام پا سکتی ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی خاص درباری شاعر کو اتفاق وقت سے غزل گوئی کی فطری صلاحیت حاصل ہو مگر درباری شاعری کا تقاضا ایسا نہیں ہے کہ اُس سے غزل گوئی کے حقوق پورے طور پر ادا ہو سکیں، بلا شبہہ درباری معاملات کبھی ایسے نہیں ہوتے کہ اُن میں سوز و گداز و خیر کو ذرا بھی دخل ہو۔ درباروں میں حافظ یا میر ایسے شاعروں کی کوئی ضرورت متصور نہیں ہے اور وہ بھی خاص کر ایشیائی درباروں جہاں آزادی حکم عنقا رکھتی ہے۔ جائے لحاظ ہے کہ جب انگلستان ایسے آزاد ملک میں شاعری پر درباری اثر پیدا ہوتا ہے، تو دلے بر حال اُن درباروں کے جہاں شاعر کی گردن جلاد کی تلوار کے سائے تلے ہمہ دم رہا کرتی ہے، اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ملک انگلستان میں کسی کو بے جرمی کی حالت میں سزائے مرگ یا کسی طرح کی سزا پالی کا خوف نہیں ہے۔ پس ایسے ملک کے درباری شاعر کو ضرور ہے کہ ایشیائی درباروں کے شاعروں سے بہت زیادہ آزادی اور عزت حاصل رہے، چنانچہ امر واقعی بھی یہی ہے کہ ٹینیس صاحب نے نہایت آزادی اور عزت کے ساتھ اپنی عمر بسر کی مگر اِس آزادی اور عزت کے حاصل رہنے پر بھی اُن کو اپنے عہدے کے تقاضوں سے مفر نہ تھا، لاریب اگر اُن کو درباری تعلق نہ ہوتا تو بہت سے اُن کے کلام جو اُن

کی عہدہ داری کے نتائج معلوم ہوتے ہیں وجود پذیر نہ ہوتے جائے لحاظ ہے کہ جب درباری اثر اس طور سے ٹینیس صاحب کی شاعری پر دیکھا جاتا ہے تو وائے برحال قاآنی کہ جو بیچارہ ایک ایسے دربار سے متعلق رہا کہ جس کی خوشی و ناخوشی پر اُس کی حیات و ممات موقوف تھی ایسے شاعر سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ سچی شاعری کی داد دے سکتا ہے یا دل کی عمدگی کا لطف دکھلا سکتا ہے،

جو کیفیت ایران کے درباری شاعروں کی دکھائی دیتی ہے، بجنسہٖ دہلی اور لکھنو کے شعرا کی بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ذوق کہ جو دنیاوی ضرورتوں سے درباری شاعر بننا پڑا تو اُن کی غزل گوئی کو بہت سی مضرتیں لاحق ہوتی گئیں، اول تو اُن کی قابلیت کے مطابق اُن کا دیوان جمع نہ ہوسکا، دوم یہ کہ اُنھیں جو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوئی تو اُن کی اکثر غزلوں میں غزلیت کا پورا مزا پیدا نہ ہوسکا ظاہر ہے۔ کہ جس غزل گو کی یہ اوقات ہو کہ کبھی اُسے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا پڑے اور کبھی نواب سے مصاحبت گرم رکھنی ہو وہ غزل گوئی کی داد کیونکر دے سکتا ہے، ذوق بیچارے کی یہ حالت تھی کہ کبھی حاضر ہو کر ظفر شاہ کی غزلیں بناتے تھے، کبھی نواب الٰہی بخش خان کے لیئے غزلیں تیار کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات کچھ بھی غزل گوئی پر قادر نہ تھے بادشاہ صاحب کبھی ایک مصرع کبھی نصف مصرع اور کبھی ایک شعر موزوں فرما لیتے تھے، اور نواب صاحب تو اتنی بھی قدرت نہ رکھتے تھے ذوق کو ان دونوں آقاؤں کے لیئے غزلیں درست کرو بنانا پڑتی تھیں۔ ایسی صورت میں کہ شاعر کو آزادی حاصل نہ ہو۔ اغراض غزل گوئی کے پورا کرنے پر کیا قادر ہوسکتا ہے ایسے پریشان اوقات شاعر کی

غزلوں میں کیونکہ آزادی، درد، سوز۔ گداز۔ خستگی کی صفتیں پائی جاسکتی ہیں
ناممکن تھا کہ ذوق کی غزل گوئی خواجہ میر درد یا میر تقی میر کا رنگ پیدا کر سکتی علاوہ
اس مشغلہ کے کہ ذوق ظفر شاہ اور نواب الٰہی بخش کے لئے غزلیں بنایا کرتے
تھے، تقریبات شاہی میں انھیں قصیدہ گوئی کی زحمت بھی اختیار کرنا پڑتی
تھی۔ غزل گوئی ایسے پاک کام کو مدح گوئی کے جھوٹ سچ سے کیا علاقہ رذیل
دھندے کے ساتھ شریف دھندا چل نہیں سکتا، آخر کار کثرت دروغ
سرائی سے ضرور ہے کہ شاعر کی طبیعت کو بے حسی لاحق ہو جو تقاضائے غزل
گوئی کا بہت منافی ہے، تقرب سلطانی سے متضرر ہونے کی دوسری مثال میر
انشاء اللہ خاں کی ہے، سید صاحب جب تک نواب سعادت علی خان
کی مصاحبت میں عمر ضائع کرتے رہے ان کی غزلگوئی بے مزہ رہی مگر جب ترک
خدمت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تو ان کے کلام میں فی الجملہ خستگی، سوز،
درد، گداز کا مزہ آگیا۔ فقیر اس امر کا زنہار قائل نہیں ہے کہ کوئی شاعر دربار
داری بھی کرے اور غزلیت کا لطف بھی دکھلائے، یہ کام گوشہ نشینان الم
کش کا ہے، حریص طامع تنگ چشم اور پیٹ کے بندے سے غزل گوئی
تشکل امکان نہیں رکھتی، یوں تو اگلے زمانوں میں بڑے بڑے شعراء جو دولت
فقر سے مالا مال تھے گزرے ہیں مگر اس عاجز نے اپنے زمانہ میں بھی ایک
ایسے شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیارت ثواب سے خالی نہ تھی، یہ ہمارے
مولوی وحید الہ آبادی تھے، شاعر کے لئے جتنی صفتیں درکار ہیں ان کی ذات
بابرکات میں موجود تھیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق تھا نہ کھانے سے

ذوق، دونوں سے نہایت بے پروا اور آزاد تھے، جہاں نیند آئی سو رہے۔ جہاں جی چاہا چلے گئے، دنیا میں کیا ہوتا ہے، اُس سے اُن کو کوئی بحث نہ تھی، جن لوگوں سے احتراز مناسب سمجھا، بے ربطی رکھی، کسی کی بُرائی میں کبھی زبان نہ کھولی، اگر کسی نے بُرا کہا تو اُس کا جواب نہ دیا، شکایت، غیبت، گلہ وغیرہ کی فرصت اُنھیں افکارِ شاعری سے نہ تھی، سالہا سال کی ملاقات میں اس عاجز نے اُنھیں کسی کو بد کہتے نہ سُنا۔ جس کا ذکر آ گیا اس کو اچھا ہی کہا ہر طرح کے حسد سے اُن کا سینہ پاک تھا حتیٰ کہ شاعرانہ حسد بھی اُن کے دل میں نہ تھا، قناعت، سیرچشمی، عجز، صبر، تحمل، صدق و صفا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، قلب اس قدر سوز و گداز سے بھرا پایا تھا کہ اُن کی صحبت میں طبیعت کو بیچینی پیدا ہوتی تھی، طلبِ جاہ سے نہایت دُور تھے، اُن کے دماغ میں اِس خیال کا گذر ہی نہیں ہوا تھا کہ حکام و امراء کے حضور میں حاضر ہو کر کسی طرح کا رسوخ پیدا کیجئے وہ ایسے لوگوں کے مذاق سے خبر بھی نہیں رکھتے تھے کہ جو حکام وقت کے درباروں کی شرکت پر جان، مال و آبرو نثار کر دینے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور کمال بے حیائی اور نادانی سے اس طور کی گھس پیٹھ کو سرمایۂ عزت و منزلت جانتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم تمام ایسی صفات سے متصف تھے جو اعلیٰ درجہ کے پاک سرشت، پاک طینت شاعر کے لیے درکار ہیں، پس لاریب انھیں صفات حمیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں سوز و گداز و خستگی کی کیفیتیں اس درجہ پائی جاتی ہیں، اہلِ انصاف کے نزدیک اُن کا کلام سرمایۂ ناز و افتخار ہے، زبان کی عمدگی سلامت اور روانی کے علاوہ

اُن کے کلام کی پُرتاثیری سے سوائے حاسد کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اُن کا کلام کہے دیتا ہے کہ ہم اس کے نتیجہ فکر ہیں کہ جس کی خلقت میں خدا نے سادگی راستی، سیرچشمی، حلم۔ تحمل، صبر، رضا، سوز و گداز، درد، خستگی، آزادی، قناعت مروّت، حیا۔ صدق، صفا، عشق، محبت، عجز، انکسار وغیرہ وغیرہ کی صفتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ ایسے صافی طبنیت پاک خصلت شاعر کے ساتھ اس ننگ شاعری کو کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو حکام وقت کے وقت مناقب کے قصیدے بغل میں دابے دربار وں اور حکاموں کے جلسوں میں پڑھتا پھرتا ہے اور شاعری سی عزیز شے کے ذریعہ سے اپنے کو ذلیل و خوار بنائے رہتا ہے

بہ بیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا +

ہمارے شہر پٹنہ میں ساٹھ ستر برس پہلے حضرت راسخ گذرے ہیں جو جواب میر مانے جاتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے اُنھیں تمام صفات حمیدہ سے متصف فرمایا تھا، جو سچے شاعر کے لئے درکار ہیں۔ راسخ نہ درباداری کرتے تھے نہ حکام و امرا، سے سروکار رکھتے تھے فقر و قناعت میں عمر بسر کر ڈالی، ارباب مذاق سے اُن کے دیکھنے والوں میں اب اس شہر میں خواجہ محمد شاہ صاحب شہرت رہ گئے ہیں، خواجہ صاحب سے معلوم ہُوا کہ حضرت راسخ مرحوم فقیر طبیعت اور فقیر دوست آدمی تھے۔ اکثر شاہ باقر کے تکیہ پر قیام رکھتے تھے، اہل دولت سے کم ملتے تھے، صحبت فقرا میں ہمیشہ رہتے تھے، تب ہی تو اُن کے کلام میں اس قدر مزا ہے، بے فقیر دل ہوئے نہ کلام پُر تاثیر ہُوا ہے نہ ہو گا۔ درباری شاعری کیا، اور اس کی شاعری کیا

وہ پیٹ کا بندہ ہے، دروغ سرائی اس کا شیوہ ہے اسے کلام کے باتاثیر اور بے تاثیر ہونے سے کیا مطلب ایسے شاعر کی شاعری کو تعلق شکم سے ہوا کرتا ہے نہ دل سے ۔

اب ذیل میں راقم کچھ شعرائے فارسی اور اردو کا ذکر اس خیال سے حوالۂ قلم کرتا ہے کہ جو جو امور غزل گوئی کی نسبت بیانات بالا میں چھوٹ رہے ہیں وہ بھی احاطۂ تحریر میں در آئیں اور بھی غزل گوئی کے تقاضوں کی مثالیں اُن کے کلاموں سے وضاحت پذیر ہوں ۔ حضرات ناظرین کو ان یاددہی کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے ۔ کہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس کتاب کی جو غرض ہے وہ حقیقتِ شاعری کا بیان ہے نہ شاعروں کا شمار اس سے مطلب ہے اور نہ اُن کے حالات کی سیر اِس سے مدعا ہے ۔ اس لئے کہ حسبِ وسعت ضرورت کچھ شعراء کے کلاموں کی نسبت عاجز اپنے خیالات نذر ناظرین کرتا ہے ۔

فارسی شعراء کا عدد اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہل ہمت ان کا تذکرہ حسبِ مراد لکھنا چاہے تو اس کو اس کلام کے لئے انسان کی دو عمر طویل درکار ہوگی ۔ مگر اس کثرت شعرا کے ساتھ بھی اچھے غزل گویوں کی تعداد بہت نظر نہیں آتی ، راقم کی دانست میں سرآمد متغزلین خواجہ حافظ ہیں اور ان کے بعد دس پانچ ہی نام ہیں جن کو غزل گو کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں فقیر کی دانست میں اس صنفِ شاعری میں خواجہ کا جواب کوئی شاعر نہ فارس میں دیکھا جاتا ہے نہ ہندوستان میں ، خواجہ کی غزل گوئی ایسی ہے کہ اُس کے ساتھ

فارسی یا اُردو کے کسی شاعر کی غزل گوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے یہ وہ غزل گوئی ہے کہ برائے خود مصداق غزل گوئی ہے خواجہ کا دیوان غزلگوئی کا نمونہ ہے جہاں سے پڑھیئے ہر غزل، ہر شعر، ہر مصرع غزلگوئی کی مثال ہے، ایسا کوئی غزل گو کسی زبان میں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ اس کا دیوان پُورے طور سے غزل گوئی کے تقاضوں کے مطابق ہو. بہر حال خواجہ کو مستثنیٰ کر کے جب دیگر متغزلین پر نگاہ ڈالیئے تو اغراض غزل گوئی کو مدِنظر رکھنے والے بس چند ہی حضرات دکھائی دیتے ہیں جیسے سعدی جامی۔ فغانی میلی کلیم ہلالی، اہلی خسرو، حزیں، ان شعرائے متغزلین کے کچھ کلام درج ہذا کیئے جاتے ہیں، اُن کے انداز کلام سے کم و بیش طور پر غزل سرائی کے تقاضے وضاحت پذیر ہوں گے

خواجہ حافظ

آپ کا نام شمس الدین محمد ہے، غزل سرائی میں حضرت خواجہ کا آج تک کوئی نظیر نہیں پایا جاتا حتی کہ سعدی علیہ الرحمتہ بھی اس صنف شاعری میں خواجہ تک نہیں پہنچے ہیں، سعدی کو مذاق شاعری بطرز تنوع حاصل تھا. اور مختلف اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے یہ تنوع کی کیفیت خواجہ میں موجود نہ تھی. اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ فطرت کی رو سے شاعری کا تمام تر داخلی مذاق رکھتے تھے، برخلاف اس کے سعدی کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو سے مناسبت حاصل تھی. مگر داخلی مذاق اُن کا حافظ کے داخلی مذاق کے برابر نہ تھا، اس لیئے غزلگوئی میں خواجہ کے برابر لطف کلام پیدا نہ کر سکے، حافظؔ اور سعدیؔ کی طرح بجنسہٖ کیفیت میرؔ اور مرزا کی معلوم ہے مرزا رفیع سوؔدا میں لطف تنوع حاصل تھا، یہ بات میر تقی میں نہ تھی، مگر خاص غزل گوئی

ہیں مرزا رفیع سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے، جس طرح سعدی اصناف شاعری پر قادر تھے، سودا کو بھی ویسی ہی قدرت حاصل تھی۔ ان دونوں شاعروں کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے برتنے کی بڑی صلاحیت حاصل تھی، شیخ علیہ الرحمہ مثنوی، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ یعنی اصناف شاعری کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں اور مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کا جواب کوئی شاعر نظر نہیں آتا ہے یہی کیفیت مرزا سودا کی بھی معلوم ہوتی ہے مگر غزل گوئی میں نہ سعدی حافظ کے اور نہ مرزا میر کے جواب معلوم ہوتے ہیں، اگو سعدی اور مرزا اس صنف شاعری میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، حافظ کی غزل گوئی کے ایسے کمالات ہیں کہ راقم کو ان کے بیان کی قدرت حاصل نہیں، حضرات ناظرین اول ان مضامین کو ملحوظ رکھیں جنھیں فقیر نے غزل گوئی تمام اُن مضامین کی مصداق ہے علاوہ اُن خوبیوں کے حافظ کا کلام ایک انداز کا ہے، دیوان کا دیوان اُن خوبیوں سے بھرا ہوا ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی غزل گوئی کے لیئے درکار ہیں یوں تو غزل گوئی کے لیئے اعلیٰ درجہ کی واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کی بندش کی بڑی حاجت ہے بغیر اس التزام کے غزل گوئی حسب مراد رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتی ہے۔ مگر حافظ کے داخلی مضامین ایسے عالم سے خبر دیتے ہیں کہ جس کو ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں، صرف دل کی آنکھ کا کام ہے کہ اس عالم کو معائنہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ صوفی مذہب والوں نے اپنے خیالات کے مطابق خواجہ کے دیوان کے دیوان کی شرح لکھی ہے، حضرات صوفی مذہب جو کچھ لطف تاویلات دکھائیں، مگر ہم عوام الناس کے لیئے بھی خواجہ کا دیوان ایک

ذخیرہ حیرت ہے اور جو فہم معمولی انسان کو عطا ہوا ہے اس کے ذریعہ سے خواجہ کے کلام کا کچھ مزا نہیں اُٹھتا ہے اہل علم کے لئے خواجہ کا سارا کلام فلسفۂ اخلاقی کا حکم رکھتا ہے، کچھ غزلیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہیں سبحان اللہ کلام کا ہے کو ہے ملائک کی تسبیح و تہلیل ہے ؎

تا ز میخانہ و مے نام و نشان خواہد بود
سر من خاک رہ پیر مغان خواہد بود

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہمان خواہد بود

بر سر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارتگہ رندان جہان خواہد بود

بہ نہ بینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

برو اے زاہد خود بین کہ ز چشم من و تو
راز این پردہ نہان است و نہان خواہد بود

ترک عاشق کش من مست برون رفت امروز
تا دگر خون دل مردم رواں خواہد بود

عیب مستان مکن اے خواجہ کزیں کہنہ رباط
کس ندانست کہ رحلت بچساں خواہد بود

چشمم آندم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد
تا دم صبح قیامت نگران خواہد بود

بخت حافظ گر ازیں گونہ مدد خواہد کرد
زلف معشوق بدست دگراں خواہد بود

حضرات ناظرین خدا گواہ ہے کہ اس غزل کو درج نہ کر تا شروع کیا تھا کہ عجب حالت دیدہ و دل ہو گئی۔ چند منٹ تک کیا جان پر گزری، نہ زبان کو قدرت ہے نہ قلم کو یارا ہے کہ لکھے۔ سبحان اللہ! کلام ایسا تو ہو کہ دل کو ہلا دے ورنہ بے تاثیر مضمون بندی کا ماحصل کیا۔ اگر غزل گوئی صرف مضمون آفرینی کا نام ہو تو فردوسی عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ ظہیر۔ خاقانی۔ عرفی۔ ظہوری۔ نعمت خاں، صائب۔

شوکت بخارائی۔ نظیری وغیرہ وغیرہ کو بھی فقیر غزل گو کو جانتا۔ یہ حضرات بڑے بڑے شاعر تھے مگر غزل گو نہ تھے، فقیر پر ان شعرائے نامی کے تمام تصانیف کا اتنا اثر کبھی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ اس وقت ان چند اشعار کے کاپی کرنے کے وقت محسوس ہوا ہے بہر حال دل پر اختیار کر کے خواجہ کی کچھ اور غزلیں بھی نذر ناظرین کرتا ہے۔

غلام نرگسِ مستِ تو تاجدار انند
خراب بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند

بزیر زلف دوتا چوں گزر کنی بنگر
کہ از یمین و یسارت چہ بیقرار انند

گزار کن چو صبا بنفشہ زار و ببین
کہ از تطاولِ زلفت چہ سوگوار انند

رقیب درگزر و بیش ازیں مکن نخوت
کہ ساکنانِ درِ دوست خاکسار انند

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گار انند

نہ من بر آن گلِ عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من
پیادہ مے روم و ہمرہان سوار انند

بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کار انند

خلاص حافظ ازان زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

نہایت جائے حیرت ہے کہ دس شعر کی غزل میں سارا اخلاقی فلسفہ مع الہیات بھرا ہوا ہے فی الواقع خواجہ نے کوزہ میں دریا بھر دیا ہے اُس پر سے لطف بالائے لطف یہ ہے کہ کوئی مصرع کہیں سے غزلیت کے پایہ سے اُتر الغرض نہیں آتا

ہے ایسے ایسے حکیمانہ مضامین کو غزل سرائی کے پیرایہ میں اتنی آسانی کے ساتھ
موزوں کرنا یہ خواجہ ہی کا کام ہے، بغیر موید من اللہ ہوئے، کوئی شاعر یہ لطف کلام
پیدا نہیں کر سکتا، حقیقت یہ ہے کہ کوئی تعلیم غیبی خواجہ کو نصیب ہوئی تھی ورنہ
یہ طرزِ بیان کہاں کسی کو آسکتا ہے، صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الہام کے ذریعے
سے کلام فرماتے ہیں، جیسا کہ خود اُن کا فرمودہ ہے

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ‏ ‏ انچہ استاد ازل گفت ہماں مے گویم

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند ‏ ‏ گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و اوصلح فتاد ‏ ‏ حوران رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
ساکنانِ حرمِ سر عفافِ ملکوت ‏ ‏ با من راہ نشین بادۂ مستانہ زدند
جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ‏ ‏ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند
آسمان بارِ امانت نتوانست کشید ‏ ‏ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند
نقطۂ عشق دلِ گوشہ نشینان خون کرد ‏ ‏ ہمچو آن خال کہ بر عارضِ جانانہ زدند
ما بصد خرمنِ پندار زرہ چون بردیم ‏ ‏ چون رہِ آدمِ خاکی بہ یکے دانہ زدند
آتش آن نیست کہ بر شعلہ او خندد شمع ‏ ‏ آتش آن است کہ بر خرمن پروانہ زدند

کس چو حافظ نہ کشید از رخِ اندیشہ نقاب
تا سرِ زلفِ عروسانِ سخن شانہ زدند

غزل کا ہے کو ہے دونوں عالم کی سیر ہے، اخلاق تدبیر المنزل تمدن الٰہیات یعنی کہ تمام
اقسام فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ درجہ کے مسائل اِن چند اشعار میں کمال خوبی و لطافت

کے ساتھ موزوں کر دیئے گئے ہیں، پھر طرز بیان ملائی مذاق سے کس قدر دور ہے شاعری ہے کہ ہر پہلو سے لپٹی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند شعرائے اردو نے شعرائے فارس کی تتبع سے اردو کو ایک معقول صورت بخشی ہے مگر جس قدر عمدگی خیالات کی کثرت خواجہ کے دیوان میں دیکھی جاتی ہے، اس کا سولھواں حصہ کسی اُردو کے شاعر کے دیوان میں نہیں پایا جاتا، حافظ کے کلام کو بغور دیکھنے سے کسی اُردو کے شاعر کی غزل گوئی باوقار نظر نہیں آتی ہے، مقابلہ سے اُردو کی غزلگوئی ایسی محقر ہو جاتی ہے کہ جیسے کوہ ہمالیہ کے سامنے دہلی کی پہاڑی ہے

مژدہ ایدل کہ مسیحا نفسے مے آید — کہ ز انفاس خوشش بوئے کسے مے آید
از غم و درد مکن نالہ و فریاد کہ دوش — زدہ ام فالی و فریاد رسے مے آید
ز آتش وادی ایمن نہ منم خرم و بس — موسیٰ اینجا بامید قبسے مے آید
ہیچکس نیست کہ در کوئے تواش کارے نیست — ہر کس اینجا بامید ہوسے مے آید
کس ندانست کہ منزلگہ معشوق کجاست — اینقدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید
جرعۂ دہ کہ بہ میخانۂ ارباب کرم — ہر حریفے ز پئے ملتمسے مے آید
خبر بلبل ایں باغ مپرسید کہ من — نالۂ می شنوم کز قفسے مے آید
یار را اگر سر پرسیدن بیمار غم است — گو بیا خوش کہ ہنوزش نفسے مے آید

یار دارد سر صید دل حافظ یاران
شاہبازے بہ شکار مگسے مے آید

خواجہ کا کلام فلسفہ و حکمت سے کہیں خالی تو ہوتا ہی نہیں ہے، مگر غزل بالا میں یہ شعر یعنی کس ندانست کہ منزلگہ، الیٰ آخرہ کچھ ایسا قول ہے کہ دو ہزار شاعروں کا حصہ

ٹھنڈا کر دینے والا ہے یہ شعر نہیں ہے خدا جانے کیا ہے، بنی آدم میں جو محقق سے محقق شخص گذرا ہے اور جو آیندہ گزرے گا معرفت الٰہی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، تمام علوم انسانی کی مدد سے اسی قدر درک میں آسکتا ہے جتنا کہ خواجہ فرما گئے ہیں، کسی رتبہ کا کوئی عالم الٰہیات ہو اگر اسے ذات باری تعالیٰ کی دریافت ہوگی تو اتنی ہی ہوگی کہ وہ ہے مگر کیا ہے۔ اور کہاں ہے اور کس طرف ہے اس کی حقیقت کا انکشاف امکان سے باہر ہے، پس جائے لحاظ ہے کہ خواجہ نے آدمی کی مجبوری عرفان کو کس خوبصورت پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، ملٹن نے بھی مضمون عرفان کو لکھا ہے اور کوئی شک نہیں خوب لکھا ہے، مگر خواجہ کا بیان ملٹن کے بیان پر بہت غالب نظر آتا ہے، اس شعر کی غزلیت عجب لطف رکھتی ہے اور اعلیٰ مضمون کے تقاضے کے مطابق طرز بیان کس قدر پُر وقار دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ وہ شاعر ہیں کہ ہر چند اصناف شاعری سے صرف ایک صنف شاعری یعنی غزلگوئی کے برتنے والے ہیں، مگر اس ایک صنف میں انھوں نے دونوں عالم کی سیر دکھائی ہے، لاریب اگر خواجہ نہ ہوتے تو فارسی کی شاعری کو اس قدر بلند پائگی نصیب نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ حافظؔ اور سعدیؔ فارسی شاعری کی جان ہیں، یا دو آنکھیں ہیں جن سے شاعری کا چہرہ بازی گاہِ نظر اہل نظر ہو رہا ہے راقم کی کیا طاقت ہے کہ خس برابر بھی خواجہ کی ثنا خوانی کر سکے۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تو پیدا ہو کر اب حضرت سعدی کی غزل گوئی کی طرف حضرات ناظرین کی توجہ کا طالب ہے

سعدی :۔ مصلح الدین نام نامی ہے اور سعدی تخلص، آپ بھی خواجہ

حافظؔ کی طرح شیراز وطن ہیں۔ سو برس خواجہ کی وفات کے قبل رحلت فرمائی، جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی وفات سنہ ۶۹۱ ہجری میں واقع ہوئی اور حافظ کی سنہ ۷۹۱ ہجری میں سعدی کی نسبت بعض محققین ...... لکھتے ہیں کہ غزل کے موجد حضرت ہیں، مگر یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ مولانا روم و نظامی و بعض دیگر شعرا کی غزلیں دیکھی جاتی ہیں اور یہ حضرات قبل شیخ کے رحلت فرما چکے تھے۔ لیکن اگر غزل گوئی کے کسی خاص رنگ کے موجد حضرت قرار دیئے جائیں تو دور از صحت نہ ہوگا۔ بہرحال غزل سرائی کی حیثیت سے حضرت سعدؔی حضرت حافظ کو نہیں پہنچتے ہیں، ہر چند شیخ کے کلام میں شوخی، ملاحت وغیرہ ہے اور شیخ فلسفۂ اخلاقی سے ماہر اور فلسفۂ اخلاقی کے بڑے معلم بھی گزرے ہیں مگر حضرت میں خواجہ کے اعتبار سے غزلگوئی کا مادہ بہت کم موجود تھا، اس لئے اپنی اطلاع فلسفہ و حکمت کو پیرایہ شاعری میں اُس خوبی کے ساتھ نہیں بیان فرما سکتے جیسا کہ خواجہ اس امر پر قادر نظر آتے ہیں، بعض غزلیں حضرت سعدؔی کی نہایت حکیمانہ رنگ کے ساتھ بڑی غزلیت سے معمور دیکھی جاتی ہیں، مگر دیوان کا دیوان خواجہ کے دیوان کی طرح انتخاب کا حکم نہیں رکھتا ہے، بعض کلام تو ایسا ہے کہ اس میں غزلیت کی تو بو بھی نہیں پائی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واعظ صاف صاف نظم میں ارشاد فرما رہا ہے۔ خیر غزل گوئی میں جو کچھ شیخ خواجہ سے کم ہوں مگر شیخ کا مذاق بہ حیثیت تنوع خواجہ کے مذاق پر ہزار درجہ زیادہ غالب تھا، بلکہ خواجہ میں تنوع کا لطف گویا کچھ نہ تھا، خواجہ ایک فنی تھے اور شیخ هزار فنی، لیکن اُس کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خواجہ کی ایک فنی

حوصلہ انسانی سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ گو شیخ کی شاعری کا تنوع بھی ایک نہایت حیرت افزا امر ہے، فقیر کے خیال میں سعدی کے مقابلہ کا کثیر المذاق شاعر فارسی میں کوئی نہیں گزرا ہے۔ اس قدر صاف اور شفاف دماغ نہ فردوسی نہ نظامی نہ انوری نہ سنائی اور نہ فارس کے اور کسی نامی شاعر کا ہے، نظم و نثر دونوں کی یہ حالت ہے کہ اکثر قول ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے ایسی مقبولیت کسی ناظم یا نثار کے کلام کو حاصل نہیں ہے، حق تو یہ ہے کہ سعدی تمام شعرا و نثاران عجم پر غالب ہیں لیکن غزل گوئی میں صرف خواجہ حافظ سے کم ہیں، ظاہرا یہ امر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علم و فضل میں خواجہ سے کم نہ تھے اور مذاق شاعری ہر قسم کا رکھتے تھے، علاوہ اس کے سیر و سفر سے وفور اطلاع کی صورت بھی پیدا کی تھی، اس پر بھی حافظ سے غزلگوئی میں کم کیونکر رہ سکے، اس کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ غزلگوئی کے لئے ایک خاص صلاحیت درکار ہے، علم و فضل کثیر المذاقی اور جہان گردی کو کوئی خصوصیت اس صنف شاعری کے ساتھ نہیں ہے، آدمی عالم سے عالم حکیم سے حکیم نہایت کثیر المذاق اور بڑا سیاح ہوسکتا ہے، اس کے یہ سب کمالات صلاحیت خلقی کی کمی کی حالت میں غزل گوئی کو مطلق نہیں ہوسکتے بلکہ غزلگوئی کے لئے سیر و سفر کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے خواجہ نے خوب کیا کہ شاہ دکن کی دعوت قبول نہ فرمائی، اس سفر ہندوستان سے ان کی غزلگوئی کو کوئی فائدہ مترتب نہ ہوتا بلکہ یہ سفر اور شاہی تقرب بہت کچھ ان کے کمالات کا مانع ہوتا۔ جاننا چاہیئے کہ غزل گوئی وہ صنف شاعری ہے کہ جس میں جہاں گشتی کی کوئی حاجت نہیں۔ اس سبب سے کہ غزلگوئی کو ان

اُمور سے تعلق ہوتا ہے جو محض داخلی پہلو رکھتے ہیں غزل گو کا مطمح نظر اس کا درون ہی ہوتا ہے اُسے عالم خارج کے مشاہدہ کی کوئی محتاجی لاحق نہیں رہتی غزل گوئی عزلت نشین کا شیوہ ہے، جہانگردی اُس کے دائرہ احتیاج سے باہر ہے ؎

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است ۔۔۔ چوں روئے یار ہست بصحرا چہ حاجت است

لیکن چونکہ حضرت شیخ کو شاعری کا مذاق بطرز تنوع حاصل تھا، اگر سیر و سفر سے تمتع کثیر حاصل نہ فرما لیتے تو مختلف اصناف شاعری پر قادر نہ ہو سکتے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

تمتع زہر گوشہ یافتم ۔۔۔ زہر خرمنے خوشہ یافتم

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا ذکر ہر صنف شاعری کے ساتھ آئے گا، اس لیئے اس جگہ پر وہی باتیں عرض کی جاتی ہیں جو غزل سے تعلق رکھتی ہیں ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شیخ کے کلام میں عموماً دلفریبی تاثیر سوز و گداز شوخی نمکینی شیرینی بدرجہ کثیر پائی جاتی ہے، پس ان صفتوں سے حضرت کی غزل گوئی بھی خالی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اُن کی غزل سرائی میں ان کی آزاد مزاجی سیر چشمی قناعت اخلاق بلند حوصلگی وغیرہ کا اثر بھی بین طور پر پایا جاتا ہے کہ بعد حضرت ہی کا درجہ نظر آتا ہے کچھ غزلیں نمونہ کے طور پر نذر ناظرین ہوتی ہیں:۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے ۔۔۔ صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامے

گہ پیر مناجاتی ور رند خراباتی ۔۔۔ ہر یک قلمی رفتہ است بروئے بسر انجامے

فردا کہ خلائق را دیوان جزا باشد ۔۔۔ ہر کس عملی دارد ماگوش بہ انعامے

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم ۔۔۔ تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

سرد بلب جوئے گویند چہ خوش باشد — آنانکہ ندیدستند سروے بلب بامے
روزے درِ دل ریشِ من حسرت چو رواں در تن — آخر ز دعا گوئے یاد آر بہ دشنامے
باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پرسی — ورنہ کہ برد ہیہات از ما بتو پیغامے
گرچہ شب مشتاقاں تاریک بود اما — نومید نشاید بود از روشنی بامے

سعدی بلب دریا دردانہ کجا یابی
در کام نہنگاں رو گر میطلبی کامے

بلاشبہ یہ غزل غزلیت کی بہت خوبیاں رکھتی ہے مگر حافظ کی حیرت انگیز ترکیبوں کو نہیں پہنچتی ہے :-

خوبرویاں جفا پیشہ وفا نیز کنند — بہ کساں درد فرستند و دوا نیز کنند
بادشاہاں ملاحت چو بہ نخچیر روند — صید را پائے بہ بندید و رہا نیز کنند
نظرے کن بمن خستہ کہ ارباب کرم — بہ ضعیفاں نظر از بہر خدا نیز کنند
عاشقاں راز در خویش مراں تا بر تو — سر و زر بر فشانند و دعا نیز کنند
گر کند میل بخوباں دل من عیب مکن — کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند
بوسہ زاں درج تنگ بدہ یا بفروش — کیں متاعیست کہ بخشند و بہا نیز کنند
تو ختائی بچہ از تو خطا نیست عجب — کانکہ از اہل صواب اند خطا نیز کنند
گر بر آید بزباں نام منت باکے نیست — بادشاہاں بغلط یاد گدا نیز کنند

سعدیا گر نہ کند یاد تو آن ماہ مرنج
ما کہ باشیم کہ اندیشہ ما نیز کنند

یہ غزل، غزل کا پورا علم رکھتی ہے، گو مذاق کلام حافظ سے علیحدہ ہے، ظاہر ہے

کہ اس لطف کی غزلیں سعدی کے دیوان میں سب ہی نہیں ہیں مگر یہ ایک غزل ایسی ہے کہ سعدی کے اُستاد غزلگوئی مانے جانے کو کافی ہے۔ اس غزل میں غزل سابق کے اعتبار سے داخلی مضامین زیادہ ملحوظ رہے ہیں، اسی لئے اس میں حُسن مقبولیت بھی زیادہ ہے۔ اب میں اور شعرائے متغزلین کی غزلیں مندرج ذیل کرتا ہوں کہ باوجود مختلف المذاق ہونے کے لُطف غزلیت سے خالی نہیں ہیں :-

غزل جامیؔ

اے ترک شوخ ایں ہمہ ناز و عتاب چیست
یا دل شکستگان ستم بیحساب چیست

از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ میکدہ
اے پیر رہ بگوے طریق صواب چیست

خنجر کشیدہ از پئے قتلم شتافتی
خود کشتہ میشوم ترا اضطراب چیست

گفتی شبے بخواب تو آیم دلے چہ سود
چوں من بعمر خویش ندانم کہ خواب چیست

بے تو ز ضعف قوت جنبیدنم نماند
در حیرتم کہ در دلم ایں اضطراب چیست

جامیؔ چہ لاف میزنی از پاک دامنی
بر خرقۂ تو ایں ہمہ داغ شراب چیست

مُلا جامی بھی مذاق غزل گوئی رکھتے ہیں اور اُن کے دیوان میں بہت اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ لُطف غزلیت سے خالی نہیں ہیں مگر تمام دیوان کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ فقیر کی دانست میں جامیؔ کی غزل گوئی سے اُن کی مثنوی نگاری زیادہ خوبصورت ہے ؎

غزل فغانی

نخل قد است کز چمن جاں بر آمدہ
شاخ گلے بصورتِ انساں بر آمدہ

از فرق تا قدم ہمہ جانست آں نہال
گویا ز آب چشمہ حیوان بر آمدہ

اکنوں توئی جمیل جہاں گرچہ بیش ازیں
آوازہ جمال ز کنعان بر آمدہ

بر ہر زمیں کہ جلوہ کناں رفتہ بہ ناز
آہ از نہاد کبک خراماں بر آمدہ

در دیدہ چوں بہ شمع رخت کردہ ام نگاہ
از دل ہزار شعلہ پنہاں بر آمدہ

بہر نظارہ گل روئے تو در چمن
گل ہر طرف ز شاخ درختاں بر آمدہ

مستِ می شبانہ مہ من ز خواب ناز
با آفتاب دست و گہ بیاں بر آمدہ

در ہر چمن کہ گفتہ فغانی سرود غم
افغاں ز بلبلان خوش الحان بر آمدہ

یہ غزل ایک عمدہ نمونہ غزل سرائی کا ہے، لاریب بابا فغانی نے اس غزل میں پوری داد عاشقانہ رنگ کی غزل سرائی کی دی ہے سبحان اللہ کیا لکھا ہے

غزل خسرو

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا داری و درمانی ہنوز

آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہمچناں در سینہ پنہانی ہنوز

ملک دل کردی خراب از تیغ ناز
واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

خون کس یارب بگیرد دامنت
گرچہ در خون ما پشیمانی ہنوز

ماز گریہ چون نمک بگداختیم
تو ز خندہ شکرستانی ہنوز

جان ز بند کاکلت آزاد گشت
دل بہ گیسوئے تو زندانی ہنوز

پیری و شاہد پرستی ناخوش است
خسروا تا کے پریشانی ہنوز

خسرو سعدی کے جواب سمجھے جاتے ہیں، کوئی شک نہیں کہ خسرو میں سعدی کا انداز ہے مگر ان کی غزل سرائی سعدی تک نہیں پہنچتی ہے بہر حال کوئی شک نہیں کہ خسرو بہت اچھے غزل گو ہیں، گو ان کا تمام دیوان حافظ کی طرح لطف غزلیت سے بھرا ہوا نہیں ہے، لوگ خسرو کو ہندی کہتے ہیں مگر وہ ہندی مرزا بیدل اور قتیل کی طرح نہ تھے۔ ان کا شمار اہل زبان میں بخوبی کیا جا سکتا ہے کس واسطے کہ جس عہد میں وہ زندہ تھے اُس میں فارسی کے سوا ہندوستان میں مسلمان کوئی دوسری زبان نہیں بولتے تھے اور اہل زبان کی بڑی کثرت تھی ؁

غزل اہلی شیرازی

خوش آنکہ تو باز آئی و من پائے تو بوسم
در سجدہ چو شبنم خاک قدمہائے تو بوسم

ہر جا کہ تو روزے نفسے جائے گرفتی
آنجا روم و گریہ کناں جائے تو بوسم

ہر جا کہ غزالیست چو مجنوں بسر و چشمش
در آرزوئے نرگس شہلائے تو بوسم

من اہلی درویش و تو آں شاہ تبانی
دستیکہ ببوسم بہ تمنائے تو بوسم

یہ غزل نہایت عاشقانہ رنگ رکھتی ہے، گو حافظ کی حکمت آموزی کا حسن اس میں نہیں ہے تو بھی اس کے ایک عمدہ نمونہ غزل گوئی ہونے میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی، اگر کسی شاعر میں غزل سرائی کی اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے تو بہتر ہے کہ اور اصناف شاعری کو اختیار کرے۔

غزل مرزا علی قلی خان میلیؔ

کو بخت آنکہ یار شکایت ز من کند | چندانکہ مدعی نہ تواند سخن کند
گر دو ہزار بارہ گرفتار نا امید | گر شکوہ دلم ز تو پیمان شکن کند
گر بیم سرگرانی او نیست غیر را | منعم چرا ز ہمرہی خویشتن کند
آن ظالم کجاست کہ از پہلوئے رقیب | قتل مرا بہانہ بر خاستن کند
او میکند سوال و مرا در جواب او | از اضطراب دل نہ تواند سخن کند

میلیؔ ہزار حیف کہ آن مے پرست را
ذوق شراب ساقی ہر انجمن کند

یہ غزل نہایت شوخ رنگ رکھتی ہے اور غزل گوئی کی اچھی مثال ہے اگر اتنا بھی کسی شاعر نے شوخ طبیعت نہیں پائی ہے تو اُسے لازم ہے کہ غزل گوئی کو خیرباد کہے۔

غزل ابو طالب ہمدانی کلیمؔ

نہ ہمیں مے مدان تو گل خنداں از من | می کشد خار درین بادیہ داماں از من

با من آمیزش او الفت موج است و کنار — روز و شب با منُ و پیوستہ گریزان از من
قمری ریختہ بالم بہ پناہ کہ روم — تا یکے سرکشی اے سرو خرامان از من
بہ تکلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ — میتواں برد بہر شیوہ دل آسان از من
نیست پرہیز من از زہد کہ خاکم بر سر — ترسم آلودہ شود دامن عصیاں از من
گرچہ مورم ولے آں حوصلہ با خود دارم — کہ بہ بخشم بود ار ملک سلیمان از من

اشک بیہودہ مریز این ہمہ از دیدہ کلیم
گرد غم را نتواں شست بطوفان از من

یہ غزل بھی غزل سرائی کا ایک عمدہ نمونہ ہے کلام میں شوخی متانت طبیعت داری سب کچھ موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ کلام وہی ہے جس کی تاثیر دل پہ پیدا ہو۔ ورنہ مجرد مضمون خیزی لطف غزلیت نہیں پیدا کر سکتی ؛

غزل ہلالی

ایں است کہ خوں کردہ دل بردہ بسے را — بسم اللہ اگر تاب نگہ ہست کسے را
دیدیم ز یارانِ وفادار بسے را — لیکن چو سگانِ تو ندیدیم کسے را
قطع ہوس و ترک ہوا کن کہ دریں راہ — چنداں اثرے نیست ہما و ہوسے را
تا از لب شیریں نمکساں کام گرفتند — گیرند بہ ازاں خیل ملائک مگسے را
گر از نظر افتاد رقیبے عجبے نیست — در دیدۂ خودں نتواں داد خسے را

پیش سگش ایں آہ و فغاں چیست ہلالی
از خود مکن آزردہ چنیں ہم نفسے را

ہلالی میں بھی غزل گوئی کا لطف پایا جاتا ہے اگر غزل میں غزلیت نہ ہو۔ تو پھر اسے کوئی اور نثے کہیں گے۔ غزل نہیں کہیں گے، واضح ہو کہ ان تمام غزلہائے بالا میں مختلف المذاقی پائی جاتی ہے مگر کوئی غزل لطف غزلیت سے خالی نظر نہیں آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعرا واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کو تمامتر تبعیت فطرت کے ساتھ اپنی غزلوں میں حوالۂ قلم فرماتے گئے ہیں اور جس قدر ممکن تھا تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے کنارہ کش رہے ہیں ؛

شیخ محمد علی حزیں

دل در خم زلف او سودائے دگر دارد
یا سلسلہ دیوانہ غوغائے دگر دارد

صحرائے طلب دارد بر ہر قدمے طورے
ہر سنگ درین وادی موسائے دگر دارد

افلاک نگہبان عشق نو نمے باشد
این بادۂ زور آور مینائے دگر دارد

در مجلس ما یک کس ہشیار نمی گردد
در جام مگر ساقی صہبائے دگر دارد

گر عشق نہاں بازد با خود عجبے نبود
در پردۂ دل مجنوں لیلائے دگر دارد

پیداست حزیں ما را از دلق مے آلودش
کیں رند خراباتی تقوائے دگر دارد

حزیں میں بھی غزلگوئی کا اچھا لطف پایا جاتا ہے، مذاق غزل گوئی ان کا تصوف آمیز ہے، مزاج میں فقر کی طرف بھی میلان بہت تھا، ہر چند اہل زبان سے ہیں مگر اہل ایران ان سے بالکل ناواقف ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وطن سے نکل کر ہندوستان میں چلے آئے تھے، اور ہندوستان میں رہ گئے، مزار شیخ کا شہر بنارس میں ہے، فقیر جب

عنفوانِ شباب میں وہاں کے کالج کا ایک طالب العلم تھا تو اکثر شام کو فاطمان میں جہاں وہ آسودہ ہیں جایا کرتا تھا۔ زمانہ یاد آتا ہے اور عمر گذشتہ کی دل میں حسرت ہوتی ہے، عاجز نے شیخ کے دیوان کو اوّل اوّل اُسی زمانہ میں دیکھا تھا، اچھا فرماتے ہیں انداز کلام حافظ اور سعدی سے مرکب معلوم ہوتا ہے، مگر اِن حضرات کی سخن سنجی تک اُن کی طبیعت داری نہیں پہنچتی ہے، قبل اس کے کہ شعرائے فارس کی غزل گوئی کی بحث اختتام کو پہنچائی جائے، کچھ اُن شاعروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ہندی وطن ہوکر فارسی میں بھی نامبر آوردہ نظر آتے ہیں، ان میں سے مشہور یہی حضرات ہیں، مرزا عبدالقادر بیدل، واقف بٹیالوی، مظہر جان جاناں سراج الدین علی خان آرزو، قتیل اور غالب

واقف بٹیالوی بیدل جان جاناں آرزو، قتیل

واقف بٹیالوی نے حزین کو دیکھا تھا اور مذاق غزلگوئی اچھا رکھتے تھے، مرزا بیدل ہندوستان میں ایک مشہور فارسی گو شاعر ہیں، ہر ہندوستانی وطن جو فارسی سے آشنائی رکھتا ہے اُن کے کلام سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔ مرزا بیدل کا فارسی دیوان چھپ بھی گیا ہے، مگر اُن کی غزل سرائی فقیر کو نہیں پسند ہے۔ علاوہ اس کے کہ زبان میں تصرفات کر جاتے ہیں، غزلوں میں ایسے ایسے استعارات اور نازک خیالیوں سے کام لیتے ہیں کہ غزل سرائی کا لطف قائم نہیں رہتا۔ مظہر جان جاناں کا کلام اچھا ہے مگر اس درجہ کا نہیں ہے کہ اُن کا شمار ممتاز غزل گویوں میں کیا جائے، خان آرزو ایک محقق شخص ہیں، مگر شاعری کے لئے طبیعت پورے طور سے مناسب نہیں پائی تھی، قتیل میں

غزل سرائی کا مادہ ہے۔ مگر وہ اپنے اس مادے سے کام نہ لے سکے، غالب تو ان کے کچھ بھی معتقد نظر نہیں آتے ہیں بلکہ بڑی بے اعتنائی سے انھیں یاد کرتے ہیں جیسا کہ ان کا خود قول ہے۔ شعر

گرچہ بیدل ز اہل ایران نیست
لیک ہمچو قتیل ناداں نیست

خیر قتیل جو کچھ ہوں۔ خود غالب فارسی کے اچھے غزل سرا نظر نہیں آتے، شک نہیں کہ غالب کو فارسی کی معلومات بہت ہے اور شاعری کا مادہ بھی بہت رکھتے تھے۔ مگر ان کی فارسی کی غزل سرائی، غزل سرائی کا حکم نہیں رکھتی ہے۔

غالب

جس غزل کو دیکھئے ان سے ان کی مضمون آفرینی خلاقی سخن بلند پروازی نازک خیالی ندرت آوری وغیرہ عیاں ہے مگر ان کی تمام فارسی غزلوں ہیں صرف دس پانچ ہی شعر ہوں گے، جو غزلیت کا لطف رکھتے ہوں گے ورنہ دیوان کا دیوان حسن مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزل گوئی کی شان سے بہت بعید ہے، فقیر حضرت کا بہت معتقد ہے یعنی ان کو ایک بڑا شاعر گرامی جانتا ہے مگر افسوس ہے کہ ان کی فارسی کی غزل سرائی کو اپنے دل پر تاثیر پیدا کرتے نہیں پاتا، حضرت کی غزلوں کے اشعار بیشتر قصیدہ نما معلوم ہوتے ہیں اور کچھ ایسی خاص ترکیب رکھتے ہیں کہ ان سے وہ حظ دل کو نصیب نہیں ہوتا ہے جو غزل سرائی کا تقاضا ہے، کچھ غزلیں حضرت کی نذر ناظرین ہوتی ہیں۔

غزل

لعل تو خستہ اثر التماس کیست — بخت من از تو شکوہ گزار سپاس کیست
گیرم زداغ عشق تو طرفے بر بست دل — اینم نہ بس بود کہ جگر رو شناس کیست
لرزم بہ کوئے غیر ز بے تابی نسیم — کاندر امید واری بوے لباس کیست
با او لبساز وصلے دیا من بہ عزم قتل — آہ از امید غیر کہ ہمچشم یاس کیست
از بیکساں شہرم و از ناکسان دہر — گر گشتہ سر تو سلامت ہراس کیست
از پرنیاں بحریدہ راضی نہ می شود — خار رہِ تو چشم براہ پلاس کیست
لطفت بشکوہ از ہوس بیشمارہ من — شوقم بہ نالہ از ستم بے قیاس کیست
گیرم کہ رسم عشق من آوردہ ام بدہر — ظلم آفریدہ دل ناحق شناس کیست
صحن چمن نمونہ بزم فراغ تو — بادِ سحر علاقۂ ربط حواس کیست

غالب بُت گرانگہ ناز قحط نیست
تا بانش مضائقہ چندین بپاس کیست

غزل کی غزل پڑھ جائیے کسی شعر یا مصرع میں اتنی قوت نہیں ہے کہ تڑپا دے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص ترکیب میں ایسے نازک مضامین موزوں کئے گئے ہیں کہ ان کو دل آویزی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بے تاثیری کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار میں کوئی مضمون ایسا نہیں باندھا گیا ہے کہ جو انسان کے کسی بڑے معاملۂ قلبی سے خبر دیتا ہو اور کوئی معاملہ قلبی بیان بھی ہوا ہے تو تبعیت فطرت سے علیحدہ ہو کر اور ایسی ترکیب زبان کے ساتھ کہ جو بے ضرورت دشوار صورت

ہے ایسا کلام ضرب المثل کی تاثیر نہیں پیدا کر سکتا ہے اور نہ اس کے مضامین پڑھنے والے کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہ سکتے ہیں جتنے اشعار ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے کہ فوراً پڑھنے کے بعد یاد سے جاتے رہتے ہیں، اور کوئی تاثیر دل پر چھوڑ نہیں جاتے، فقیر کے دل کا تو یہی حال ہے بہت بار اس عاجز نے اس غزل کو دیکھا ہے اور بے تاثیری کے اعتبار سے یہ ہر بار نئی معلوم ہوتی ہے برخلاف اس کے مسبوق الذکر شعرائے متغزلین کی غزلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے کہ کم وبیش طور پر اُن کا اثر قلب پر رہ جاتا ہے اور اگر رہ نہ جائے تو آنی اثر تو ضرور ہوتا ہے۔ بخلاف اس غزل کے کہ اس میں پائدار یا غیر پائدار کسی طرح کا اثر پایا ہی نہیں جاتا، حضرت غالبؔ کی اکثر فارسی غزلوں کا یہی طور ہے، بلکہ سب غزلوں کا یہی طور ہے۔ اِلّا صرف دس پانچ اشعار کہ غزلیت کا پورا رنگ رکھتے ہیں، جس کے باعث اُن کی پُر تاثیری صرف گفتگو میں نہیں آسکتی ہیں دو غزلیں اور بھی ذیل میں عرض کرتا ہوں، ایک حافظؔ کی زمین ہے اور دوسری سعدیؔ کی ؛

غزل

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند — کہ در ستم روش آموز روزگار انند
بہ بند دل بہ اداے کہ کس گمان نہ برد — فغان زپردہ نشینان کہ پردہ دار انند
بجنگ تا چہ بود خوے دلبران کایں قوم — در آشتی نمک زخم دلِ فگار انند
نہ زاغ دکشت تمناسند نے حدیقہ باغ — زبہر بادہ ہوا خواہ بادو یار انند

ز وعدہ گشتہ پشیمان و بہر دفع ملال — امید وار بہ مرگ امید وار انند
ز روئے خویش و منش نور دیدہ آتش — بہ رنگ و بوئے جگر گوشہ بہار انند
تو سرمہ بین و ورق در نورد و دم درکش — مبین کہ سحر نگاہان سیاہ کار انند
ز دید و داد مزن حرف خرد سال انند — بہ گرد راہ منہ چشم نے سوار انند

ز چشم زخم بدیں حیلہ کئے ہی غالب
دگر مگو کہ چو من در جہان ہزار انند

یہ زمین خواجہ کی ہے، آپ فرماتے ہیں ؎

غلام نرگس مست تو تاجدار انند — خراب بادۂ لعل تو ہشیار انند

کہاں یہ مطلع اور کہاں یہ مطلع،

بتاں شہر چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

اسی طرح اور بھی کچھ قافیے غزل بالا میں ہیں، جنھیں حافظ نے بھی باندھا ہے اُن قافیوں کے اشعار دونوں غزلوں میں سے موازنہ کی نظر سے درج ذیل ہوتے ہیں:

غالب	حافظ
برند دل بہ ادائے کہ کس گمان نبرد	ترا چہ او مرا آب دیدہ شد غماز
نغان ز پردہ نشینان کہ پردہ دار انند	وگر نہ عاشق و معشوق راز دار انند

حافظ کی شعر کی خوبی آشکارا ہے، اوّل تو یہ شعر تبعیت فطرت سے خبر دیتا ہے دوم یہ کہ اس کا مضمون ایسی خوش ترکیبی سے حوالۂ قلم ہوا ہے کہ اس کا سمجھنا زحمت خیز نہیں ہے، تیسری بات یہ ہے کہ ملاحت نمکینی شوخی شیرینی

ایسی ہے کہ دل یہی چاہتا ہے کہ سو بار اس شعر کو پڑھتے رہئے؛ بخلاف اس کے غالب کا شعر ہے کہ اس میں یہ سب کوئی لطف نہیں ہیں؛ بلکہ دوسرے مصرع کو دو چار بار پڑھئے تو بالکل بے مزہ ہو جاتا ہے؛ بڑا حُسن اس شعر کا یہ ہے کہ پردہ نشینوں کو پردہ دار کر کے دکھایا ہے۔ اس میں کیا بڑی مضمون آفرینی ہے یا بڑی غزلیت ہے؛ ظاہرا کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے حکمت و فلسفہ سے تو اس شعر کو بحث نہیں ہے جیسا کہ اس غزل کے اور اشعار کو کوئی علاقہ نہیں ہے:

حافظ

نصیب ماست بہشت ای خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

غالب

بجنگ تا چہ بود خوے دلبران کین توز
در آشتی نمک زخم لفگان اندر

چونکہ گاران کا قافیہ دونوں شعر بالا میں بندھا ہے اس لئے راقم نے ان دونوں شعر کو مقابلہ میں لکھ دیا؛ خیر اب دونوں شعر کے لطف مضمون اور حُسن بیان پر غور فرمایئے؛ حافظ کا شعر جیسا کہ عموماً فطری رنگ رکھتا ہے زیور سادگی سے آراستہ دیکھا جاتا ہے کسی مسئلہ حکمت و فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے اور غزلیت میں ڈوبا رہتا ہے۔ ویسا یہ شعر بھی ہے بلکہ اس شعر میں خواجہ نے بہت سے مسائل دین و اخلاق کو بڑے آسان پیرایہ میں فرما دیا ہے؛ اس شعر کی کیفیت عرض کر کے غالب کے شعر کی طرف توجہ ہی فضول ہے؛ مسائل علمیہ سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے مضمون آفرینی کے اعتبار سے بھی چنداں مشکل پیاز نہیں رکھتا ہے:

حافظ

بیا بہ میکدۂ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند
تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ مے روم و ہمرہان سوارانند

غالب

تو سرمہ بین دو رق ورنورد وم در کش
مبین کہ سحر نگاہاں سیاہ کارانند
ز دیدہ دادمزن حرف خرد سالانند
بہ گرد راہ منہ چشم نے سوارانند

اب موازنہ ہی فضول ہے ناظرین موازنہ کی زحمت سے عاجز کو معاف فرمائیں اے حضرات نکتہ دان حافظ کی شہرت بے وجہ نہیں ہے اگر کوئی شاعر دماغ حکیمانہ نہ رکھتا ہو تو کبھی حافظ کی راہ میں قدم نہ رکھے مجرد زبان دانی یا معلومات سے حافظ کی سی شاعری نصیب نہیں ہو سکتی ؎

غزل غالب

دلستانان تحملند ارچہ جفا نیز کنند   از وفائے کہ نہ کردند حیا نیز کنند
چوں بہ بینند بہ ترسند و بہ یزداں گردند   رحم خود نیست کہ برحال گدا نیز کنند
خستہ تا جاں نہ دہد وعدۂ دیدار دہند   عشوہ خواہند کہ در کار قضا نیز کنند
خون ناکامی سی سالہ ہدر خواہد بود   مہر با ما اگر از بہر خدا نیز کنند
اندران روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت   کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند
از خزاں خزاں دیدہ سا شمم کا تیہا   تا ز برتازگی برگ و نوا نیز کنند
گر بود کوتہی از عمر تو دانی و اجل   گفت کار بہ ہنگام روا نیز کنند
ز غلوی رنجہ ز رنداں لصبوحی گاہ بن قوم   نفس باد سحر غالیہ سا نیز کنند

گفتہ باشی کہ زما خواہش دیدار خطاست ایں خطائے ست کہ در روز جزا نیز کنند

حلق غالب نگرد دشنۂ سعدی کہ سرود

خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

سعدی کی غزل کے ساتھ اس غزل کا موازنہ ہی فضول ہے، کیوں حضرت غالب نے اس زمین میں غزل لکھی' اس کی ضرورت معلوم نہ ہوئی، اس غزل میں صرف ایک شعر قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے ؎

اندران روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

اس شعر کے سوا جتنے اشعار ہیں زنہار اس قابل نہیں ہیں کہ سعدی کے اشعار کے ساتھ پڑھے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غزل سرائی بہت دشوار چیز ہے یہ بڑے حکیم کا کام ہے اور وہ بھی وہ حکیم جس نے غزل سرائی کی خلقی صلاحیت پائی ہے اگر مجرد حکمت مایۂ غزلگوئی کی متقاضی ہوتی تو ارسطو بوعلی سینا، ملا صدرا، یہ سب کے سب غزل گو ہوتے، غزل گوئی خاقانی، مولوی معنوی اور انوری کو تو نصیب ہی نہ ہوئی جو بڑے درجہ کے شعرا گذرے ہیں مگر حضرت غالب پر بہت تعجب گذرتا ہے کہ آپ اُردو کے نہایت اچھے غزل گو ہیں، اگر اُن کے دیوان سے وہ اشعار خارج کر دیئے جائیں جو کثرت استعارات کثرت اضافات و کثرت اغلاق سے بدنما نظر آتے ہیں تو اُن کے اُردو کے کلام منتخب کا جواب نہیں پایا جائے گا۔ بہت جائے حیرت ہے کہ اُن کی اُردو کی غزلیں سوز و گداز و خستگی و نشتریت و دل گرفتگی و پر تاثیری کے مزے سے قریب قریب میر کی غزلوں کی طرح بھری ہوئی ہیں، مگر فارسی کی غزلیں ان

صفات سے جو غزلگوئی کی شان سے ہیں، تمامتر معرا نظر آتی ہیں، فقیر کی دانست میں مرزا غالب فارسی کی غزلگوئی کے اعتبار سے فارسی کی قصیدہ گوئی میں زیادہ دخل رکھتے ہیں جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا ؛

حضرات حقیقت آگاہ سے مخفی نہیں ہے کہ غزل گوئی کے لئے تمامتر داخلی مضامین درکار ہوتے ہیں مگر جن شاعروں نے خواہ فارسی اور اُردو میں شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا ہے، اُن کی غزل سرائی کبھی پرتاثیر نہیں پائی جاتی ہے۔ غزل سرائی خارجی پہلو کی متقاضی نہیں ہے، خارجی مضامین کا باندھنے والا غزل گو گو کس قدر نازک خیال خلاق سخن زور آور اور بلند پرواز ہو، کبھی اپنے کلام سے دل پر حسب مراد اثر پیدا نہیں کرسکتا، چنانچہ فارسی میں مرزا صائب اور اُردو میں شیخ ناسخ باوجود بڑے پرگو شاعر ہونے کے کلام کے اُس حسن مقبولیت سے محروم ہیں جو حافظ اور میر کو نصیب ہوا ہے، مرزا صائب کس قدر کثیر الکلام ہیں اور علاوہ بڑی طباعی کے نفاست خیالات اور نزاکت مضامین میں بے نظیر ہیں، مگر اُن کی سیکڑوں غزلیں پڑھ ڈالیئے تو بھی اس کا اثر حافظ کی ایک غزل کے برابر بھی نہیں ہوتا ہے۔ اُس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ صائب غزل گوئی کے تقاضے کے خلاف رکار بند رہے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ صائب کی سخن سنجی نے فارسی کے لٹریچر کے میدان کو بہت وسیع کر دیا مگر اِس توسیع سے خود غزل سرائی کو کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ صنف شاعری جس درجہ کو حافظ کی طبیعت داری سے پہنچ چکی تھی اُسی درجہ تک قائم رہی ہے، سر مو بھی اس سے ارفع نہ ہوسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ صائب اور ناسخ نے ایک ایسی صنف شاعری کی ایجاد

کی ہے جو غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کے درمیان کی ہے، کاش یہ دونوں شاعر گرامی اور کسی صنف شاعری کو ترقی دیتے یا اور کسی صنف کے موجد ہوتے، تو شاعری کو ان کی سخن سنجی سے زیادہ نفع پہنچتا، خیر جاننا چاہیئے کہ مرزا صائب کی غزل سرائی کا رنگ مرغوب نہیں ہے۔ کس واسطے کہ ان کا رنگ غزل سرائی کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے، ذیل میں مرزا صائب کی غزلیں نذر ناظرین ہوتی ہیں:-

غزل

در سخن گفتن خطائے جاہلان پیدا شود
تیر کج چون از کمان بیرون رود رسوا شود

پردہ پندار سد راہ وحدت گشتہ است
چون حباب از خود کند قالب تہی دریا شود

در مقام حیرت دیدار حرف و صوت نیست
طوطی از آئینہ حیران کم چون گویا شود

دست و پائے باغبان از دل برون آید نیست
سعی کن تا پیچ کلید این در پیدا شود

مہر خاموشی چہ سازد با لب پرشور من
حلقۂ گرداب چوں مہر لب دریا شود

گوہرے دارم کہ گر از جیب بیرون آورم
از فروغش پایۂ میزان بد بیضا شود

دست رد بر سینۂ دریا گزار چون صدف
ہر کہ صائب آشنائے عالم بالا شود

دیگر

عشق یکسان جنس درویش و توانگر می کشند
این ترازو سنگ و گوہر را برابر می کشند

آفتاب روز محشر بیشتر می سوزدش / ہر کہ اینجا دردہ داغ عشق کمتر می کشد
تا بکام دل کند جولان سمند شوخ ما / انتظار گرمیِ صحرائے محشر می کشد
آتشین روئے کہ من پروانۂ او گشتہ ام / ہر شرارش روغن از چشم سمندر می کشد
بیمی از مردن ندارد شعلۂ بیباک ما / شمع ما گردن بامید صبا بر می کشد
نیست ہر ناشستہ روئے قابل جولان اشک / این رقم را عشق بر رخسار چون زر می کشد

سر ز جیب صبح بر می آورد چون آفتاب
ہر کہ صائب در دل خود یکدہ ساغر می کشد

ظاہر ہے کہ مرزا صائب غزل سرائی میں تمامتر شاعری کا خارجی پہلو برتتے ہیں ذیل میں اُن کی ایک اور غزل بھی عرض کی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ اُسی زمین کی حافظ کی بھی ایک غزل پیش کی جاتی ہے، دونوں غزلوں کے معاینہ سے ظاہر ہوگا کہ جس قدر صائب غزل میں خارجی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں، اُسی قدر حافظ داخلی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، اس موازنہ سے یہ بات بھی عیاں ہوگی کہ غزل سرائی میں داخلی پہلو کیا لطف سخن پیدا کرتا ہے اور اس لئے اس صنف شاعری میں اس پہلو کی کس قدر ضرورت ہے ۔

غزل صائب

اے غنچہ لب کہ سر بہ گریبان کشیدۂ / در پردہ و پردۂ عالم دریدۂ
برق سبک عنانی و کوہ گران رکاب / در ہیچ جا نئی و بہمہ جا رسیدۂ
تمکین نطق و معنیٔ شوخیست در تو جمع / در جلوۂ و پائے بدامن کشیدۂ

بر پیرہن غریب تمہ از یوسفی بہ حسن — در مصر ساکنی و بکنعان رسیدۂ

چشم بداز تو دور کہ چوں طفل اشک من — ہر کوچہ کہ ہست بہ عالم دویدۂ

در پلۂ غرور تو دل گرچہ بے بہاست — ارزاں بدہ ز دست کہ ارزاں خریدۂ

غیر از نگاہ عجز کہ از دور میکند

اے سنگدل ز صائب مسکین چہ دیدۂ

غزل حافظ

از من جدا مشو کہ توام نور دیدۂ — آرام جان و مونس قلب رمیدۂ

از دامن تو دست ندارند عاشقاں — پیراہن صبوری ایشاں دریدۂ

از چشم زخم دہر مبادت گزند ز انکہ — در دلبری بہ غایت خوبی رسیدۂ

منعم کنی ز عشق وے اے مفتی زمان — معذور دارمت کہ تو او را ندیدۂ

پایم نمیرسد بزمین دیگر از نشاط — تا سوئے من بہ چشم عنایت تو دیدۂ

داری خیال پرسش عشاق بعنوا — گویا کہ بوئے صدق ز ایشاں شنیدۂ

این سرزنش کہ کرد ترا دوست حافظا

بیش از گلیم خویش مگر پا کشیدۂ

فارسی اور اُردو کا مختصر بیان

واضح ہو کہ موضوع اس کتاب کا کسی زبان کی تحقیق نہیں ہے مگر چونکہ ہمارے ملکی بہت اشخاص ایسے ہیں کہ فارسی اور اُردو کے تاریخی حالات سے مطلع نہیں ہیں اس لئے ان دونوں زبانوں کا مختصر بیان خالی از نفع نہ ہوگا

حقیقت حال یہ ہے کہ جو اس وقت مروج فارسی ہے یہ زبان کیانیوں کی نہیں تھی اُن کے زمانہ میں جو زبان بولی جاتی تھی اُسی سے انقلابات کثیر کے بعد حال کی فارسی پیدا ہو گئی ہے۔ اس موجودہ زبان کو بھی قائم ہوئے پندرہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ جو زبان کیانیوں میں اُن کے ابتدائی وقت میں جاری تھی۔ وہ یا قوم آریہ کی زبان تھی یا قوم آریہ کی زبان سے بہت مشابہت رکھتی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ قوم آریہ نسل ایرج سے تھی۔ اور لفظ ایران بھی ایرج ہی سے مشتق معلوم ہوتا ہے اور یہ امر غلط نہیں ہے اس واسطے کہ کیانیوں کے خاندان کی اصل ایرج سے ثابت ہوتی ہے پس کوئی تعجب نہیں کہ جس ملک میں نسل ایرج نے قرار لیا وہ ایران کہلایا، زردشت کے وقت کی زبان ابتدائی کیانیوں کی زبان سے علیحدہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ انقلابات قبول کر کے وہ زبان پیدا ہو گئی جو زبان رودکی اور فردوسی کی ہم لوگ پاتے ہیں اور جسے زبان فارسی کہتے ہیں، قوم آریہ جس نے چار ہزار برس پہلے ہندوستان کو فتح کر کے اس ملک میں توطن اختیار کیا تھا وہ آریہ زبان بولتی تھی، آریہ زبان کیا تھی؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سنسکرت زبان تھی، مگر جب ہندوستان میں قوم آریہ نے وطن اختیار کیا اور اس ملک کے سکنا مغلوب سے آمیزش پیدا کی تو اُن کی شستگی زبان میں خلل لاحق ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس آمیزش سے ایک زبان غیر سنسکرت جسے پراکرت کہتے ہیں پیدا ہو گئی جب قوم آریہ نے دیکھا کہ سنسکرت کی شستگی اور صفائی میں بہت خلل واقع ہوتا ہے تو قواعد صرف و نحو کے قائم کر کے اور الفاظ غیر سنسکرت کو دور

کر کے اپنی زبان کی پوری اصلاح کر ڈالی اور یہ زبان خاص برہمنوں کی قرار پائی، لیکن جو زبان پراکرت جاری ہو چکی تھی اس تصحیح و تحقیق سے اُس کا اندراس نہ ہو سکا، اسی پراکرت زبان کی ایک قسم بھاشا ہے اور بھی مختلف دیسوں میں اسی طرح کی ممزوج زبانیں جاری ہیں جب برہمنوں کے مذہب کو بودھ نے مغلوب کر ڈالا تو وہی پراکرت سنسکرت کے قائم مقام سمجھی جانے لگی اور سنسکرت سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا، پندرہ سو برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ شنکر اچاریہ نے مذہب بودھ کو شکست دی اور مذہب براہمہ کی تجدید کی تو اس نے سرنو سے سنسکرت کو رواج دیا، مگر زبان پراکرت رواج پا چکی تھی۔ عوام الناس میں یہی زبان جاری تھی، لیکن جب اسلام نے ظہور فرمایا اور اہل عرب شروع شروع سندھ میں پہنچے تو سندھیوں کی زبان جو پراکرت کی ایک قسم تھی۔ عربی لفظوں سے مزاج بگڑنے لگی پھر مختلف اقوام کے شاہان اسلام ہندوستان پر حملہ آور ہوتے گئے، حتیٰ کہ اسلامی سلطنت ہندوستان میں قائم ہو گئی اس وقت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول زیادہ ہونے لگا، زبان بھاشا جو ہندوؤں میں جاری تھی، اس میں فارسی عربی کے اکثر الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے، خاص کر لشکروں میں ایک خاص زبان بولی جانے لگی۔ اس مرکب زبان کا نام اُردو ہو گیا، اُردو لشکر کو کہتے ہیں، پس وجہ تسمیہ اس کی یہی ہوئی کہ یہ زبان لشکریوں سے شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اس زبان نے تشکل امتیاز پکڑی تھی کہ عہد اکبر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان ایسے انداز کی ہو گئی تھی کہ اس وقت کے اُردو داں بھی اُس عہد کی زبان بخوبی سمجھ سکتے ہیں، اکبر کی رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہے، جس سے معلوم

ہو گا کہ اُردو عہدِ اکبر میں کتنی حیثیت کو پہنچ چکی تھی بلکہ اس رباعی کی نششت الفاظ ترکیب نحوی ایسی معقول ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کسی طرح کی کھٹکی محسوس ہوتی ہے ؎

پوچھے جو گھڑی مجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

جب اکبر کے وقت میں اُردو اتنی صورت پکڑ چکی تھی تو اس زبان کی پوری درستگی میں کوئی بہت تردد کا امر باقی نہیں رہا تھا۔ یوں تو کہتے ہیں کہ امیر خسرو کے وقت سے اس زبان میں لطور تفنن شعرا شعر کہا کرتے تھے، مگر اکبر کے عہد کی زبان تو بخوبی ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں اصناف شاعری کا برتنا دشوار نہ تھا لیکن چونکہ یہ زبان فارسی کے مقابل میں پایۂ وقار نہیں رکھتی تھی اس زبان میں لوگ جو کچھ موزوں کرتے تھے اُسے کسی قسم کا اعتبار حاصل نہ تھا، مگر رفتہ رفتہ جو اس زبان میں شاعری کو رواج زیادہ ہوتا چلا۔ تو اس زبان کو پایۂ اعتبار حاصل ہو گیا، پہلا شاعر جس نے اس زبان کو ممتاز کر دیا ولی دکنی تھا، پھر میر و مرزا کے وقت میں یہ زبان پورے طور پر قابل توجہ ہو گئی۔ پھر لکھنؤ میں اس کو عروج ہوا۔ ناسخ نے اسے خراش تراش کر کے ایک خوبصورت زبان کر ڈالی، آخر کو میر انیس نے اسے ایسا بنا دیا کہ اس وقت بلا شبہہ قریب قریب جواب فارسی ہو رہی ہے المختصر پہلے قوم آریہ نے اپنی زبان قومی کو رواج دیا۔ بعد ازاں اس سے بھاشا پیدا ہوئی پھر اس بھاشا میں فارسی عربی کے لفظوں کی آمیزش ہوتی گئی، پھر بہت سے انقلابات کے بعد وہ زبان پیدا ہو گئی جسے اُردو کہتے ہیں، اب اس زبان میں مختلف زبانوں

کے لفظ داخل ہو گئے حتیٰ کہ انگریزی الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں مگر ابھی تک اس زبان کو بہت الفاظ کی ضرورت ہے، اگر عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت کے الفاظ کثرت کے ساتھ داخل کئے جائیں تو اس زبان کی کیفیت انگریزی زبان کی ہو جائے گی۔ اور جیسی انگریزی زبان وسیع ہے اُسی طرح اس کو بھی ہر طرح کے خیالات علمیہ کے اظہار کی وسعت حاصل ہو جائے گی، فقیر نے کیمسٹری وغیرہ کی کتابوں میں الفاظ انگریزی کو قائم رکھا ہے اور کوئی لفظ اپنی طرف سے ایجاد نہیں کیا ہے ایجاد کرنے کا فائدہ کوئی نہیں ہے کس واسطے کہ الفاظ ایجاد شدہ اصلی الفاظ سے کم وحشت خیز نہیں ہوتے ہیں۔ جن صاحبوں نے الفاظ ایجاد کئے ہیں وہ وحشت خیز ہونے کے علاوہ مضحک انگیز بھی ہیں مثلاً پیریلل لائنس یعنی خطوط متوازیہ کا ترجمہ بیچ برابر نان بار وغن چراغ گرچہ گندہ پر ایجاد بندہ کا مزا دیتا ہے فقیر کی دانست میں اُردو ابھی تک لفظوں کی محتاج ہے، علمی خیالات اس زبان میں سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ کی مدد کے بغیر ادا نہیں کئے جا سکتے ہیں پس لازم ہے کہ اس زبان کو ایشیائی اور یورپین زبانوں کے لفظوں سے اعانت دی جائے، مگر راقم کے اس خیال کے ساتھ شاید کمتر اہل زبان اتفاق فرمائیں گے، چنانچہ ایک صاحب نے جو اہل زبان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، فقیر کے لفظ مغربل کے استعمال کرنے پر اعتراض فرمایا تھا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ راقم نے اپنی کتاب موسوم بہ "کیمیائے زراعت" میں لفظ مغربل کو استعمال کیا ہے معترض نے یہ فرمایا کہ لفظ غیر مانوس ہے اس کو اُردو میں نہیں استعمال کرنا چاہیئے، اس اعتراض کی وجہ فقیر کی سمجھ میں نہ آئی یہ لفظ ارباب علم میں غیر مانوس

کیونکر ہے اس کی توجہ معترض صاحب نے کچھ نہ فرمائی، شاید معترض صاحب کے گوشِ مبارک تک یہ لفظ پہنچا ہی نہ تھا، ورنہ فقیر تو ہمیشہ نسخوں میں لکھتا چلا آیا اور اُستادوں کو اسی طرح لکھتے ہوئے دیکھا گیا، فرقہ اطبا میں یہ لفظ متعارف حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ استعمال میں لایا جاتا ہے، علمی تصنیفوں میں اس کا استعمال کیونکہ معرضِ اعتراض ہو سکتا ہے، راقم نے اس لفظ کو کسی غزل، خمسہ، مثنوی و اسوخت وغیرہ میں استعمال نہیں کیا تھا، جس کتاب میں استعمال کیا ہے وہ کتاب علم کیمسٹری سے بحث رکھتی ہے، علم کیمسٹری علم طب کا ایک جزو ہے۔ پس وہ لفظ جو طبی حیثیت استعمال رکھتا ہے، اگر علم کیمسٹری کی کتاب میں استعمال کیا جائے تو معترض کو زبان کھولنے کا موقع کیا ہے، المختصر ہوا خواہانِ اُردو کا فرض منصبی ہے کہ اس زبان کے وسیع کرنے میں ہر طرح کے اُمور کو ملحوظ رکھیں اور حسب ضرورت مختلف زبانوں سے الفاظ کے اخذ کرنے میں مضایقہ نہ فرمائیں، مگر اس سے مراد راقم یہ نہیں ہے کہ بلا ضرورت بھی کسی زبان سے الفاظ لیے جائیں جیسا کہ اس زمانہ میں بد لحاظ اشخاص انگریزی لفظوں کو اُردو میں نہایت بے فرہنگی اور بد ترکیبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، اور درحقیقت کوئی ایسی زبان بولتے ہیں کہ نہ وہ انگریزی ہے اور نہ اُردو، اس کی مثال یہ تقریر ہے:۔ جب ہم شام کو واک کر کے اُٹھے تو بہت ٹائرڈ معلوم ہوئے فوراً ایک چیئر پر بیٹھ گئے، اس کے بعد طبیعت کو اسموک کرنے کی خواہش ہوئی، مینجر نے بھی سیگار کو کنڈل سے لایٹ کر لیا، اس نے مائینڈ پر سوودنگ افیکٹ پیدا کیا، ظاہر ہے کہ ان انگریزی لفظوں کے استعمال کی کوئی حاجت نہیں ہے اُردو زبان

بحالت موجودہ ایسی احتیاج نہیں ہو رہی ہے کہ بالضرورت اس میں اس قسم کے الفاظ بڑھائے
جائیں مگر فی زمانہ بدلحاظی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اشخاص خام فصیح و خام زبان ایسی نہج سے باہم ہیں گفتگو
کرتے ہیں الغرض اردو اس وقت بھی محتاج وسعت معلوم ہوتی ہے اس کی طرف حضرات اہل زبان کی توجہ درکار
ہے ہرچند زمانہ خود مائل توسیع ہے مگر ظاہرا زمانہ کی اعانت بھی خواہان زبان کی جانب
سے کمتر دیکھی جاتی ہے جو حضرات اس عہد کے نقادان سخن ہیں اُن کو مجرد متروکات
وغیرہ کی فکر رہا کرتی ہے اس اصلاح سے زبان وسیع ہونے کے عوض اور بھی تنگ
ہو چلی ہے۔ فقیر کی دانست میں لفظ مرت اُسی قدر فصیح ہے جتنا کہ لفظ نہ ہے اسی
طرح تک اور تلک فصاحت میں برابر ہیں اس طرح کی اصلاح سے درحقیقت
زبان کو کوئی فائدہ نہیں ہے ایسی اصلاحیں زیب بازار آمد نہیں ہو سکتیں بہت خوب
ہوتا کہ مرت اور نہ، تک اور تلک واعظ اور اسے واعظ وغیرہ وغیرہ یہ سب کے
سب محاورے مانے جاتے۔ اہل انصاف غور فرمائیں کہ ان سب متروکات کو ملحوظ
رکھنا غزل سرائی میں تو کس قدر آسان معلوم ہوتا ہے مگر التزام متروکات کے ساتھ
داستان یا مہابھارت کی سی ضخیم کتاب کو تصنیف کرنا خالی از دقت متصور نہیں ہے
ظاہرا متروکات پر حضرات اہل زبان کو اس توجہ بلیغ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے
کہ اردو کی شاعری زیادہ تر غزل سرائی وغیرہ میں محدود ہو رہی ہے اور چونکہ
غزل سرائی میں کوئی جدت کا پہلو باقی نہیں رہا ہے اس واسطے لفظی برتوں کی طرف
ناچار مائل ہونا پڑا ہے ؛

اُردو کی نظم و نثر کی مختصر تاریخ

کب نظم و نثر نے اُردو میں رواج پکڑا۔ اِس کی نسبت کوئی محققانہ قول دکھائی نہیں دیتا، کہتے ہیں کہ اِس زبان میں انشا پردازی کی ابتدا عہد تیمور میں ہوئی۔ اِس بادشاہ کے ہندوستان پر تسلط کا زمانہ ۱۳۹۸ء ہے بعض مصنفین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اُردو کی نظم و نثر اِس کے بہت پہلے رواج پا چکی تھی۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں مسعود بن سعد نے ایک دیوان بزبان اُردو ترتیب دیا تھا، علاوہ اِس کے سعدی اور خسرو نے بھی سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں اِس زبان میں طبع آزمائیاں کی تھیں۔ بظاہر یہ سب اقوال پایۂ تحقیق سے بہت بعید نظر آتے ہیں بہرحال ذیل میں وہ امور حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں جن کی صحت کتابی وسائل سے درجۂ یقین رکھتی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ اُردو کی انشا پردازی کا مبدا ملک دکن، گولکنڈہ اور بیجاپور میں اِس زبان نے ایک ممتاز صورت پیدا کی، اِن دونوں مقاموں کے بادشاہوں کو اِس زبان کی ترقی ملحوظ رہی، گولکنڈہ میں شجاع الدین نوری نے غزلیں لکھیں۔ ابن نشاطی نے دو مثنویاں معروف بہ طوطی نامہ و پھول بن تصنیف کیں۔ تحسین الدین نے بھی ایک مثنوی لکھی، اِس مثنوی میں کامروپ اور کیلا کی کہانی منظوم ہے۔ کامروپ اودھ کا راجہ تھا اور کیلا سراندیپ کے راجہ کی بیٹی تھی۔ یہ ایک دلچسپ عشقیہ مثنوی ہے اور بڑے شاعرانہ مذاق سے خبر دیتی ہے اِسی طرح بیجاپور میں نصرتی نے جو ایک برہمن تھا دو مثنویاں معروف بہ گلستان عشق

دعلی نامہ تصنیف کیں، یہ سب شعرا اورنگ زیب سے بہت پہلے گزرے ہیں، ان کے بعد ولی اور سراج نے اپنے حسن طبیعت سے اُردو کو زینت بخشی۔ ان دونوں شاعروں کے نشو ونما کا زمانہ ۱۶۸۰ء سے لے کر ۱۷۲۰ء تک معلوم ہوتا ہے مگر جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اُردو نے اپنے مولد سے جلاوطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دارالخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہنچا یہ سن محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا۔ شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی اور دو دیوان لکھے، شاہ حاتم کے ہمعصر ناجی مضمون اور آبرو تھے، ان لوگوں نے بھی خوب خوب غزل سرائیاں کیں، شاہ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی، دلی میں اُردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گزرے ہیں، ان کے نامی شاگردوں میں مرزا رفیع سودا ہیں اور ایسے شاگرد ہیں کہ بڑے بڑے استادوں کو اُن کی شاگردی پر ناز کرنا درست دیکھا ہے، پھر دلی کے نامی اُستادوں میں خان آرزو بھی تھے، ان کا سن پیدائش ۱۶۸۹ء اور سن ممات ۱۷۵۶ء ہے۔ میر تقی میر اُن کے شاگردوں میں تھے، گو غزل سرائی میں اپنا تمام ہندوستان میں جواب نہیں رکھتے تھے، حملہ نادر کے بعد خاں آرزو لکھنو کو چلے گئے اور اسی شہر میں ودیعت حیات فرمائی، اسی طرح دلی کے پرانے شاعروں میں انعام اللہ خان یقین تھے اُنھوں نے ۱۷۵۴ء میں بعہد احمد شاہ پچیس برس کے سن میں انتقال کیا۔

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

ان اساتذہ کے ہمعصر خواجہ میر درد بھی تھے اور ایسے صاحب کمال تھے کہ آج

تک اُن کا نام نامی السنہ خلائق پر جاری ہے اور تا مرور دہور جاری رہے گا ؛

واضح ہو کہ دہلی کی بربادی کے بعد اُردو کے اکثر شعرائے نامی نے لکھنؤ میں آکر پناہ پکڑی، خان آرزو حملہ نادر کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنؤ کو چلے آئے اسی طرح مرزا رفیع سودا - میر تقی میر - میر حسن - میر سوز - قلندر بخش جرأت بھی ترک وطن کر کے وارد لکھنؤ ہوتے گئے اور علاقہ اودھ ہی میں رحلت فرماتے گئے میر حسن کی وفات ۱۷۸۶ء میں سوز کی ۱۸۰۰ء میں اور جرأت کی ۱۸۱۰ء میں واقع ہوئی۔ میر حسن ایک اچھے غزل سرا تھے مگر اُن کی شاعری کی شہرت کی وجہ اُن کی مثنوی معروف بہ سحر البیان ہے یہ وہ مثنوی ہے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی ہے اس کی خوبیوں کی بحث آئندہ آنے کو ہے - میر محمد سوز بڑے طباع تھے اور ریختی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے - جرأت کی طبیعت داری بھی مشہور دیار و امصار ہے اور فی الواقع اُن کی شاعری قابل لحاظ ہے ان کاملین کے ترک وطن کر دینے سے البتہ دلی خالی ہو گئی مگر اس سرزمین میں پھر نامی شعرا پیدا ہوتے گئے ذوق نے سر نو سے شاعری کو چمکا دیا۔ مومن خان نے ملک سخن میں خوب ہی اپنا سکہ جمایا، غالب نے میر تقی میر کے زمانے کو زندہ کر ڈالا مصحفی نے بھی لکھنؤ سے آکر دلی میں خوب خوب شاعری کے لطف دکھائے ' اور دلی ہی کے ہو کر رہ گئے آخر شاعر دلی کے غالب ہیں انہیں کے ساتھ دلی کی شاعری رخصت ہو گئی، اُن کی وفات کا سن ۱۸۶۹ء ہے جاننا چاہیئے کہ جس وقت اُستادان دہلی لکھنؤ نہیں پہنچے تھے اس شہر میں اردو کی شاعری کو کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ تھا مگر ان حضرات کے آنے سے لکھنؤ میں ہر سمت دھوم

بچ گئیں۔ طبیعت داروں نے سخن سنجی کے مشغلے اختیار کئے، شاعری کی نئی روشیں ایجاد ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ دلی کی شاعری سے ایک علیحدہ رنگ کی شاعری ظہور میں آئی۔ یعنی اُستاد ناسخ نے غزل سرائی کا ایک خاص رنگ پیدا کیا اور آتش بھی صنف شاعری کو دلی والوں سے الگ ہو کر برتنے لگے پھر ان دونوں اُستادوں کے شاگردوں نے غزل سرائی کی مختلف راہیں نکالیں اور اپنے اپنے کمالات کی بدولت مشہور دیار و امصار ہوتے گئے، ان دونوں اُستادوں کے مشہور شاگردوں میں خواجہ وزیر گویا مقبول برق سحر رند اور صبا ہیں ہر ایک ان میں اُستاد کا درجہ رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے شاگردان نامی ان دونوں شاعران گرامی کو نصیب ہوئے، کمتر کسی اُردو کے شاعر کو نصیب ہوئے ہیں۔

اہل انصاف سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر چند لکھنؤ میں اُردو کی غزل سرائی نے بہت کچھ فروغ پکڑا۔ مگر دلی والوں کی غزلیت کا لُطف غزل سرایاں لکھنؤ اپنی غزلوں میں پیدا نہ کر سکے، سچ یہ ہے کہ غزل سرائی دلی والے کر گئے، لیکن مسدس نگاری حضرات اہل لکھنؤ نے ایسی کی کہ دلی والے کیا اہل شیراز اور اہل اصفہان کو بھی خواب میں نصیب نہ ہوئی، اگر مشعل لے کر بھی کوئی شخص تمام دنیا میں میر انیس اور مرزا دبیر کی مسدس نگاری کا جواب ڈھونڈیگا تو بالیقین کہیں نہیں پائے گا۔ میر انیس نے اردو کی شاعری کو اپنی مسدس نگاری سے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی ہوا بھی فارسی اور عربی کی شاعری کو نہیں لگی ہے آیندہ میر انیس کی مرثیہ نگاری کی بحث آنے کو ہے جس سے معلوم ہو گا کہ رزمی شاعری میں میر انیس ہومر۔ ورجل۔ ملٹن اور فردوسی پر غالب ہیں اور اگر ان کا جواب کوئی شاعر ہے تو

بالملکی ہے یا بیاتی ہے المختصر کوئی شک نہیں کہ اُردو کی رزمی شاعری درجہ کمال کو لکھنؤ میں پہنچی اور الحق یہ امر حضرات اہل لکھنؤ کے لئے ایک بڑا سرمایہ ناز ہے اسی طرح مرزا دبیر نے شاعری کا رتبہ ایسا کر دیا کہ اور زبانوں کی شاعری اُسے دیدۂ حیرت سے نگراں ہے، ارباب حقیقت سے پوشیدہ ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے کہ خود کمال شاعری ہو رہی ہے، اگر شعرائے لکھنو رزمی شاعری میں ایسا کمال پیدا نہیں کرتے تو مجرد غزل سرائی اور مثنوی نگاری کی بنیاد پر اُن کو شعرائے دہلی پر کسی طرح کی ترجیح حاصل نہ ہوتی۔ اس صنف شاعری کے فروغ دینے والے میر مونس صاحب بھی تھے، پھر میر وحید صاحب نے میر انیس صاحب کے زمانہ کو زندہ کرنا شروع کیا تھا کہ اجل نے مہلت نہ دی حیف صد حیف، افسوس صد افسوس۔

گلے برفت کہ نا ید بعد بہار دگر

آخر میں میر نفیس صاحب نے مرثیہ نگاری کو رونق بخشی، واحسرتا و دردا کہ اب وہ بھی نہیں ہیں، خاندان مرزا دبیر صاحب میں صرف اُن کے بیٹے مرزا اوج صاحب نام آور نکلے، خدائے تعالیٰ انھیں فردوسی سعدی اور میر تقی کی حیات فرمائے، فن شاعری کے لئے درازی عمر کی بڑی حاجت ہے، شاعری تب ہی جوان ہوتی ہے جب شاعر عالم پیری کو پہنچتا ہے، ہاں تو کوئی شک نہیں کہ اس وقت بھی مرزا اوج ایک بڑے نامی گرامی شاعر ہیں اور اُن کی طباعی مشہور دیار و امصار ہے لیکن اُن سے بہت کچھ اُمیدیں کی جاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ اُمیدیں ایسی ہیں کہ شاعر کے معمر ہوئے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں، یہ امر قابل

ذکر ہے کہ مرزا اوج کی مرثیہ نگاری بہت کچھ جدت سے خبر دیتی ہے ان کی شاعری نقالی نہیں ہے، ہرگز ایسی نہیں ہے کہ سو پچاس عمدہ مراثی سے مرزا صاحب اقتباس مضامین کرکے ایک خاص مرثیہ بنا لیتے ہوں اس پر خوبی یہ ہے کہ روایات صحیحہ کو منظوم فرماتے ہیں اور خود ایجاد اقوال سے امام و خاندان امام علیہ السلام پر اتہام نہیں لگاتے ہیں ۔

واضح ہو کہ جب دہلی اور لکھنؤ میں اُردو کی شاعری نے ممتاز شکل پیدا کی تو اور شہروں میں بھی حضرات طباع نے سخن سنجی کا مشغلہ اختیار فرمایا، چنانچہ میر ولی محمد نظیر اکبر آبادی نے علاوہ مسدسوں کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں لکھیں یہ شاعر مشہور و بار و امصار ہے اس کے نیچرل بیانات بہت قابل توجہ ہیں اس طباع کے کلام ایسے ہیں کہ نیچرل شاعری کی بخوبی داد دیتے ہیں اس شاعر گرامی نے ۱۲۳۰ھ میں رحلت فرمائی، اسی طرح راسخ نے اپنی مثنویوں اور غزلوں سے پٹنہ کے نام کو روشن کیا اور مولوی وحید الہ آبادی نے اپنے وطن کی عزت افزائی کی حقیقت یہ ہے کہ دونوں شاعر بڑے غزل سرا گزرے ہیں راسخ تو پٹنہ کے میر تھے اور وحید امیر المتغزلین ۔

اب حضرات ناظرین اُردو کی نثر نگاری کے تاریخی حالات پر نظر فرمائیں ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس انیسویں صدی کی ابتدا میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ صاحب نے اردو کی نثر کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی، چنانچہ اُردو کی درسی کتابیں اُن کے وقت میں تصنیف ہوئی گئیں۔ انھوں نے بڑے بڑے نثاران وقت کو جمع فرمایا۔ اُن کے عہد علم پروری میں حضرات مندرجہ ذیل کلکتہ میں مجتمع تھے

نمبر(۱) سید محمد بخش حیدری۔ ان کے تصانیف سے طوطا کہانی، آرائش محفل، دہ مجلس، گلزار دانش اور تاریخ نادری ہیں۔ ان کی وفات کا سن ۱۸۲۳ء ہے ؛

نمبر(۲) میر بہادر علی حسینی۔ ان کے تصانیف سے بے نظیر اور اخلاق ہندی ہیں۔ حسینی نے ۱۸۰۶ء میں وفات پائی ؛

نمبر(۳) میر امن لطف۔ ۱۸۰۲ء انھوں نے باغ و بہار تصنیف فرمائی۔ اسی سن میں انھوں نے نسخہ گنج خوبی کو بھی شائع کیا ؛

نمبر(۴) حافظ الدین احمد: انھوں نے ۱۸۰۳ء میں خرد افروز لکھی۔

نمبر(۵) شیر علی افسوس: ان کے تصانیف سے دو کتابیں ہیں ایک آرائش محفل اور دوسری باغ اردو۔ سن وفات ۱۸۰۹ء ہے ؛

نمبر(۶) نہال چند لاہوری: کتاب مذہب عشق جو گل بکاؤلی کا ترجمہ ہے، اُن کے تصانیف سے ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۴ء میں اتمام کو پہنچا ؛

نمبر(۷) کاظم علی جوان، سکنتلا کے مترجم ہیں علاوہ اس کے ایک کتاب معروف بہ بارہ ماسہ بھی لکھی، ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے ؛

نمبر(۸) للولال قوی: یہ گجراتی براہمن تھے، انھوں نے چند ہندی کی کتابیں لکھیں، اُن کی اُردو تصانیف سے لطائف ہندی ہے ؛

نمبر(۹) مظہر علی ولا، انھوں نے زبان اُردو میں مادھونل کا قصہ ترجمہ فرمایا ؛

نمبر (۱۰) اکرام علی: اُن کی تصانیف سے اخوان الصفا ہے۔ اِس کے اہتمام کا سن ۱۸۱۰ء ہے اجماع نثاران بالا سے ہویدا ہے کہ گلکرسٹ صاحب کو اُردو کی نثر جو اِس وقت میں دیکھی جاتی ہے اِس کی ابتدائی ترقی صاحب موصوف کی کوششوں کا نتیجہ ہے کوئی شک نہیں کہ اس وقت سے اُردو کی نثر نگاری میں بہت ترقیاں ہوتی گئیں مگر انصاف یہی ہے کہ مصنفین بالا اُردو کی نثر کے راہ بتانے والے تھے انھیں مصنفوں کی نثاریوں نے سکنائے ہندوستان کو نثر نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ پھر تو کتنے اخبارات جاری ہوتے گئے، اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں تصنیف ہوتی گئیں۔ مرورِ ایام سے یورپین مذاق تحریر بھی پیدا ہوتا گیا اور چند ابھی تک بمقابلہ یورپین زبانوں کے اُردو ایک بے حقیقت زبان ہے، تو بھی اس سو برس کے اندر یہ زبان ترقی سے خالی نہیں رہی اِس عہد کے نامآور نثر نگار سر سید احمد خان بہادر، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان بہادر ہیں ان حضرات کی تحریریں شائستہ اقوام کے نثاروں کے انداز کی ہوتی ہیں نثر کی ممتاز کتابوں میں غالب کی اُردوئے معلیٰ بھی ہے مگر سوائے عمدگی زبان کے اس میں خیالات کا لطف کمتر ہے، یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ اڈیسن وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ اس کو کسی طرح کا مقابلہ حاصل ہے

فارسی کے شعرائے متغزلین کے بیان کے بعد اب اُردو کے شعرائے متغزلین کی نسبت کچھ مضامین ذیل ہوتے ہیں جن سے اُردو کی غزل سرائی کی حالت موجودہ ظاہر ہوگی ؛

ہندوستان کے اُن حصّوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے، مستند غزل سرائی

صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے، یعنی دہلی اور لکھنؤ! ان دونوں شہروں کی صرف غزل سرائی ہی مستند مانی نہیں جاتی ہے بلکہ جمیع اصناف شاعری بھی۔ زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بہت صحیح ہے، اس واسطے کہ ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں مانی جا سکتی ہے، مگر امر شاعری ایسا ہے کہ اس کو کسی خاص مقام سے تعلق نہیں ہے، چنانچہ بعض دیگر دیار کے ایسے شعرا نظر آتے ہیں کہ جو اہل زبان نہ تھے مگر نفس شاعری میں ان کو پایۂ امتیاز حاصل تھا مثلاً پٹنہ میں شیخ غلام علی راسخ گذرے ہیں کہ ان کی توقیر میر تقی صاحب میر نے بھی فرمائی تھی مگر چونکہ اہل زبان کی شاعری حکم سند رکھتی ہے۔ راقم لکھنؤ اور دہلی کے شعرائے متغزلین کی غزل سرائیوں پر اپنے خیالات کا اظہار موقوف رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ دہلی کے حضرات متغزلین اکثر اپنی غزل سرائیوں میں شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے گئے ہیں، اس سبب سے ان کی غزل سرائیاں تقاضائے تغزل کے مطابق پائی جاتی ہیں میر حسن، خواجہ میر درد، میر تقی میر، سودا، مومن، غالب یہ سب شعرائے متغزلین اسی داخلی رنگ کے برتنے والے گزرے ہیں البتہ ذوق پورے طور پر داخلی پہلو کے برتنے والے نہ تھے تو بھی وہ خارجی پہلو کی آمیزش داخلی پہلو کے ساتھ اس رنگ سے کر دیتے ہیں۔ کہ ان کا کلام سیٹھے ہونے سے بچ جاتا ہے برخلاف اس کے لکھنؤ کی غزل گوئی کا رنگ نظر آتا ہے اس جگہ کے اکثر شعرائے نامی غزل سرائی میں خارجی پہلو اختیار فرماتے ہیں یعنی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی قید کے پابند نہیں رہے ہیں۔ بلکہ تقاضائے غزل گوئی کے خلاف خارجی مضامین کو اپنی غزل سرائیوں میں کثرت

سے جگہ دیتے گئے ہیں اس جدت سے احاطہ غزلگوئی تو وسیع ہوگیا مگر غزل سرائی سے جو غرض مقصود ہے فوت ہوگئی۔ ظاہراً اس صنف شاعری کی علت غائیہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل مضامین درد انگیز سے متاثر و متالم ہو۔ طبیعت شوخی کلام سے مزا اٹھائے جان کو سرمایۂ سوز و گداز حاصل ہو، اخلاقی قوی ترقی کر جائیں پس جب ان باتوں سے کوئی بات حاصل نہیں ہوئی تو غزل سرائی سے کیا فائدہ۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شعرائے لکھنؤ نے غزل سرائی کی ترقی کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ ناسخ نے نہ صرف اردو کو اپنے کلام معجز نظام سے ایک شستہ پاکیزہ اور باقاعدہ زبان بنا ڈالا، بلکہ اردو کے لٹریچر کو بھی دولت عالی خیالی سے مالامال کر دیا۔ فی الواقع جیسی ترقی اردو کو ناسخ کی بدولت نصیب ہوئی ویسی کسی دوسرے شاعر کی بدولت ظہور میں نہیں آئی۔ بیشک اردو پر ناسخ کا بڑا احسان ہے، اگر ناسخ نہ ہوتے تو جیسی لکھنؤ کی زبان نفیس، فصیح، شستہ اور پاکیزہ ہو رہی ہے یہ خوبیاں اس کو نصیب نہ ہوتیں اس زبان کا منظوم لٹریچر بھی شیخ کی توجہ فرمائی کا بہت ممنون ہے اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو میں کوئی شاعر مرزا صائب کا جواب نہ نکلتا۔ لیکن زبان اور لٹریچر کی ترقیوں کے ساتھ لکھنؤ میں اردو کے نفس غزلگوئی کو فائدہ حاصل نہ ہوا، کس واسطے کہ ان سب ترقیوں سے میر کی غزل سرائی پر ترقی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی، حقیقت یہ ہے کہ میر کی غزل سرائی اپنے حال پر رہ گئی۔ یہی حال فارسی کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ مرزا صائب کی طباعی سے فارسی کا منظوم لٹریچر تو ترقی کر گیا مگر زبان کے نفس غزل سرائی کو کوئی ترقی نصیب نہیں ہوئی اور حافظ کی غزل سرائی اپنے

درجہ پر رہ گئی، خیر اب راقم اپنے خیالات اُردو کے شعرائے متغزلین کی نسبت عرض کرتا ہے، حضرات ناظرین سے توجہ فرمائی کی التجا ہے ؎

وَلی دکنی شمس الدین ولی دکنی اُردو کی غزل گوئی کے اگر موجد نہیں ہیں تو اس زبان کی غزل گوئی کو درجۂ امتیاز کے بخشنے والے ضرور ہیں، کس واسطے کہ ولی اپنے عہد میں کہ عہد عالمگیر تھا، غزل گوئی کو اس درجہ تک پہنچا چکے تھے، کہ آج دنیا بھی اُن کے اشعار کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھتی ہے، اُن کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نہ صرف اپنے زمانہ کی زبان میں غزل سرائی کرتے تھے، بلکہ میر، مرزا مصحفی کی زبانوں کو بھی برتتے تھے، اس پر طُرّہ یہ ہے کہ اُن کے بہت کلام ایسے ہیں کہ جو ناسخ سے لے کر حال کے زمانہ تک کی زبان میں دکھائی دیتے ہیں۔ غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجہ کے شاعر تھے، جو غزلگوئی کے تقاضے ہیں اُن سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی چنانچہ غزلگوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے تھے، اسی لئے اُن کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے، اُن کے تنوع کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مابعد کے جمیع متغزلین دہلی و لکھنو نے اُن کے کلام سے فیض حاصل کیا ہے، اور سب غزل سرایان نامی نے حسب استعداد ذاتی اُن کی شاعری سے ہدایت پائی ہے ولی کے کلام میں درد۔ سودا۔ میر۔ مصحفی۔ ذوق۔ ناسخ۔ آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے، جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مُرید

ہیں۔ ولی کے کلام بہت ہیں اور گوناگوں رنگ رکھتے ہیں مگر اصل رنگ اُن کا وہی ہے جسے میرؔ، مرزاؔ اور دردؔ نے اختیار کیا ہے ولی کے کچھ اشعار ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

صد حیف کہ وہ یار میرے پاس نہ آیا | میرا سخن راست اُسے راس نہ آیا
طاقت نہیں کسی کو کہ اک حرف سُن سکے | احوال گر کہوں میں دلِ بے قرار کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا | کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا | شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
اے ولی دل کو آب کرتی ہے | نگہ چشم سرمگین کی ادا
نشۂ سبزۂ خطِ خوباں | دالی عالم خیال ہوا
باعث نشہ دوبالا ہے | حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

سبحان اللہ کیا طرزِ کلام ہے غزل گوئی اسی سے عبارت ہے کوئی مصرع بھی دائرہ غزل گوئی سے باہر نہیں جاتا ہے ہر شعر غزلیت سے اس قدر معمور ہے کہ غزل و قصیدہ کا فرق دکھا رہا ہے افسوس ہے کہ ولی کے کلام سے کمتر اس عہد کے لوگ اطلاع رکھتے ہیں حال کے حضرات متغزلین کا فرضِ منصبی ہے کہ ولی کے کلام کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں تاکہ غزلگوئی کی لغزشوں سے مامون رہیں، صاحب آب حیات لکھتے ہیں کہ ولی کا دیوان لندن اور پیرس میں چھپ گیا ہے واقعی اہل یورپ کس قدر علم پروری کا مذاق رکھتے ہیں، کہاں ولی کا دیوان اور کہاں لندن اور پیرس، ایک اسی دیوان پر کیا موقوف ہے سینکڑوں عربی، فارسی وغیرہ کے دواوین یورپ میں

چھپ چکے ہیں اور دواوین ہی پر کیا موقوف ہے ہزاروں کتابیں مختلف ایشیائی علوم کی چھاپی گئی ہیں اور چھاپی جاری ہیں ؛

مرزا رفیع سودا

مرزا رفیع سودا تمام انواع شاعری پر عجیب قدرت رکھتے تھے، غزلگوئی میں بھی انھیں اُستادی کا درجہ حاصل تھا۔ فی الواقع اُن کی قوت شاعری بہت حیرت انگیز نظر آتی ہے، مضامین داخلی اور خارجی دونوں کی بندش پر انھیں اچھی قدرت حاصل تھی۔ اسی لئے تمام اصناف شاعری میں ان کا کلام عجیب جلوہ دکھا رہا ہے اگر انھیں داخلی شاعری میں کچھ تھوڑی اور بھی قدرت ہوتی تو غزلگوئی میں میر کے ہمسر مانے جاتے، یوں تو اور اصناف شاعری میں وہ میر سے بہت بڑھے ہوئے تھے، میر صاحب کو خارجی شاعری کی قوت بہت کم حاصل تھی۔ بلکہ سودا کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ سودا کی قابلیت کے دنیا میں دس پانچ شاعر سے زیادہ نہ گزرے ہوں، سودا کی قوت شاعری ایسی ہے کہ اُس سے کسی ملک کے آدمی کو انکار نہیں ہو سکتا، میں اوپر لکھ چکا ہوں، کہ شاعری کے دو پہلو ہیں، ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اُردو میں سوا میر انیس کے کوئی اُن کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر اُن کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی، جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں اگر مرزا سودا انگلستان میں ہوتے تو دوسرے شکسپیئر ہوتے، مرزا صاحب کی اطلاع ملکی بہت معلوم ہوتی ہے، اپنے ملک کے تمام معاملات ملکی وجہ بندی سے باخبر تھے، یہی حال شکسپیئر کا بھی نظر آتا ہے کہ معاملات یورپ سے اُسے پوری واقفیت حاصل تھی۔ خارجی پہلو کی شاعری

برتنے کے واسطے اطلاع عام کی بڑی حاجت ہے۔ برخلاف اس کے داخلی شاعری میں معاملات خارجیہ کے دانست کی بہت حاجت نہیں ہوتی، داخلی شاعر کا درون ہی اس کی کائنات ہے جو واردات ذہنیہ اور معاملات قلبیہ اس کے ادراک میں جگہ رکھتے ہیں، انھیں وہ موزوں کر دیتا ہے، آئندہ پھر ذکر مرزا سودا کا چند موقع پر آنے کو ہے جس سے مرزا صاحب کی بلند پایگی ظاہر ہوگی یہاں پر چونکہ غزل سرائی کی بحث پیش ہے اس لئے ان کی غزل سرائی کے بارے میں اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہر چند وہ اس صنف شاعری میں میر صاحب کے برابر نہیں ہیں اس پر بھی وہ اس صنف شاعری کے بھی ایک بڑے استاد ہیں ان کا کلام درد، سوز و گداز خستگی سے خالی نہیں ہے اور یہ وہ صفتیں ہیں کہ جو غزل سرائی کی جان ہیں مرزا صاحب کی طباعی طبیعت داری، شوخی، نازک خیالی مضمون آفرینی بہت قابل لحاظ ہے لاریب مرزا صاحب کا ایسا ہی درجہ ہے کہ استاد ناسخ ان کی شان میں یوں فرما گئے ہیں ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب　　ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

ذیل میں کچھ مرزا صاحب کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا　　ہم نے اسے ہر خار بیابان میں دیکھا
روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا　　جس نور کو تو نے مہ کنعان میں دیکھا
برہم کرے جمعیت کونین جو پل میں　　لٹکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا
واعظ تو سنی بولے ہے جس روز کی باتیں　　اس روز کو ہم نے شب ہجران میں دیکھا
اے زخم جگر سودۂ الماس سے خو کر　　کتنا وہ مزا تھا نمک دان میں دیکھا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا — پہنچے کب اُس کو ہاتھ ہمارے غبار کا
موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے — دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

قطعہ

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

قطعہ

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا
بھٹکی پھرے ہے کب سے خدایا مری دعا — دروازہ کیا قبول کا مستور ہو گیا
سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس کو مداجت — کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا
اوروں کی نسبت اندنوں کچھ لگ چلا تھا دل — دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہو گیا

قطعہ

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں — تو بھی ٹک اُس کو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن — نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب — تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

یا جا کے ہم لگے ہیں جہاں تھا ترا گذر — سے صبح تا بشام گئی بار دیکھنا
تسکین دل نہ ہم نے یہاں بھی پائی تو پھر شغل — پڑھنا یہ بیت مگر کبھی اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس — یہ جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم — دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم
کہتا تھا کل کسو سے کرے گا کسی کو قتل — اتنا تو کشتنی نہیں کوئی مگر کہ ہم
دیکھیں تو کس کی چشم سے گرتے ہیں لخت دل — تو اس طرح سے رو سکے اے ابر تر کہ ہم
بیٹھا نہ کوئی چھاؤں نہ پایا کسی نے پھل — ہے بے برگ و بر نہیں کوئی ایسا شجر کہ ہم
قاصد کے ساتھ چلتے ہیں لیکن کہے میرے اشک — دیکھیں تو پہلے پہنچے ہے واں نامہ بر کہ ہم
اتنا کہاں ہے سوز طلب دل پتنگ کا — رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم
سودا نہ کہتے تھے کہ کسی کو تو دل نہ دے — رسوا ہوا پھرے ہے تو اب در بدر کہ ہم

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے ورنہ — کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات — آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے سوز و گداز خستگی درد شوخی نازک خیالی بلند پروازی اور رنگینی کے ساتھ زور طبیعت کا ایسا خوبصورت اظہار ہے کہ فی الواقع سودا کی غزل سرائی کی تعریف کما حقہٗ کی نہیں جا سکتی ہے اوّل تو دیوان اس قدر ضخیم ہے۔ کہ جس سے انتخاب اشعار کر کے بھی درد۔ مومن۔ غالب۔ ذوق کے دیوان سے

اُن کا دیوان منتخب زیادہ حجیم نکل سکتا ہے دوم یہ کہ غزل سرائی اس اعلیٰ درجہ کی ہے کہ سوا میرؔ اور دردؔ کے اُن کا جواب کوئی نظر نہیں آتا، اگر تھوڑی خستگی اور بھی سوداؔ کے کلام میں ہوتی تو اُن کا کلام میرؔ اور دردؔ کے کلام کے برابر ہو جاتا خدا جانے کہ سرزمین دہلی کی کیا تاثیر ہے کہ وہاں کے شعرائے متغزلین اکثر غزل سرائی کی داد خوب دیتے گئے ہیں اس پر تاثیری کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین کو حوالۂ قلم کرتے گئے ہیں یعنی غزل سرائی میں ہمیشہ شاعری کے داخلی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے برخلاف اس کے استادانِ لکھنؤ غزل سرائی میں بیشتر شاعری کے خارجی پہلو سے کام لیتے رہے ہیں جس کے سبب سے اُن کی غزل سرائی سے دل کو حسبِ مراد حظ نہیں اٹھتا ہے، مرزا غالبؔ فرمایا کرتے تھے کہ اُردو زبان کو اہلِ لکھنؤ نے درست کیا مگر مضمون آفرینی میں دہلی والوں کے برابر نہ ہو سکے، مرزا غالبؔ کا یہ قول مضمون آفرینی کے اعتبار سے تو صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ناسخؔ، آتشؔ اور اِن اُستادوں کے شاگردوں نے مضمون آفرینی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے مگر بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے حضرات متغزلین دہلی کے حضرات متغزلین کے برابر پر تاثیر مضمون آفرینی نہ کر سکے، اس کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں حضرات لکھنؤ نے شاعری کے خارجی پہلو کو داخل کر دیا جو غزل سرائی کے تقاضے کے خلاف ہے پس یہ جدت مفید غزل سرائی کیونکر ہوتی ؟

خواجہ میر دردؔ

خواجہ میر آپکا نام ہے سوداؔ اور میرؔ کے ہمعصر تھے، گو پہلے اِن ہر دو شاعرانِ گرامی سے رحلت فرمائی۔ اکثر مشاعروں میں یہ تینوں حضرات شریک رہے ہیں. خواجہ صاحب کی غزل سرائی

نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے، سوز و گداز میں ان کے جواب یا میر تھے یا آپ اپنے جواب تھے، واردات قلبیہ کے مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سودا اُن تک نہ پہنچے تھے، علاوہ اس کے خود طبیعت جو نہایت پر درد واقع ہوئی تھی اس کا اثر اُن کے کلام میں بدرجہ کثیر پایا جاتا ہے۔ ہرچند خواجہ کا دیوان مختصر سا ہے مگر قریب قریب انتخاب کا حکم رکھتا ہے اگر میر صاحب کے دواوین سے انتخابات کئے جائیں، تو خواجہ صاحب کے دیوان سے اُن کے منتخب کا حجم بہت زیادہ نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوان کے تجیم ہونے پر شاعری کی قدرت موقوف نہیں رہتی کلام کی خوبی قابل توجہ سمجھی جاتی ہے نہ اس کے دیوان کا حجم خواجہ صاحب کی غزل سرائی تمامتر اس صنف شاعری کے تقاضوں کے مطابق پائی جاتی ہے علاوہ سوز و گداز، درد خستگی علو معانی اور سمو مضامین کے نظم کی شستگی راقم کی دانست میں میر صاحب کے کلام سے زیادہ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ اپنے خیالات دلکش کو بڑی صفائی کے ساتھ حوالۂ قلم فرماتے ہیں۔ خواجہ کے کلام میں ایک امر اور بھی قابلِ لحاظ ہے کہ چونکہ خلقت کے رو سے صاف دل تھے اور ریاضت نے اُن کی ہر قلبی کیفیت کو ترقی بخشی تھی، اُن کے کلام میں عجب بے نفسی کی جلوہ گری پیدا ہے۔ الغرض غزل سرائی کے اعتبار سے خواجہ صاحب ایک بڑے شاعر تھے اور ان کا نظیر سوائے میر کے کوئی دوسرا نہیں دیکھا جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ درد کو حافظ کے ساتھ ہمسری ہے، حافظ کے ساتھ نہ تو فارسی اور نہ اُردو کے کسی شاعر کو ہمسری حاصل ہے۔ اس پر بھی درد کی غزل سرائی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھے جانے کا استحقاق رکھتی ہے ذیل میں کچھ اشعار خواجہ کے نذر

ناظرین ہوتے ہیں ؎

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا
میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

گی تو تھی تا تیرِ آہِ آتشیں نے اُس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تک آزماتا رہے گا

اُسنے قصہ ابھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا گر سنا ہو گا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں
آئے بھی اگر ہزار جی میں

ہر چند نہیں صبر تجھے درد و لیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ
تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

جوں خواب ہے وابستہ غفلت یہ تماشا
کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آئے

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے | لوحِ مزار بھی میری چھاتی پہ سنگ ہے
بارے مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اُس سے | مذکور کسی طرح تو جا کیجئے اُس سے
تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے | کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
ایک بھی پرزانہ ہم لائے تھے ساتھ | یاں سے سمجھانے کو اک دفتر چلے
شمع کے مانند ہم اُس بزم میں | چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ | جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے | جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے
تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے | یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا کرے
کہہ بیٹھیو نہ درد کہ اہلِ وفا ہوں میں | اُس بے وفا کے آگے جو ذکرِ وفا چلے
یہی پیغام درد کا کہنا | گر صبا کوئے یار میں گزرے
روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے | اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے کن کن باتوں کی تعریف کی جائے خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تو، واقعی خواجہ صاحب کی غزل سرائی الہامی شاعری کا نمونہ ہے علاوہ سوز وگداز وغیرہ کے اُن کے کلام میں لفاست، متانت، شیرینی ملاحت رنگینی بھی کس قدر پیدا ہے اور شوخی کس پاک درجہ کی آشکارا ہے۔ اِس شوخی کو اُس ناپاک شوخی سے کیا علاقہ جس پر جہال زمانہ وجد کرتے ہیں۔ جو شوخی مطبوع عوام ہو رہی ہے اُس کی جھلک بھی خواجہ صاحب کے کلام میں پائی نہیں جاتی ہے۔ واقعی اس زمانہ کے عوام کے خیالات جو شوخی کے مادے میں ہیں۔ بہت قابلِ اصلاح نظر آتے ہیں کس واسطے کہ اُن خیالات کی بنا محض بدتہذیبی پر ہے اللّٰھم احفظنا من ذالک ؎

میر: نام نامی آپ کا میر محمد تقی ہے لاریب میر صاحب اردو کے سلطان المتغزلین ہیں اور استاد ناسخ کی عقیدت مندی اُن کی جناب میں بے سبب نہ تھی ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میر صاحب کے چھ دیوان ہیں، اس میں تنک نہیں کہ ان میں بہت اشعار ایسے ہیں کہ ترک کر دینے کے قابل ہیں اس لئے کہ اُن میں یا پست خیالی کا نقصان لاحق ہے یا اُن کی شان اس قدر کم ہے کہ اُن کو میر صاحب کے کلام ہونے کا رتبہ حاصل نہیں ہے اس پر بھی اگر ان چھ دیوانوں سے انتخاب اشعار کیا جائے تو ایک نہایت حسب مراد دیوان مرتب ہو سکتا ہے خیر راقم اب اپنے خیالات میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ظاہر کرتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ اگر میر صاحب کے منتخب کلام پر نگاہ ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام سے زیادہ خوبصورت کلام زبان اردو میں کہیں نہیں ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خواجہ میر درد کو مستثنیٰ کر کے کسی شاعر ریختہ گو کو آج تک اُن کے کلام کی ہوا بھی نہیں لگی ہے واقعی میر صاحب کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ ویسا کہنا تو درکنار اُن کے وہ ایک مصرع کا چربہ بھی کسی سے نہیں اتر سکتا ہے سارا دیوان ذوق یا ناسخ کا پڑھ ڈالیے، ایک مصرع بھی کہیں نظر نہ آئے گا جس پر میر صاحب کے کلام کا دھوکا ہو سکے حالانکہ ناسخ یا ذوق کے اُستاد الاستاد ہونے میں کسی صحیح الحواس کو عذر نہیں ہو سکتا۔ اس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب جو ڈھونڈھیے تو صرف اتنی باتوں میں محدود پایا جاتا ہے کہ میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اُن کے وہی اشعار زیادہ دلآویز معلوم ہوتے ہیں۔ جو زیادہ واردات قلبیہ اور امور

ذہنیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ میر صاحب کی غزل سرائی تمام تر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے تب ہی تو اُن کے کلام میں سوز و گداز خستگی نشتریت رنگینی ملاحت شیرینی شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ وہ کیفیتیں ہیں جو دل کو بھاتی ہیں پس جس شاعر کے کلام میں یہ کیفیتیں موجود ہوں گی کیونکر اُس کا کلام دل آویز اور دلکش نہ ہوگا یہ سب صفتیں خواجہ میر درد صاحب کے کلام میں بھی موجود ہیں مگر بہ نسبت فقیر خواجہ صاحب کے کلام میں میر صاحب کے کلام اعتبار سے خستگی کم ہے لیکن سوز و درد خواجہ صاحب کا میر صاحب کے کلام سے بڑھا نظر آتا ہے علاوہ اِس کے پاکیزگی اور لطافت خواجہ صاحب کے کلام کی بہت قابل توجہ ہے اِسی طرح میر صاحب کے کلام میں دل گرفتگی محزونی اور نشتریت خواجہ صاحب کے کلام سے زیادہ پائی جاتی ہے خیر ان سب کیفیاتِ قلبی میں یہی دونوں حضرات ایک دوسرے کے جواب نظر آتے ہیں مگر میر صاحب کو جو خواجہ صاحب پر غلبہ نظر آتا ہے وہ قوت شاعری کے اعتبار پر ہے کہ یہ قوت میر صاحب کو خواجہ صاحب سے زیادہ حاصل تھی امر موازانہ سے علیحدہ ہو کر گذارش راقم میر صاحب کی غزل سرائی کی نسبت یہ ہے کہ اُن کی سخن سنجی کا انداز ایسا ہے کہ کسی شاعر سے اس کا تتبع نہ ہو سکا، بلکہ میر صاحب کے حسنِ کلام تک پہونچنے کی شعرا نے جس قدر کوششیں کیں، اُسی قدر انھیں پس پائی نصیب ہوئی، چنانچہ ذوق نے نہایت انصافانہ فرمایا ہے **شعر**

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

اِسی ناکامیابی نے مختلف شعرا، کو مختلف غزل سرائی کی راہیں سوجھائیں مگر کوئی موصل الی المطلوب نہ نکلی۔ ذوقؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ نے بدین جس قدر منزلیں طے کیں میر صاحب

کی غزل سرائی کے دیار سے دُور پڑتے گئے۔ مومن نے راہ راست اختیار کی بھی تو چند منزل چل کر رہ گئے، غالب کا بھی یہی حال ہوا کہ منزلوں راہ راست پر چل کر آخر کار انھیں راہ زنوں سے پالا پڑا اور منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ مختصر یہ ہے کہ جہاں میر صاحب جاکر منزل گزین ہوئے وہاں کوئی راہرو نہ پہنچ سکا۔ ذیل میں میر صاحب کے کچھ کلام نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا   پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
اُتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم   یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر   اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

کل پانوٗں ایک کاسہ سر پر جو آگیا   یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک   پلک تک گیا تو تلاطم کیا
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا   دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند   یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں   جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تاب کس کو جو حال میر سنے — حال ہے اور کچھ ہے مجلس کا

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا — اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا — موسم گل صفیر بلبل تھا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا — منہ نہ کرنا دہر تجاہل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار — یاد ایام جب تحمل تھا
خوب دریافت جو کیا ہم نے — وقت خوش میر نکہت گل تھا

مارا زمیں میں گاڑا اُس کو صبر آیا — اس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا
موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تُو تو — جانے گا وقت مرگ کہ عالم حباب تھا
گل کو محبوب ہم قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثال آئینہ — ایک عالم کا روشناس کیا
صبح تک شمع سر کو دُھنتی ہے — کیا پتنگے نے التماس کیا
داغ فراق حسرت وصل آرزوئے شوق — میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

تیر ہر ایک موج میں زلف ہی کا سا داغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

سب گیئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اسے مطلق نہ پہچانا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مغاں مجھ مست بن پھر خندہ ساغر نہ ہو گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئیگا

اے گل نو دمیدہ کے مانند
ہے تو کس آفریدہ کے مانند

ہم امید وفا پہ تیری ہوئے
غنچۂ دیر چیدہ کے مانند

سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال — سبزہ نودمیدہ کے مانند
ہم گرفتار حال ہیں اپنے — طائر پر بریدہ کے مانند
دل تڑپتا ہے اشک خونیں ہیں — صید خونِ طپیدہ کے مانند
میر صاحب بھی اسکے ہاں تھے لیک — بندۂ زر خریدہ کے مانند

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام — گئے گذرے خضر علیہ السّلام
ہجر یار کا دیکھ چپ لگ گئی — سخن یاں ہُوا ختم حاصل کلام

میرے سنگ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا — میر کا طور یاد ہے ہم کو

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکان سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہمکو خاک ہی رکھتا کہ اِس میں ہم — غبار راہ ہوتے یا کسی کی خاک پا ہوتے

اپنی ہستی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سُراب کی سی ہے
تازگی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
تیر اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

شمع صفت جب کبھی مرجائینگے
ساتھ لیئے داغ جگر جائیں گے

اب جو اک حسرت جوانی ہے
عمر رفتہ کی اک نشانی ہے

ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ
تا چمن ایک پر فشانی ہے

چہرہ سے اُٹھا برقع کو وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

جب نام ترا لیجیئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمین سخت اور آسمان دُور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج
گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

تربت میر پر ہیں اہل سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل
بہ خدا واجب الزیارت ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

اب کی بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی
اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی

میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک
آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
برسات ابکی شہر میں سارے برس رہی

جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میر تو بس اک نفس رہی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفہ روزگار ہیں ہم بھی

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

نالے کر لو سمجھ کے اے بلبل — باغ میں یک کنارہ ہیں ہم بھی
مدعی کو شراب ہم کو زہر — عاقبت دوستدار ہیں ہم بھی
گرز خود رفتہ ہیں ترے نزدیک — اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی
میرؔ نام اک جواں سنا ہوگا — اسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ — جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے
کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں — کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

واضح ہو کہ اشعار بالا راقم نے نمونہ کے طور پر میرؔ صاحب کے دیوان اول سے انتخاب کر لئے ہیں۔ اس انتخاب سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دیوان میں اس کے علاوہ اور اشعار انتخاب کے قابل نہیں ہیں، بہرحال اتنے اشعار میرؔ صاحب کے انداز کلام کو دکھلانے کے واسطے کافی ہیں۔ حضرات اہل واقفیت سے مخفی نہیں ہے کہ اشعار بالا میں کیا کیا واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی کیفیتیں شاعری کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ یہ سب دشوار کیفیتیں جو مسائل علمیہ کا

حکم رکھتی ہیں، ایسی آسان اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہیں کہ اُس سے آسان اور سلیس تر زبان میں اُن کا بیان کیا جانا ممکن نہ تھا، واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں، میر صاحب ایسی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اُن کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے، بیان مضامین بیشتر تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر سخن سنجی میں قاصر آتا ہے تب ہی تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے اپنے کلام میں اعانت لیتا ہے ورنہ منتج خوش اسلوب پُر تاثیر دلفریب جانفزا روح پرور نیچرل مضمون زنہار ایسی ایسی ترکیبوں کا محتاج نہیں ہوتا، چنانچہ بہت سے گیت دُہرے وغیرہ ایسے ہیں کہ تمام تر تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے پاک ہیں، مگر اُن کے مضامین کی عمدگی ایسی ہے کہ بے اختیار دل پر عجب بامراد تاثیر پیدا کرتی ہے ؂

مومن دہلوی

حکیم مومن خاں ذوق کے ہمعصر تھے، مگر ذوق سے غزل گوئی کا رنگ علیحدہ رکھتے تھے، غالب بھی اسی زمانہ میں تھے، گو مومن کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے ہر چند مومن اور غالب دونوں شاعری کا داخلی پہلو برتتے تھے تو بھی اِن دونوں کے مذاق شاعری جداگانہ تھے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی جتنی غزلیں ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے۔ غزل سرائی میں مومن بھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالہ قلم کرتے ہیں گو اُن کے بیان میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی پر تاثیری پائی نہیں جاتی ہے ان دونوں بزرگوار کے

کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کمان سے تیر نکلے، ان کا کلام سامع کے دل پر فوراً جا بیٹھتا ہے بر خلاف اس کے مومن کا انداز سخن ہے کہ جب تک بغور ان کے کلام پر نظر نہ ڈالیئے لطف کلام حاصل ہی نہیں ہوتا، اس لیئے بعض بے مغزوں نے مومن کے دیوان کو مہمل قرار دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن ایک بڑے بلیغ شاعر ہیں، مگر میر صاحب کے کلام کی رفعت، جلالت، ملکنت، خستگی، برشتگی کو نہیں پہنچتے ہیں اور ہر چند وصل، فراق، غم، ملال، رنج، ضد، عداوت، حسد، رشک، اضطراب بیتابی، بیخوابی کے مضامین خوب باندھتے ہیں۔ مگر ان کے کلام سے کبھی کبھی کوچہ گردی کی بو آجاتی ہے، اس پر بھی جوانانہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے، جبر خواجہ اور میر کے معاملات قلبیہ کے مضامین کی بندش میں مومن خاں جو کچھ کم سمجھے جائیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ وہ ایک ایسے بڑے غزل سرا ہیں کہ ان کی غزل سرائی پر اہل دہلی کو بلکہ ہر دیار کے مذاق کو ناز ہونا چاہیئے۔ مومن خاں کی غزل سرائی تشبیہہ سے اکثر پاک دیکھی جاتی ہے۔ استعارے بھی کثرت سے داخل کلام نہیں ہوتے اور مبالغے بامذاقی سے خالی نہیں دیکھے جاتے، ان کی شاعری میں جو کچھ نقصان ہے وہ نقصان بندش ہے، نقصان مضامین نہیں ہے مثلاً اگر تعقیدات کو ان کے کلام میں دخل نہ ہوتا تو ان کی غزل سرائی ترکیب زبان کے عیب سے پاک ہوتی۔ راقم قبل میں عرض کرچکا ہے کہ اکثر شعرائے دہلی غزل سرائی میں شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں برخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ خارجی پہلو سے بیشتر سروکار رکھتے ہیں، راقم ذیل میں دو غزلیں حوالۂ قلم کرتا ہے ایک مومن خاں کی ہے اور دوسری خواجہ آتش کی۔ اہل نظر پر روشن ہے کہ مومن اپنی اس تمام غزل میں تین شعر کے

سو داخلی پہلو کے متمسک رہے ہیں اور آتش ساری غزل میں خارجی پہلو سے کام لیا کئے ہیں:

غزل مومنؔ

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے
دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لئے

دیکھا عذاب رنج دل زار کے لئے
عاشق ہوئے ہیں وہ مرے آزار کے لئے

قتل اُس نے جو تم صبر جفا پر کیا مجھے
یہ ہی سزا تھی ایسے گنہگار کے لئے

لے تو ہی بھیجدے کوئی پیغام تلخ اب
تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لئے

آتا نہیں ہے تو تو نشانی ہی بھیج دے
تسکین اضطراب دلِ زار کے لئے

کیا دل دیا تھا اس لئے میں نے تمھیں کہ تم
ہوجاؤ یوں عدو مرے اغیار کے لئے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرز خرام و شوخی رفتار کے لئے

جی میں ہے موتیوں کی لڑی اُسکو بھیجدوں
اظہار حال چشم گہربار کے لئے

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گلبرگ سے مثال
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے

جینا امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں زندگانی دشوار کے لئے

مومنؔ کو تو نہ لائے کبھی دام میں وہ بت
ڈھونڈھے ہے تار سبحہ کے زنار کے لئے

واضح ہو کہ گہربار، رخسار اور زنار اشیائے خارجیہ سے ہیں ناچار ان اشعار کے مضامین بھی خارجی پہلو سے بند ہے، اگر مومن خاں کچھ استعداد پردازی پر عمل کر جاتے تو یہ قافیے داخلی پہلو کے مضامین کے ساتھ بندھ جاتے، غالبؔ ہوتے تو ضرور یہی روش اختیار کرتے جیسا کہ اُن کی روش خاص کا تقاضا ہے +

غزل خواجہ آتش

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے ۔۔۔ ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے
نورِ تجلی ہے ترے رخسار کے لئے ۔۔۔ آنکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لئے
قول اپنا ہے یہ سبحہ و زنار کے لئے ۔۔۔ دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لئے
لطف چمن ہے بلبل گلزار کے لئے ۔۔۔ کیفیت شراب ہے میخوار کے لئے
سیری نہ ہوگی تشنۂ دیدار کے لئے ۔۔۔ پانی نہیں چہ ذقن یار کے لئے
اتنی ہی ہے نمود مرے یار کے لئے ۔۔۔ شہرہ ہے جس قدر مرے اشعار کے لئے
دشتِ عدم سے آئے ہیں باغ جہاں میں ہم ۔۔۔ بے داغ لالہ و گل بے خار کے لئے
شمشاد اپنے طرّہ کو بیچے تو لیجیے ۔۔۔ اس لالہ رو کی لٹ پٹی دستار کے لئے
دو آنکھیں چہرے پر نہیں تیرے فقیر کے ۔۔۔ دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے
سرمہ لگایا کیجیے آنکھوں میں مہربان ۔۔۔ اکسیر یہ سفوف ہے بیمار کے لئے
حلقہ میں زلف یار کے موتی پرو دیئے ۔۔۔ دنداں ضرور ہیں دہن یار کے لئے
گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے ۔۔۔ گل کے لئے ہے گوش زبان خار کے لئے

واضح ہو کہ خواجہ کی یہ غزل چھبیس[26] شعر کی ہے بطرز نمونہ ایک طرف سے بارہ[12] شعر نقل کر لئے گئے ہیں، سوا مطلع کے کہ داخلی پہلو رکھتا ہے جمیع اشعار اس غزل کے خارجی مضامین سے مشتمل ہیں، یہ ایک عمدہ مثال اس دعوےٰ کی ہے کہ لکھنؤ کے استادان غزل بہت زیادہ خارجی مضامین برتتے ہیں، ساری غزل خواجہ کی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے یہ مراحل دور ہے جتنے امور عالم خارج

سے متعلق ہیں وہی احاطہ بندش میں در آئے ہیں برخلاف اس کے مومن کی غزل ہے کہ تین شعر کے سوا بقیہ اشعار غزل محض امور ذہنیہ ہیں اور ہر چند اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتے ہیں تو بھی امور داخلی ہونے کے باعث غزلیت ہی کی شکل قائم رکھنے والے ہیں۔ الحق غزل سرائی کے لئے داخلی پہلو کے مضامین نہایت مطبوع ہوتے ہیں چنانچہ خواجہ کا پہلا مطلع جو داخلی پہلو رکھتا ہے۔ بقیہ اشعار غزل سے زیادہ غزلیت کا لطف رکھتا ہے یہ تو خواجہ کی رنگینی طبیعت کی خوبی ہے کہ خارجی مضامین بھی ان کی غزلوں میں کچھ مزا دے جاتے ہیں ورنہ اگر کوئی دوسرا شاعر خارجی رنگ میں غزل لکھتا تو یقیناً اس کی غزل میں سے خالی نہیں ہوتی۔ اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی غزل کس قدر غزلیت کا مزا دے رہی ہے یہ لطف مجرد داخلی مضامین کی بدولت ہے ورنہ بندش و زبان میں خواجہ کے اشعار سے اشعار پر بدرجہا غالب ہیں۔ ذیل میں کچھ مومن کے کلام نمونہ کے طور پر منسلک ہذا کئے جاتے ہیں۔

مومن

رات کس کس طرح کہا نہ رہا — نہ رہا پردہ مہ لقا نہ رہا

غیر آکر قریب خانہ رہا — شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری — تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

غم مرا کس لئے کہ دنیا میں — نہ رہا میں مرا فسانہ رہا

مدعا غیر سے کہا تا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا

غیر چھڑکے ہے زخم دل پہ نمک — شور الفت میں بھی مزا نہ رہا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

تو فلک مرگ ہم سے سب غافل
اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

مومن اس بت کے نیم ناز ہی ہیں
تم کو دعوے اتقا نہ رہا

ناصح نے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح ہے اب تار لگا

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا
جو مریضوں سے چھپاتے ہیں نہ آزار لگا

تو کسی کا بھی خریدار نہیں پر ظالم
سرفروشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا

کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

اس روانی سے ذرا خنجر بیداد رہا
بارے اک دم اثر نالہ و فریاد رہا

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

لے چلا جوش جنوں جانب صحرا افسوس
جب مرے کوچہ میں آکر وہ پری زاد رہا

گھر غم ہو گئے عشق بتاں اے مومن
ہیں سدا سوختۂ حسن خداداد رہا

وعدہ وصلت سے دل ہو شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارکباد کیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

نالہ پیہم سے یاں فرصت نہیں
حضرت ناصح کریں ارشاد کیا

ہیں اسیر اسکے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر — ورنہ فرق خسرو فرہاد کیا

نشۂ الفت سے بھولے یار کو — سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا

نالہ اک دم میں اڑا ڈالے دھوئیں — چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو — بے وفا پھر حاصل بیداد کیا

پاؤں تک پہنچی وہ زلفِ خم بخم — سرو کو اب باندھیے آزاد کیا

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

دلربائی زلف جاناں کی نہیں — پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

روز محشر کی توقع ہے عبث — ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

گر بہائے خون عاشق ہو وصال — انتقامِ زحمتِ جلاد کیا

بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس — لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

وقت وداع ہے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں عبث — ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

روز جزا خدا اُبت جلاد کو ملا
گویا کہ خون ناحق مومن ثواب تھا

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پوچھا کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا
ہم جان سے عنان بہ عنان صدا گئے

پھیلی وہ بو جو ہم میں نہاں مثل غنچہ تھی
جھونکے نسیم کے یہ نیا گل کھلا گئے

مجلس میں اس نے پان دیا اپنے ہاتھ سے
اغیار سبز بخت تھے ہم زہر کھا گئے

اٹھا نہ ضعف سے گل داغ جنوں کا بوجھ
قاروں کی طرح ہم بھی زمیں میں سما گئے

غیروں سے ہو وہ پردہ نشین کیوں نہ بے حجاب
دمہائے بے اثر مرے پردہ اٹھا گئے

تھی بدگمانی اب انھیں کیا عشق حور کی
جتا کے مرتے دم مجھے صورت دکھا گئے

تابندہ جوان تو بخت رقیب تھے
ہم تیرہ روز کیوں غم ہجران کو بھا گئے

بیزار زندگانی کا جینا محال تھا
وہ بھی ہماری لاش کو ٹھوکر لگا گئے

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں
عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھپا گئے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں
بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

ذوق دہلوی

شیخ ابراہیم ذوق، ظفر شاہ کے استاد تھے۔ بادشاہ کے حضور سے خان بہادر اور خاقانی ہند کے خطابوں سے سرفراز بھی ہوئے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ذوق ایک بڑے ممتاز شاعر گذرے ہیں مگر ان کی غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق پورے طور پر نہ تھی، اسی لئے اس صنف شاعری میں وہ خواجہ میر درد یا میر تقی میر کے برابر نہیں سمجھے جا سکتے ہیں۔ ذوق غزل سرائی میں زیادہ خارجی مضامین باندھتے ہیں اور جو داخلی مضامین باندھتے ہیں تو ان میں درد اور میر کے کلام کے سوز و گداز خستگی وغیرہ کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ پس ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی غزل سرائی ان دونوں بزرگوار کی غزل سرائیوں کا لطف نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ ذوق کے تمام دیوان کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے سو شعر میں

بیشتر شعر خارجی رنگ کے ہوتے ہیں اسی لیئے اُن کی غزل سرائی حضرات اہل لکھنؤ
غزل سرائی سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہے اور اسی لیئے اُن کا کلام ان کے معروف شعرا
ہم وطن کے کلاموں سے ایک علیحدہ انداز رکھتا ہے ؛

اگر مومن اور غالب سے ذوق کو ملایئے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوق غزل سرا
میں اپنے ملکی مذاق کے پابند نہ تھے، بلکہ اُن کا مذاق غزل سرائی کا ایسا دکھائی دیتا
ہے کہ جس سے وُہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے ہم مذاق معلوم ہوتے ہیں، قوت
شاعری کے اعتبار سے ذوق ایک زور آور شاعر تھے اُن کی طلاقی سخن بلند پروازی
نازک خیالی نفیس مزاجی وغیرہ وغیرہ میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے، مگر غزل سرا
میں وہ اس روش کے پابند نہیں رہے ہیں جو درد اور میر کی تھی، اسی لیئے اُن
کی غزلیں باوجود عالی خیالی وغیرہ کے وہ تاثیر قلبی پیدا نہیں کرتی ہیں جس کی مقام
غزل سرائی ہے حضرت ذوق کے کچھ کلام بطرز نمونہ ذیل میں نذر ناظرین ہوتے
ہیں جس سے اُن کی غزل سرائی کا رنگ ہویدا ہوگا ؛

ذوق کے خارجی مضامین کے اشعار

شوق نظارہ ہے جیسے اُس رُخ پرنور کا ۔۔۔ ہے مرا مرغ نظر پروانہ شمع طور

واضح ہو کہ یہ غزل کی غزل جو شیخ ناسخ کی غزل پر لکھی گئی ہے۔ ناسخ کی غزل
کی طرح تمام تر شاعری کا خارجی پہلو رکھتی ہے، ذوق کی اس غزل سرائی میں پچیس شعر
ہیں اور سب کے سب کم و بیش طور پر خارجی مضامین سے مشتمل ہیں ؛

تام منظور ہے توفیض کے اسباب بنا ۔۔۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب
واہ کیا مرہم زخم دل بے تاب بنا ۔۔۔ آپ سے نشتر سر تیز کے تیزاب

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا — جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا
میرے نالوں سے جو پانی سنگِ خارا ہو گیا — کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا — جھلسے ہیں منہ شکار کیے پر بھی شیر کا
جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں — کانٹا ہے گھر میں ساہی کا بالِ کیر کا

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا — سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

ان سب غزلوں کے بھی اکثر اشعار تمام تر خارجی پہلو رکھتے ہیں۔

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
روزِ مرگِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن — ہے بجائے شورِ ماتم غل مبارک باد کا
آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جان — کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا

یہ تینوں شعر اس غزل کے ہیں جو ذوق نے ناسخ کی غزل پر لکھی تھی۔ یہ غزل بھی ناسخ کی غزل کی طرح اکثر خارجی مضامین سے مشتمل ہے اور کھلے ڈھلے طور سے ناسخ کا رنگ رکھتی ہے۔

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا — گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا
جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تابِ حتاب کا — جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا
اے گلرخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا — دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا

اس غزل کے بھی تمام اشعار خارجی پہلو رکھتے ہیں۔ یہ غزل بھی ناسخ کے رنگ کی ہے اور ناسخ کی زمین میں لکھی گئی ہے۔

بھڑکتا کیا کہوں سینہ میں اپنے آتشِ غم کا — کہ جائے نبض ہے ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصۂ عشرت ہے سواد چند ہے غم کا | کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

یہ زمین بھی ناسخ کی ہے اور رنگ بھی شیخ ہی کا ہے ؎

برنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا | کہ ہے باغ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میر

مجنوں نے دی لگا جو سر خارزار پشت | پشت اب ہجوم خار سے ہے پشت خار پشت

ان دونوں غزلوں کے اشعار اکثر خارجی پہلو رکھتے ہیں ؎

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ | قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمین کی شاخ

یہ ایک بڑی طولانی غزل ہے اور غزل کی غزل کا رنگ خارجی ہے ؎

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر | ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

وہی خارجی رنگ اس غزل کا بھی ہے اسی طرح استاد ذوق کے صدہا اشع
ہیں کہ جو شاعری کا خارجی پہلو رکھتے ہیں۔ راقم عرض کر چکا ہے کہ خارجی مضامین
غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے، پس جتنے حضرات غزل سرا کیا
فارسی اور کیا اردو کے جنھوں نے شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا ہے کبھی اغراض
غزل سرائی کو پورا نہیں کر سکے، مگر حضرت ذوق کی نسبت اتنا عرض کر دینا ضرو
ہے کہ آپ کا کلام اس درجہ پست کو نہیں پہنچا ہوا ہے کہ جو خارجی پہلو کی غزل
سرائی سے عموماً نتیجہ ہوتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چند عموماً غزل سرائی میں ذو
خارجی شاعری برتتے ہیں مگر اُن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خارجی مضامین ک
کسی قدر قلبی اور ذہنی امور کے ساتھ ممزوج کر دیتے ہیں جس کے باعث اُن

کی غزل سرائی سیٹھے ہونے سے بچ جاتی ہے یہی اتنی بات ناسخ میں نہیں ہے ورنہ ناسخ خلاقی مضامین بلند پروازی اور صفائی بندش میں ذوق پر یقیناً غالب ہیں۔

ذوق کے داخلی مضامین کے اشعار

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا | اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام | خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
سراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے | کبھی جس کا نشان پایا نہ پایا
رہ گم گشتگی میں ہم نے اپنا | غبار راہ بھی عنقا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا | کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم | غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا
مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے | فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا

واضح ہو کہ وہ غزل جس سے اشعار بالا انتخاب کر لیئے گئے ہیں، طولانی ہے مگر اُن کے علاوہ اس غزل کے جتنے اشعار ہیں خارجی پہلو رکھتے ہیں یہ اشعار بھی جو ہیں کچھ ایسا داخلی پہلو نہیں رکھتے کہ درد یا میر کے کلام کا لطف دکھا سکیں یوں تو اُستاد کے شعر ہیں، خوش خیالی اور خوش ترکیبی سے خالی نہیں ہو سکتے۔

ایکدم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار | پر امید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس غزل میں تیرہ شعر ہیں مگر اُن میں یہی ایک شعر داخلی پہلو رکھتا ہے۔

ہیں ہجر سے مرنے کے قرین ہو ہی چکا تھا | تم وقت پر آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا | حکم ازلی ذوق یوں ہی ہو ہی چکا تھا

سبحان اللہ کیا خوب اشعار ہیں مگر باقی اشعار غزل خارجی سے خبر دیتے ہیں۔

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی | جزو ضعیف محرم اسرار کل ہوا

سوا اس شعر کے باقی اشعار غزل وہی خارجی رنگ رکھتے ہیں ؎

اس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا — کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا
آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف — ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا
سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا — ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا
ہمتی گر عقدہ کشائی نہ یداللہ کے ہاتھ — ذوق حل کیونکہ مرا عقدۂ مشکل ہوتا

بقیہ اشعار داخلی پہلو نہیں رکھتے ؎

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اس غزل میں بھی داخلی پہلو کے اشعار کے علاوہ خارجی پہلو کے اشعار کی کچھ کمی نہیں ہے اور جو اشعار داخلی پہلو کے ہیں بھی ان میں درد اور میر کے کلاموں کی جذباتی قوت نہیں پائی جاتی حضرات ناظرین اس غزل کو ذوق کے دیوان میں ملاحظہ فرما لیں بخیال اختصار یہاں درج نہیں کی جا سکی ۔

ہیں اس صنم کے ملنے کے رستے تو ہزار دل — پر کوئی راستہ ہے کوئی رخنہ ہے پھیر کا

باقی اشعار غزل خارجی پہلو رکھتے ہیں جیسا کہ اکثر اشعار حضرت ذوق کے یہی رنگ رکھا کرتے ہیں ؎

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا — رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا
کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا — پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

اس غزل کے اشعار بھی زیادہ خارجی رنگ رکھتے ہیں ؎

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا — کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

بقیہ اشعار غزل یا خارجی پہلو رکھتے ہیں یا داخلی اور خارجی رنگوں سے مرکب ہیں ؎

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھا مگر — ایک تیرا نہ مجھے درد جدائی ہوتا

باقی اشعار غزل کا وہی رنگ ہے جو عموماً کلام ذوق کا ہوا کرتا ہے ۔

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے ‌ ‌ ‌ ذوقؔ ہر بت قابل بوسہ ہے اس بتخانہ میں
ذوقؔ اس صورت کدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں ‌ ‌ ‌ کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ ‌ ‌ ‌ اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

سبحان اللہ اشعار بالا کیا خوب ہیں ایسے ہی اشعار شاعر کو استاد کہلاتے ہیں بہرحال جن غزلوں سے یہ اشعار انتخاب ہوئے ہیں وہ غزلیں پورے طور پر داخلی رنگ نہیں رکھتی ہیں اُن کے بہت سے اشعار خارجی رنگ کے بھی ہیں +

اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ استاد ذوق غزل سرائی میں زیادہ خارجی شاعری کا پہلو اختیار فرماتے ہیں یا مرکب رنگوں کو برت جاتے ہیں، اُن کے دیوان میں ایسے اشعار کے عدد جو محض داخلی رنگ رکھتے ہیں یقیناً کم ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اکثر حضرات اہلِ لکھنؤ سوا ذوق کے دہلی کے کسی غزل سرا شاعر کو چشم رغبت سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ جو حضرات وہاں کے دہلی کی غزل سرائی کے انداز کو پسند فرماتے ہیں اپنے ہم وطنوں میں انگشت نما ہو جاتے ہیں کچھ شک نہیں کہ ذوق کی غزل سرائی اُستادانہ جلوہ دکھاتی ہے۔ مگر غزل سرائی کا اصل تقاضا یہ ہے کہ تمام تر داخلی شاعری سے سروکار رکھے۔ جیسا کہ خواجہ میر درد یا میر تقی میر کی غزل سرائی کھلے ڈلے طور پر داخلی رنگ رکھتی ہے، لاریب غزل سرائی کے لئے داخلی رنگ کی پابندی واجبات سے ہے، اگر کوئی غزل سرا اس رنگ کو اختیار کرے گا تو ضرور کم و بیش طور پر اُسے اس صنف شاعری کے برتنے میں کامیابی حاصل ہوگی، اور اگر اعلیٰ درجہ کے قویٰ اخلاقیہ رکھتا ہے اور اُس کے واردات قلبیہ ارفع رتبہ کے ہیں تو عجب نہیں کہ قوت شاعری کے حاصل رہنے پر اس کا کلام دردؔ یا میرؔ کا انداز پیدا کرے۔ ظاہراً اُستاد ذوق کے کلام میں متانت رفعت جلالت عظمت مضمون خیزی نفیس پسندی عالی خیالی، بلند

پروازی طبیعت، واری وغیرہ وغیرہ کی خوبیاں بین طور پر نمایاں ہیں مگر چونکہ مضمون بندی معاملات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے حسب مراد طور پر مشتمل نہیں معلوم ہوتی ہے اُن کی غزل سرائی دلچسپی نہیں پیدا کرتی ہے یعنی جو درد اور میر کی غزل سرائی سے لطف اٹھتا ہے، اُن کی غزل سرائی سے نہیں اُٹھتا۔

منجملہ قابل لحاظ صفتوں کے استاد ذوق میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ حضرت اُردو کے محاوروں کو ایسی آسانی اور روانی کے ساتھ اپنے اشعار غزل میں باندھ جاتے ہیں کہ اہل اطلاع کی طبیعت نہایت لذت یاب حیرت ہوتی ہے، لاریب فطری طور پر محاوروں کی بندش کسی شاعر کے کلام کو بڑا حسن بخشتی ہے اور لغز گفتاری کو نہایت معین ہوا کرتی ہے کچھ اشعار ذیل میں ایسے درج کیے جاتے ہیں کہ محاورہ بندی کے نمونے ہیں ؎

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا منہ اُسے میدان اجل میں مارا
اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

نالہ اُس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
کمی ہو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

کہا پتنگ نے یہ وار شمع پر چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مریئے کسی کے سر چڑھ کر
مرے خیال میں وہ چشم فتنہ گر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ بنی آئی لڑنے گھر چڑھ کر

تو کے غنچہ گر اس لب پہ ڈھٹ خوب نہیں ۔ چپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

مشتے نمونہ از خروارے بہت ایسے اشعار ہیں جس میں اُستاد نے محاورہ بندی کا لُطف دکھایا ہے۔ سب کے انتخاب کا یہاں موقع کہاں ہے جو درج ہذا کیئے جائیں۔ البتہ ذوق مصلح زبان نہ ہوئے یہ دولت اُستاد ناسخ کے لیئے اُٹھا رکھی گئی تھی جو اپنے وقت پر اُس یگانۂ روزگار کو حوالہ کی گئی۔

غالب مرزا نوشہ نواب اسد اللہ خان۔ غالب فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے نام آور شاعر ہیں اُن کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت راقم اظہار خیالات کر چکا ہے اب اُن کی اُردو کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے غالب اُن شاعروں میں ہیں جو جوہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں اُن کی اُردو کی غزل سرائی زیر بحث ہے۔ حضرت نے ذوق۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش۔ ان اُستادوں کے زمانے دیکھے اور ان سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی۔ ذوق سے شاعرانہ سابقہ بھی ظہور میں آیا۔ مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا۔ فقیر کو نہیں معلوم ناسخ سے لُطف مراسلات حاصل تھا۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت اُن کو کوئی بات علم راقم میں نہیں ہے۔ اُردو کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابل توجہ شاعر ہیں اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے اُن کا متتبع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا۔ مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ اُن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔ اس جگہ پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا۔ الا یہ کہ یہ دونوں شاعران نامی افتاد طبیعت سے داخلی شاعری کے

برتنے کی قابلیت رکھتے تھے پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے کیونکہ اُن کی خلقی صلاحیت کے ساتھ موافق پڑتی بہرحال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے۔ واقعات سے بہت بعید نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے لاریب۔ واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کی پرتاثیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ اُن کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ اُن کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے کہ الٰہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ الفاظ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُردو کے اشعار زیر نظر ہیں یا فارسی کے۔ ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاق مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے بلاشبہ اُن کے ایسے کلام کوئی لطف غزلیت نہیں رکھتے اگر اُن کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلق اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس گیتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھئے تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز۔ گداز۔ خستگی درد۔ برجستگی۔ نشتریت۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی۔ ملکنت۔ متانت۔ جلالت۔ تہذیب شوخی غالب کے کلام میں ہے۔ باستثنائے ورد و میر کسی اُستاد کے کلام میں نہیں پائی جاتی نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ پرتاثیری کا کیا کہنا۔ دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوئی جاتی ہے عالی مذاقی روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات

کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہوگا جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے ذیل میں کچھ کلام معجز نظام نذر ناظرین ہوتا ہے ؎

غالب

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
مَیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

واضح ہو کہ اشعار بالا کے رنگ کے بہت اشعار دیوان غالب میں موجود ہیں سب کے انتخاب کا یہاں موقع نہیں ہے حضرات شائقین خود دیوان کو ملاحظہ فرمائیں لیکن چونکہ غزل سرائی حضرت غالب کی سوز و گداز، درد محبت، خستگی، برشتگی، نشتریت، عالی خیالی، دل آویزی، خوش مذاقی، شیرین بیانی، نفیس پسندی، شوخی، رفعت، تمکنت، جلالت، متانت وغیرہ سے معمور ہیں۔ اس لئے چند پوری غزلیں ذیل میں درج

کی جاتی ہیں کہ حضرات ناظرین اُن سے حظ رُوحی اُٹھائیں اور ہر چند اُن میں میر صاحب کے کلام کے سادگی نہیں ہے۔ تو بھی اُن میں غزلیت کا ایسا لطف ہے کہ یہ لُطف کمتر استادوں کے کلام میں دیکھا جاتا ہے ؂

غزل نمبر ۱

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالب غزلسرا نہ ہوا

غزل نمبر ۲

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اُس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی / گر بگڑ بیٹھے تو مَیں لائق تعذیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا / نالہ کرتا تھا دلے طالب تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام / ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی / آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق / آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ / کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غزل نمبر ۳

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا / جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیئے ہوئے / ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ مَیں / شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے / یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن / غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو مَیں رہا رہینِ ستمہائے روزگار / لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں / حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غزل نمبر ۴

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا / کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسمان / ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غزل نمبر ۵

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچہ کی ہوس
کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غزل نمبر ۶

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غزل نمبر ۷

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غزل نمبر ۸

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے اُسکا دشمن آسماں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بیمہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

غزل نمبر ۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہوتے ہیں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنیکی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غزل نمبر ۱۰

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقشِ پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

غزل نمبر ١١

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

غزل نمبر ۱۲

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہائے شرربار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق — سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخون دل — سازِ چمن طرازی داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذر دل فریبی عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

فقیر کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف بارہ غزلیں ایسی جو بالا میں رقم ہوئیں۔ تصنیف کرے تو اُسے صاحبِ دیوان ضخیم ہونے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ غزلیں اعلیٰ درجہ کی غزل سرائی سے خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی غزلیں دیوانِ غالب میں موجود ہیں۔ جو انتخاب کا حکم رکھتی ہیں یہ بارہ غزلیں تو صرف نمونہ کے طور پر مندرج کی گئی ہیں بہر حال یہ بارہ غزلیں اہل انصاف کو رائے قائم کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُستاد غالب اُردو میں بڑے غزل سرا گذرے ہیں۔ یوں تو بے عیب ذات خدا کی ہے مگر اس پر بھی اُن کی غزل سرائی معائب غزل سرائی سے بہت کچھ پاک ہے، لاریب اُن کی غزل سرائی قریب قریب غزل کے تقاضوں کے موافق ہے اگر غالب، درد یا میر تک اس صنف شاعری میں نہیں پہنچتے ہیں تو ان دونوں استادوں کے بعد انھیں کا درجہ ہے واقعی باستثنائے خواجہ و میر کسی کی غزل سرائی ایسی نہیں دیکھی جاتی ہے جو دل کو ہلا دے یوں تو پُر تاثیری سے اُستادوں کا کلام خالی نہیں ہوتا۔ اس جگہ فقیر اپنی ذاتی کیفیت دلی کو عرض کر رہا ہے، نہیں معلوم کہ اس عاجز کا قول کلیہ کا حکم رکھتا ہے یا نہیں مگر اکثر کیفیتیں جو احقر پر غالب کے شعروں سے گزری ہیں اُن سے اپنی رائے وہی قائم ہوا کی ہے جیسے تجربۂ شخصی کے طور پر اس ہیچمدان نے بالا میں عرض کیا خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے کلاموں کی پُر تاثیری سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا مگر غالب کی نسبت بھی فقیر کا یہی عقیدہ ہے کہ اُن کے کلام کی تاثیر عجب ڈھنگ رکھتی ہے راقم بہت ایسی صحبتوں میں شریک رہا ہے، جہاں بہت اُستادوں کے کلام پڑھے گئے ہیں مگر غالب کے کلام نے رنگ جلسہ کو بدل دیا ہے ایک بار کی سرگزشت

ہے کہ بندہ سیر و شکار کی نظر سے ایک صحرا میں خیمہ زن تھا کچھ ارباب مذاق جو مدعو تھے شام کے بعد شعر خوانی فرمانے لگے بہت سے اُستادوں کے کلام پڑھے گئے اور سب حضرات تلذذ روحی اُٹھاتے گئے۔ آخر ایک طبیعت دار جوان رعنا نے یہ مقطع غالب کا پڑھا ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر غیر معروف نہ تھا مگر اُس سے کچھ عجیب کیفیت قلبی پیدا ہوئی اُس وقت سے تا سحر اِس دل گرفتہ کو سخت بے قراری لاحق رہی، فقیر کے دل سے اُس دن کی نماز صبح کا مزا نہیں جاتا۔ کاش ایسی صبح دولت خیز ہر روز نصیب ہوتی واقعی جس کلام میں تاثیر نہ ہو تو وہ کلام گو ہزار صنائع بدائع سے بھرا ہُوا ہو۔ قابل نفرت ہے اسی طرح ایک بار شب کو ایک دوست نے خواجہ میر دردؔ کے یہ دو شعر پڑھے ؎

یہی پیغام دردؔ کا کہنا — جب صبا کوئے یار میں گذرے

کون سی رات آن ملئے گا — دن بہت انتظار میں گذرے

حالانکہ اِن شعروں سے بھی عاجز کو سابق سے واقفیت حاصل تھی۔ مگر دل کا یہ عالم ہُوا کہ خدایا تیری پناہ۔ وہ رات تو بُری گذری مگر ایک ہفتہ تک وحشت کی کیفیت قائم رہی، میر صاحب کے نشتروں کی کیفیتوں کو بیان کرنا فضول ہے۔ کون شخص ایسا ہے کہ جو دل رکھتا ہے اور اُن کا زخم خوردہ نہیں ہے الغرض غزل سرائی ایک ایسی شے ہے کہ جس کو محض دل سے تعلق ہے اور ظاہرا جیسی غالبؔ کی غزل سرائی نظر آتی ہے اُس سے اُنکا ایک بامراد غزل سرا ثابت ہونا بعید از انصاف نہیں ہے ؎

حضرت غالب کے کچھ وہ اشعار جن سے لطفِ غزلیت نہیں اُٹھتا، نمونہ کے طور پر ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں مگر ایسے اشعار بہت نہیں ہیں :

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردن صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں غزلیت کا کوئی مزا نہیں ہے ان سے پر تاثیری کی کیا امید کی جاتی ہے اگر ایسے ایسے اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں تو سوا فائدہ کے کوئی نقصان متصور نہیں ہے :

ناسخ

ناسخ۔ شیخ امام بخش ناسخ، زبان اردو کے مصلح گزرے ہیں اس اعتبار سے اُن کا یہ تخلص نہایت حسبِ حال ہے۔ شیخ نے اردو کو خراش تراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاحِ زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے۔ مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا۔ غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کر دی کہ اردو پر زبانِ فارسی کا شبہہ ہونے لگا۔ حضرت نے فارسی الفاظ یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اردو فارسی نما ہو گئی۔ اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظِ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اردو اُردو رہ گئی، بلکہ اگر کسی فارسی جملہ کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اردو کر کے دکھا دیا۔ مثلاً شیخ

فرماتے ہیں ؎

سوالِ وصل پر ہلنا یہ پیرو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براتِ عاشقاں بر شاخ آہو کا

لاریب زبان اردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے، اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی صورت پیدا نہ ہوتی۔ بہر حال اب دیکھنا چاہیئے کہ شیخ کی طباعی سے غزل سرائی کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ شیخ کی شاعری کی شہرت مجرد غزل سرائی کی بنیاد پر ہے، کس واسطے کہ اور اصناف شاعری میں شیخ کی کوئی تصنیف ممتاز شکل نظر نہیں آتی ہے، پس شیخ کی غزل سرائی ہی اصناف شاعری سے ہے۔ جس کی نسبت رائے زنی کی حاجت ہے، واضح ہو کہ شیخ کے ہر دو دیوان کے معاینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بہ کثرت اپنی غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتا کیے ہیں یعنی ایسے مضامین کو باندھا کیے ہیں جن کو عالم خارج سے تعلق ہے۔ اسی وجہ سے شیخ کا رنگ درد۔ میر۔ مومن اور غالب سے تمامتر علیحدہ ہے شیخ کی غزل سرائی ذوق کے رنگ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی ہے اس لئے کہ ذوق بیشتر داخلی اور خارجی شاعری کی آمیزش کے ساتھ غزل سرائی کرتے تھے۔ ان کا رنگ خالص خارجی نہ تھا۔ شیخ کی غزل سرائی تو ایسے دکھائی دیتی ہے کہ سو شعر میں کہیں ایک شعر داخلی رنگ رکھتا ہے اور باقی اشعار پورے طور پر خارجی پہلو رکھتے ہیں یعنی باقی اشعار کے مضامین اشیائے موجودہ فی الخارج سے کہ عبارت عالم مادی سے ہے تعلق رکھتے ہیں اور واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اس میں شک نہیں کہ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے شیخ کو شاعری کا ایک ایسا میدان وسیع ہاتھ آگیا جس میں غزل سرائی کی حیثیت سے درد۔ میر۔ مومن اور غالب نے

کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ پس شیخ کے سے بلند فکر، عالی دماغ شاعر نے جو ایسے میدان میں قدم رکھا تو غزل سرائی کا دائرہ تنگ، بہت وسیع ہو گیا۔ چنانچہ وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ہو گئے جو درحقیقت احاطۂ غزل سے باہر ہیں یعنی شیخ نے اُن خیالات کو زبردستی کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل کر دیا۔ جو قصیدہ و قطعہ وغیرہ کے لیئے مخصوص ہیں لیکن اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کہ ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس پر نہ قصیدہ گوئی اور نہ غزل سرائی دو میں سے کوئی تعریف صادق نہیں آتی ہے واقعی بہت خوب ہوتا اگر شیخ اپنی حیرت انگیز قوت شاعری کو اور کسی صنف شاعری میں صرف فرماتے اور غزل سرائی کے حدود کو ورد۔ میر، مومن اور غالب کی حدود بندی پر قائم رہنے دیتے۔ بخیال راقم غزل سرائی کا احاطہ وسعت پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے اس واسطے کہ اس صنف شاعری میں خارجی مضامین داخل نہیں کیئے جا سکتے۔ ایسے مضامین کے دخل پانے سے غزلیت جاتی رہتی ہے۔ کبھی خارجی مضامین سے حافظ یا میر کی غزل سرائی کا لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے ضرور ہے کہ کلام میں صائب یا ناسخ کا رنگ آ جائے۔ جو غزل سرائی کے اعتبار سے مرغوب و محبوب نہیں ہے یہی سبب ہے کہ اکثر با مذاق حضرات صائب اور ناسخ کی غزل سرائی کو بے لذت کہتے ہیں اور کھلے ڈُلے طور پر کہہ جاتے ہیں کہ ان دونوں کے کلام سیٹھے ہیں اور امر حق بھی یہی ہے کہ جب واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین باندھے نہ جائیں گے تو کلام میں ضرور بیٹس محسوس ہو گا اور یہ امر بیّن طور پر تقاضائے غزل گوئی

کے محض خلاف ہے، بہر کیف شاعری کے اعتبار سے لاریب شیخ بڑے طباع اور خلاق سخن تھے۔ اُن کی نازک خیالی اور بلند پروازی نادر انداز رکھتی ہے۔ کلام میں بلاغت فصاحت کے ساتھ شیر و شکر ہو رہی ہے دونوں دیوان جواہر مضامین کے معدن ہیں علاوہ اُن خوبیوں کے اُن کے کلام پُر از متانت و جلالت۔ شوکت حشمت تہذیب و وقار نظر آتے ہیں۔ شیخ علی العموم غزلیں بسیر لکھتے ہیں۔ دشوار دشوار مضامین کو آسانی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں، ان کے لفظوں کی نشست عقد مروارید کا حکم رکھتی ہے مگر ان وصفوں کے ساتھ تشبیہ کو اُسی افراط کے ساتھ کلام میں دخل دیتے ہیں جیسا کہ غالب کی غزلوں میں استعارہ کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں اس پر بھی کبھی کبھی پھبتی کا انداز پیدا کرتی ہیں اوّل تو کثرت تشبیہ سے اعلیٰ درجہ کی غزل سرائی مستغنی ہے۔ پھر جب تشبیہ پھبتی کی پستی کو پہنچ جاتی ہے تو اُس سے اغراض غزل سرائی میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی اسی طرح مبالغہ پردازی کی طرف بھی میلان شیخ پایا جاتا ہے اور جب مبالغہ پردازی درجۂ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے تو شیخ سے فطرت کی راہ چھوٹ جاتی ہے اس وضع کے معائب غزل سرائی کے ساتھ شیخ ناسخ بلا گفتگو اُستاذ الاُستاذ مانے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں، حضرت کے ایک بڑے نامور شاعر ہونے میں کسی صاحب عقل و تمیز کو گفتگو نہیں ہو سکتی۔ شیخ کی ذات پر لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان کا فخر و مباہات کرنا بجا ہے۔ در اہل فن جو کچھ اس یگانۂ روزگار کو عزت و توقیر کے ساتھ یاد فرمائیں درست ہے۔ ذیل میں ایک غزل شیخ کی نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے؛

غزل ناسخ

سبزۂ خط گورے گالوں پر نمایاں ہو گیا
یاسمن زار صباحت سنبلستاں ہو گیا

آگیا مجھ کو جو اس زلف پریشاں کا خیال
دم میں مجموعہ عناصر کا پریشاں ہو گیا

تنگیِ محفل کی دولت بھڑ کے بیٹھا مجھ سے یار
رات اہل بزم کی کثرت کا احساں ہو گیا

منہ لگاتے ہی نئے قلیاں بنی ہے نے شکر
دود تنباکو نسیم باغ رضواں ہو گیا

ہو کے خم تسلیم کرتے ہی کیا مجھ کو شہید
قد ترا ظالم کماں تیر مژگاں ہو گیا

خود بخود ہوتا ہے پرزے اڑتے ہی فصل بہار
یاں گریباں اے جنوں گل کا گریباں ہو گیا

اس قدر مضمون ترے دست حنائی کے لکھے
جو قلمدان میں قلم تھا شاخ مرجاں ہو گیا

چاند چھپتا ہے جو دن ہوتی ہے مشتاق خلق
ہو گئی قدر اُس کی جو نظروں سے پنہاں ہو گیا

بعد مردن بھی ہے باقی مجھ سے خوش چشموں کو ضد
سبزۂ تربت چراگاہ غزالاں ہو گیا

پاؤں بھی اب اے جنوں کم دیجیے کانٹوں کے نذر
سر تو مدت سے نیاز سنگ طفلاں ہو گیا

ہو گیا وہ مصر ہے جس شہر میں تصویر یار
جس کنوئیں کو اس نے جھانکا چاہ کنعاں ہو گیا

ہم وہ مجنوں ہیں کہ جو خورشید رو آیا نظر
صبح ساں اپنا دہن چاک گریباں ہو گیا

مشتعل ایسے ہیں اس کے دست نازک خود بخود
طائر رنگ حنا بھی مرغ بریاں ہو گیا

سر اٹھا کر جو چلا اُس دشت وحشت خیز میں
پار تلووں سے وہیں خار مغیلاں ہو گیا

شمعیں کافوری جلاتے تھے سو اُن کی گور پر
دیدۂ غول بیاباں سے چراغاں ہو گیا

کوئی دم پیری بھی اپنی ہے بسان صبحدم
مثل شب عہد شباب آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

کیوں سلاطینِ زمانہ آ گئے ہیں یاد پھر
تختۂ تابوت جب تخت سلیماں ہو گیا

ہر سحر سن کر ترے مجنوں کا غل کہتی ہے خلق
چاک کیا صبح قیامت کا گریباں ہو گیا

سرکشی کرتے ہیں مجھ سے جو کہ ہیں پامال خلق
شیر قالیں بھی مجھے شیر نیستاں ہو گیا

یار کے جاتے ہی بھر آئے مری آنکھوں میں اشک
جوش تاروں کا ہوا خورشید پنہاں ہو گیا

رشک جو آتا ہے ناسخ بخت بلبل پر مجھے
جب کھلا غنچہ مرا ٹکڑے گریباں ہو گیا

اہل دانش پر ہویدا ہے کہ غزل بالا کے تمام اشعار خارجی پہلو کے ہیں۔ ایک شعر بھی داخلی رنگ نہیں رکھتا ہے۔ پس جس غزل میں داخلی رنگ کا فقدان ہو تو اس میں واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین موجود نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح شیخ کی اکثر غزلیں تمام تر خارجی رنگ رکھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی کوئی غزل نظر سے نہ گزری جو درد، میر، مومن یا غالب کے داخلی رنگ میں لکھی گئی ہو یہی سبب ہے، کہ وہ حضرات جو غزل سرائی کے تقاضوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ شیخ کی غزل سرائی کو پسند نہیں فرماتے ورنہ شاعری کے اعتبار سے شیخ کی شاعری بڑی خلاقی سخن نازک خیالی اور بلند پروازی سے خبر دیتی ہے۔ اور درحقیقت شیخ کی شاعری ایسی ہی رفیع و جلیل ہے کہ ہر قدر شناس سخن اس کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ فقیر کو اکثر یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش شیخ کی قابلیت شاعری اور کسی صنف شاعری میں صرف ہوئی ہوتی۔ جیسے اس کی کوئی حاجت نہ تھی نمونہ کے طور پر دو غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک شیخ کی ہے اور دوسری غالب کی۔ ان دونوں کے معاینہ اور موازنہ سے ظاہر ہو گا کہ کس کا رنگ خارجی اور کس کا داخلی ہے ؛

غزل ناسخ

ششدر سا رہ گیا ہوں در یار دیکھ کر
دیوار بن گیا ہوں میں دیوار دیکھ کر

اک برہمن کے عشق میں ہے آنسوؤں کا تار
سبحہ نکالی ہم نے بھی زنار دیکھ کر

کیفیتیں جو خم میں ہیں زمزم میں وہ کہاں
بھولا ہے کعبہ خانۂ خمار دیکھ کر

کیا اشک سادہ موسم گل میں بہاؤں میں
روؤں لہو وہ پھول سے رخسار دیکھ کر

سوکھا ہوں غم سے مثل عصائے کلیم میں
وہ اژدہائے گیسوئے خمدار دیکھ کر

زنجیر زلف یار کی تاثیر دیکھنا
دیوانے روز ہوتے ہیں دو چار دیکھ کر

پھینکا ہے دور تیر کو غصہ سے یار نے
رخسار کی طرف لب سوفار دیکھ کر

زلفیں نظر جو آئیں تو الجھی ہے نزع کی
جینے سے تنگ ہوں دہن یار دیکھ کر

پریاں تمام تخت سلیمان کو بھول جائیں
اے جانِ جان ترا یہ ہوا دار دیکھ کر

زنجیر سمجھے سنبل پیچاں کو ہجر میں
وحشت زیادہ ہو گئی گلزار دیکھ کر

ناسخ ہو جائے سرمہ سیاہی حروف کی
روشن ہوں آنکھیں نامۂ دلدار دیکھ کر

غزل غالب

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ارباب رائے دونوں اُستادوں کے کلاموں کو موازنہ فرمائیں۔ تجویز ظاہر ہو جائے کہ غزل سرائی کے لئے داخلی شاعری کی کس قدر حاجت ہے۔ فقیر کی دانست میں خارجی شاعری سے غزل سرائی کے اغراض کا پورا ہونا ناممکنات سے ہے حضرت ناسخ حضرت غالب سے قابلیت شاعری میں کبھی کم نہیں ہیں۔ مگر خارجی پہلو برتنے کے باعث اُن کی غزل غزلیت کا مزہ نہیں دیتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خارجی رنگ کی غزل سرائی داخلی رنگ کی سرائی کی سی تاثیری کا لُطف دکھائے۔ مثالاً راقم دو غزلیں اور بھی درج ہذا کرتا ہے اُن میں ایک اُستاد ذوق کی اور دوسری غالب کی۔ غزل سرائی میں داخلی رنگ کو خارجی رنگ پر کیا غلبہ ہوا کرتا ہے وقت موازنہ اہل انصاف پر روشن ہو جائے گا۔

غزل ذوقؔ

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھا تا گریہ ہے گر سوز دل کو آب تو دے
اور آگ میں یوں ہی جینا ہے گر عذاب تو دے

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس
ذرا دکھا اسے تو چشم نیم خواب تو دے

دل برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے میخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزہ شراب تو دے

کہاں بجھی ہے تہ خاک میری آتش دل
کہو ہوا سے ہلا دامن سحاب تو دے

تمہارے مطلع ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقت انتخاب تو دے

در رقیب ہے دربان نہ بند کر در یار
دعائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

صبا بگولہ بنے کشتگان زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا ٹھہرنے تہ تیغ اضطراب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا
تسلی آ کے مجھے وقت اضطراب تو دے

شکار بستۂ فتراک کو ترے مقدار
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سر رکاب تو دے

نشہ میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دل شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہو گا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ شراب تو دے

بلا سے کم نہ گریہ سے میرا سوز جگر
بجھا پر اُن کی ذرا آتش عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشت خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اک بار آگ داب تو دے

کریگا قتل وہ اے ذوقؔ تجھ کو سرمہ سے نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہوں گا سرِ منزلِ فنا اے ذوقؔ
مثالِ نقشِ قدم کرنے پا تراب تو دے

غزل غالبؔ

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اہلِ انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ استاد ذوقؔ کی غزل کس قدر طولانی ہے مگر چونکہ از مطلع تا مقطع خارجی رنگ رکھتی ہے۔ کسی طرح کا حسبِ مراد اثر دل پر پیدا نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے غالبؔ کی غزل ہے کہ نہایت ہی مختصر ہے مگر داخلی رنگ رکھنے کے باعث کس قدر پُر اثر ہے اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل سرائی میں شاعر کو داخلی پہلو برتنے کی کس قدر حاجت ہے بغیر داخلی پہلو برتے غزلیت کا لطف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اُستاد ناسخؔ نے غزل سرائی میں خارجی پہلو کو اختیار کیا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی غزلوں میں دلچسپی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن کہیں کہیں اشعار داخلی رنگ کے شیخ کی غزلوں میں جو نظر آتے ہیں تو اُن سے طبیعت

کو حظ اُٹھتا ہے۔ ایسے اشعار بہت نہیں ہیں۔ بہر حال کچھ ایسے اشعار ذیل نذر ناظرین ہوتے ہیں ؛

اشعارِ ناسخ

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں — ہم سرِ زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں

کون تھا صیدِ وفادار کہ اب تک صیاد — بال و پر اس کے ترے تیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت — ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

دِل میں پوشیدہ بت عشق بتاں رکھتے ہیں ” — آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے — کہنے کو شمع کے مانند زباں رکھتے ہیں

مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس — ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

طائرِ روح کو کر دیتے ہیں کیونکر بسمل — تیر رکھتے ہیں پر ابرو نہ کماں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد پڑی جب کہ حسینوں پہ نظر — یہ عجب گل ہیں کہ تاثیر خزاں رکھتے ہیں

بھا گئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ — نہ کمر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں

عوضِ ملکِ جہاں ملکِ سخن ہے ناسخ — گو نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

اُڑ کے ساتھ یہ مشتِ غبار لیتا جا ” — ہمیں رکاب میں او شہسوار لیتا جا

مقابل اُنکی آنکھوں کے آہو ہو نہیں سکتا ” — انہیں کے آگے جادوگر سے جادوگر ہو نہیں سکتا

لہو سارے بدن کا کر دیا ہے خشک فرقت نے — مگر اے آہ تجھ سے خشک آنسو ہو نہیں سکتا

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی — عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

حضراتِ سخن داں پر روشن ہے کہ اشعارِ بالا کسی قدر داخلی رنگ رکھتے ہیں

جس کے باعث فی الجملہ ان میں دلچسپی پائی جاتی ہے مگر ان میں بہت اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ کے مضامین نہیں ہیں۔ درد یا میر کے انداز کلام تک نہیں پہنچتے ہیں آخر میں شیخ کی غزل سرائی کی نسبت قابل لحاظ ایک اور بات بھی گزارش کی جاتی ہے کہ علاوہ فصاحت و بلاغت کے شیخ کا کلام بپاز تہذیب دیکھا جاتا ہے کوئی شعر ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے کچھ بھی کوچہ گردی کی بو نکلتی ہو۔ شیخ کبھی فسق و فجور کے مضامین نہیں باندھتے، کوئی مضمون عشق ایسا حوالہ قلم نہیں فرماتے جو محض حسینان بازاری سے تعلق رکھتا ہو ۔ ظاہر ہے کہ حسینان بازاری زنہار اس قابل نہیں ہیں کہ عشق ایسے پاک امر کے ساتھ یاد کیے جائیں کوئی صافی طینت اور پاک فطرت آدمی کسی حسین بازاری کے ساتھ تعلق عشق نہیں رکھ سکتا ہے پس شیخ کا اجتناب ایسے مضامین کی بندش سے جو تقدس و طہر پاکبازی کے خلاف ہوں بہت کچھ قابل احترام ہے اس جگہ ایک مطلع حضرت کا عرض کیا جاتا ہے۔ جس میں ایک بڑی تعلیم ملحوظ رہی ہے، خاص کر حضرات نوجوان کو اسے گوش دل سے سننا چاہیئے :

اہل حرفہ جو ہیں بت اُن کا خریدار نہ ہو ۔۔۔ جو ترا سود اکہیں لائے ل سر بازار نہ ہو

واقعی اس شعر میں بڑی قومی اصلاح مدنظر رہی ہے یہ اُن اقسام اشعار سے ہے۔ جو لے تنہا مفید معاشرت ہیں :

آتش

خواجہ حیدر علی آتش۔ شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے، مگر چند سال تک شیخ کے بعد زندہ رہے لکھنؤ میں آتش بھی ناسخ کی طرح شاعر مسلم الثبوت مانے جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی غزل سرائی دونوں

شاعران گرامی کے اجتہادات کی ممنون ہے شیخ اور خواجہ کے وقت سے جتنے ممتاز غزل سرا لکھنؤ میں گزرے ہیں۔ یا ماشاء اللہ اس وقت موجود ہیں انھیں دونوں اُستادوں کی پیروی کرنیوالے نظر آتے ہیں دونوں استادوں کے بڑے بڑے نامی گرامی شاگرد گزرے ہیں۔ جن کے دوادین چھاپ ہوکر مختلف دیار میں شائع ہوتے گئے ہیں خواجہ اور شیخ میں شاعرانہ مقابلہ ہوا کرتا تھا اور بڑے بڑے مشاعرے ان دونوں بزرگواروں کے دم سے قائم ہوتے تھے۔ شہرت شاعری میں خواجہ شیخ سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ شیخ کے نام کے ساتھ خواجہ کا نام بھی آج تک السنۂ خلائق پر جاری ہے۔ خواجہ کے دونوں دیوانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بھی شیخ کی طرح اکثر غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتتے تھے، یہ وہی رنگ ہے جس کے پابند جمیع متغزلین لکھنؤ نظر آتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی غزل سرائی کا فرق یہی ہے کہ اُستادان دہلی بیشتر غزل سرائی میں داخلی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اُستادان لکھنؤ اس کے برخلاف کاربند ہوتے ہیں یہی ایک امر البباہے جس نے ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کو دو شئے بنا رکھا ہے، جاننا چاہیئے کہ اس امر کی واقفیت پر سخن فہمی کا مدار ہے۔ بے اس امر کی دانست کے نہ ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کا فرق سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ کسی غزل گو کے حسن و قبح کلام سے خبر ہو سکتی ہے ذیل میں ایک غزل خواجہ صاحب کی درج کی جاتی ہے جس سے خواجہ صاحب کا مذاق غزل سرائی ظاہر ہوگا۔ اسی زمین میں ایک غزل غالب کی بھی ہے جو پہلے نذر ناظرین ہو چکی ہے وقت مقابلہ اہل بینش پر روشن ہو جائے گا کہ خواجہ کی غزل خارجی پہلو اور غالب کی غزل داخلی پہلو رکھتی ہے +

غزل آتش

خشمگیں آنکھیں تمھاری آفت جاں ہو گئیں
برچھیاں عاشق کشی کو نیزۂ مژگاں ہو گئیں

تم جو جا نکلے نسیم نو بہاری کی طرح
پھول کھل کھل کر گل و لالہ کی کلیاں ہو گئیں

اے صبا دامن ہے تیرا اور مجھ مجنوں کا ہاتھ
اس پری رو کی اگر زلفیں پریشاں ہو گئیں

لیتے ہیں نگار رخسارہ زیبا سے یار
صورت آئینہ آنکھیں اپنی حیراں ہو گئیں

مہندی ہاتھوں میں ملی تو نے جو اے دریائے حسن
انگلیاں رنگ حنا سے شاخ مرجاں ہو گئیں

مستی سے نیزۂ مژگاں بنایا لائے یار
وہ بھویں اپنی کجی سے تیغ عریاں ہو گئیں

خانۂ دل میں تصور خوش جمالوں کا رہا
گاہ حوریں گاہ پریاں اپنی مہماں ہو گئیں

کوچہ گردی میں دکھائی تیغ قاتل نے بہار
بسملوں سے شہر کی گلیاں گلستاں ہو گئیں

دیدۂ عاشق سے دیکھا جس نے دیوانہ ہوا
حسن سے پریاں بلائے جان انساں ہو گئیں

اے مراد دل ترے کوچہ میں رکھتے ہی قدم
حسرتیں جو کچھ کہ تھیں گرد پریشاں ہو گئیں

یہ کھلا آتش عناصر سے دل دیوانہ کو
چار دیواریں اٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں

دونوں غزلوں کے موازنہ سے ظاہر ہوگا کہ غزل سرائی کے لیے داخلی پہلو کی کس قدر حاجت ہے۔ جناب آتش مرزا اسد اللہ خاں غالب سے قابلیت شاعری میں کبھی کم نہ تھے مگر خارجی پہلو اختیار کرنے سے خواجہ کی غزل حسب مراد تاثیر نہیں پیدا کر سکی خیال راقم خواجہ کی نسبت یہ ہے کہ اگر وہ دہلی وطن ہوتے تو تقاضائے ملکی سے اُن کی غزل سرائی بھی قرینہ غالب زیادہ داخلی رنگ کی ہوتی۔ پس ایسی

صورت میں وہ یا درد دبیر کے جواب ہوتے یا مومن اور غالب کے ہمسر یا اُن دونو سے بھی بہتر غزل سرا نکلتے۔ خواجہ کی فطری صلاحیت بڑے اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ شیخ ناسخ اپنا رنگ جما چکے تھے، خواجہ کو تقاضائے زمانہ سے بہت کچھ ملکی رنگ کو اختیار کرنا پڑا۔ ہزار افسوس کہ خواجہ کو داخلی پہلو کے اختیار کرنے کا موقع نہ ملا۔ ورنہ غزل سرائی کا رتبہ بہت اعلیٰ ہو جاتا۔ بہرکیف اس خارجی رنگ کے ساتھ بھی خواجہ کے کلام میں ایسی بات ہے کہ شیخ ناسخ کو باوجود بڑی طباعی اور خلاقی سخن کے حاصل نہیں ہے۔ شیخ صاحب کے اکثر اشعار تشبیہ اور مبالغہ سے مملو ہیں اور اکثر اشعار کی ترکیب یہی ہوتی ہے کہ پہلے مصرع میں دعوی ہوتا ہے اور دوسرے میں دلیل خواجہ صاحب بھی ملکی مذاق کے تقاضے سے بیشتر اسی رنگ کے اشعار فرما گئے ہیں مگر طبیعت کی رنگینی شوخی اور برجستگی سے ان کے اشعار میں شیخ کے اعتبار سے کچھ غزلیت کا ایسا انداز پیدا ہو جاتا ہے جس سے دل کو فی الجملہ غزل سرائی کی لذت نصیب ہو جاتی ہے لیکن شیخ کے رنگ سے علیحدہ ہو کر جب حضرت خواجہ لطف طبیعت دکھاتے ہیں تو اُن کی غزل سرائی احاطہ تعریف سے باہر ہو جاتی ہے ذیل میں ایک غزل درج ہذا کی جاتی ہے جو خواجہ کے اصلی رنگ طبیعت سے خبر دیتی ہے

غزل آتش

تار تار پیرہن میں بس رہی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

چیز رنگیں کوئی دیوان رنگیں ہے مگر
حسن مطلع ہے جبیں مطلع ہی صاف ابروئے دوست

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے کبھی گیسوئے دوست

دُور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا — آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست
واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا — پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے موئے دوست
داغ دل پر خیر گذرے تو غنیمت جانئے — دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست
دو مرینگے زخم کاری سے تو حسرت ہے ہزار — چار تلوار دیں شل ہو جائے گا بازوئے دوست
فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب — خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست
یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم — جب اُڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

واقعی خواجہ صاحب جب داخلی رنگ اختیار فرماتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھاجاتے ہیں درحقیقت یہ غزل ایسی ہے کہ اغراض غزل سرائی کو پورا کرنے والی ہے سبحان اللہ! کیا کہنا ہے ایک غزل ہزار دیوان کا جواب ہے، ظاہر ہے کہ اس غزل کے اکثر اشعار ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے تعلق رکھتے ہیں بلاشبہ خواجہ کا اصل رنگ یہی ہے اور اسی رنگ کی بدولت خواجہ کی شہرت تمام اُن دیار میں ہے جہاں اُردو بولی جاتی ہے حضرت خواجہ کی غزل سرائی پر نظر ڈالنے سے بہت سی خوبیاں بین طور پر عیاں ہوتی ہیں اول لطف زبان ایسا ہے کہ کس منہ سے کوئی اُس کی تعریف کرے۔ دوم۔ محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتی سوم اکثر اعلیٰ درجہ کے مضامین بندش پاتے ہیں چہارم مضامین شوخی اور بانکپن سے خالی نہیں ہوتے، پنجم اکثر مضامین فقر و آزاد مزاجی سے خبر دیتے ہیں کیوں نہ ہو خواجہ آدمی بڑے فقیر طبیعت تھے، مال و منال کی انھیں کوئی پروا نہ تھی، نہایت

بے طمعی لاپروائی اور سیرچشمی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، چنانچہ اپنے حسبِ حال فرماتے ہیں ؎

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مردِ فقیر ۔۔۔ شیر کی کھال بھی ہے قاقم و سنجاب مجھے

ششم کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے۔ غزل گوئی کے لیئے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے ورنہ اشعار میں جلالت و متانت کی صفتیں حاصل نہ ہوں گی حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب ایک وقت میں کسی لشکر سے متعلق تھے۔ جب پیشۂ سپہگری کو چھوڑا راہ فقر اختیار کی۔ تارک دنیا ہو کر غزل سرائی کی طرف مائل ہوئے پھر اپنی فطری صلاحیت کی بدولت اس صنعت شاعری کے ایک مستند اُستاد ہو گئے المختصر خواجہ صاحب میں وہ سب خوبیاں مودعہ تھیں جو ایک بڑے شاعر کے لئے درکار ہیں۔ حضرت افعال اور اقوال سے تمامتر شریف تھے کوئی بات خواجہ میں ایسی نہ تھی۔ جو اُن کی عظمت و جلالت کی کمی کا سبب قیاس کی جا سکے، شجاعت سخاوت مروت۔ فصاحت۔ سیرچشمی۔ خوش اخلاقی، پاکبازی کے مجمع تھے نامشروع امور سے اجتناب رکھتے تھے اور تادم آخر ان صفات کے ساتھ متصف رہے حضرت کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا ۔۔۔ نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

یہ شعر تو ایسا شرح طلب ہے کہ اس کیلئے عالم سے عالم اور عارف سے عارف شارح کی ضرورت ہے۔ سبحان اللہ کتنا بڑا مضمون کس آسانی کے ساتھ اور کیسے پیرایہ شاعری میں بیان ہوا ہے واقعی اگر خواجہ بہت بڑے طبیعت دار نہ ہوتے تو ایسے شعر کے موزون کرنے پہ قادر نہ ہو سکتے۔ اس شعر سے کس قدر نازک خیالی بلند

پردازی اور عالی مذاقی ظاہر ہے ؎

• ظہور آدم خاکی سے یہ مجھ کو یقین آیا — تماشہ انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا

• خدا ایسے تو سودا دے تمہاری زلف پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

• چمن میں نکلو جو وہ شوخ بے نقاب آیا — یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا

اسیر ہونے کا اللہ رے شوق بلبل کو — جگایا نالوں سے صیاد کو جو خواب آیا

شب فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا — جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا

چکور حسن مہ چاردہ کو بھول گیا — مراد پہ جو ترا عالم شباب آیا

ہماری قبر سے آٹھے گی یہ صدا تا حشر — یہ مردہ آیا کہ مجھ پر کوئی عذاب آیا

عدم میں ہستی سے جا کر یہی کہوں گا میں — ہزاروں حسرت زندہ کو گاڑ داب آیا

محبت مے و معشوق ترک کر آتش — سفید بال ہوئے موسم خضاب آیا

• غضب ہے جانکو پہلو میں ہونا دل سے دشمن کا — محل خوف ہے ہمسایہ قصاب برہمن کا

جو سویا ساتھ بھی قاتل تو خنجر درمیاں رکھ کر — ہمارے اس کے پردہ رہ گیا دیوار آہن کا

بہ خوش اسلوب جسم اس نوجوان کا ہے جو نا ہیں تو — برابر نکلے ڈورا اس کمر کا اور گردن کا

جبیں افشاں جو پیشانی پہ اس کے چاندنی چھٹکی — ملی مسی تو آئینہ میں پھولا تختہ سوسن کا

ڈراتا ہے کسے اے شیخ تو نار جہنم سے — سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

وحشت دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا — سینکڑوں کوس نہیں صورت انساں پیدا

دل کے آئینہ میں کر جوہر پنہاں پیدا — در و دیوار سے ہو صورت جاناں پیدا

• فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا — خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک — نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

گئے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب   زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ • ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

عاشقِ شیدا علی مرتضیٰؑ کا ہو گیا   دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا

قربِ حق حاصل ہے اس کو جو عارف ہے وہی   یا علیؑ رہبر وہ جو تجھ سے پیشوا کا ہو گیا

ساختہ پرداختہ تیری ہے ساری کائنات   حکمِ حضرت سے وجودِ ارض و سما کا ہو گیا

وقتِ مشکل میں کہا جس وقت یا مشکل کشا   سہل چھٹکارا گرفتارِ بلا کا ہو گیا

کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے   کعبہ پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہو گیا

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں • در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

اسے جاں کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے • ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

برہمن آنکھوں کو ملتا ہے جو پائے بت پر • رشک آتا ہے مجھے سنگِ درِ یار نہ ہو

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا • زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں • گریباں پھاڑ کر چل بیٹھیے صحرا کے دامن میں

باغِ جہاں میں گل کی قناعت پہ جائیے رشک • عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

چلے تو سیر کو ہیں آپ مستی مِل کے گلشن میں • اشارے کیسے کیسے ہوں گے نافرمانِ سوسن میں

یہ سودا ہے شہادت کا ہمارے سر کو اے قاتل   تری تلوار کا دم بھرتی ہر رگ ہے گردن میں

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو   نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

طریقِ عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گزرے گا   گریباں میں بجھی ہے جب لگی ہے آگ دامن میں

جنوں کے جوش میں یکجا نہیں دم بھر قرار آیا   کبھی گلشن سے صحرا میں کبھی صحرا سے گلشن میں

عذابِ گور کا واں سامنا یاں رنج دنیا کا   نہ گھر میں چین زندوں کو نہ مردوں کو ہے مدفن میں

شریف کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اے آتش ۔ بتوں کے گھورنے کو جاتے ہیں دیر برہمن میں

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں • دعائے مغفرت میرے لئے جلاد کرتے ہیں

قفس میں جسم کے مرغ دل اپنا سر پٹکتا ہے ۔ کسی پازیب کے نالے کہیں فریاد کرتے ہیں

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو ۔ طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

نہ خود آتے ہیں میت پر نہ اذن دفن دیتے ہیں ۔ وہ گھر بیٹھے ہوئے مٹی مری برباد کرتے ہیں

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے • ہوائے گل میں ہم کس وادی پرخار میں آئے

اٹھائے بار عشق اس عالم غدار میں آئے ۔ کہاں سے ہم کہاں پکڑے ہوئے بیکار میں آئے

شیشے شراب کے ہیں آٹھوں پہر کھلے • ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابر تر کھلے

رنگریز کی دکاں میں بھرے ہوں ہزار رنگ ۔ طرہ وہ ہے جو یار کی دستار پر کھلے

حیوان پر آدمی کو شرف نطق سے ہوا ۔ شکر خدا کرے جو زبان بشر کھلے

کٹ جائے وہ زباں نہ ہو جس سے دعائے خیر ۔ پھوٹے وہ آنکھ جو کہ نہ وقت سحر کھلے

کوتہ ہے اس قدر کے قدر پر ردائے عیش ۔ ڈھانکو جو پاؤں کو تو یقیں ہے کہ سر کھلے

فصل بہار آتی ہے چلتا ہے دور جام ۔ مغ کی دکان شام کھلے یا سحر کھلے

مطلب نہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر ۔ دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

چلنا پڑے گا یار کی خدمت میں سر کے بل
سمجھے ہو کیا جو بیٹھے ہو آتش کمر کھلے

اشعار بالا سے خواجہ صاحب کی غایت طبیعت داری کا اندازہ ہویدا ہے زبان کے اعتبار سے اُن کی زبان شیخ صاحب کی زبان سے زیادہ دلفریب ہے مگر اصلاح زبان کی حیثیت سے شیخ صاحب کا درجہ ارفع اور اعلیٰ ہے، شیخ صاحب کو لغات

کی طرف بہت توجہ تھی حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب کی زبان، زبان سوقی سے خس بھر بھی تعلق نہیں رکھتی ہے، ان کی زبان میں غلط العام کا نشان نہیں ملتا ہے اور انصاف یہی ہے کہ خواجہ صاحب کی زبان صحتِ لغات کے اعتبار سے شیخ صاحب کی زبان کو نہیں پہنچتی ہے۔ مگر خواجہ کی زبان کا حسن ایسا ہے کہ چند غلط العام شکلیں جو اُن کی بعض غزلوں میں دیکھی جاتی ہیں وہ چہرۂ زیبا میں خال کا حکم رکھتی ہیں ؛

رندؔ : نواب سید محمد خان رندؔ حضرت آتشؔ کے شاگرد تھے، اُن کی غزل سرائی قابل لحاظ ہے شستگی زبان خوبی بندش صفائی کلام روانی طبع پختگی مضامین کی صفتیں اِس درجہ تمامی دیوان میں آشکارا ہیں کہ جس غزل کو جہاں سے پڑھیئے یہ صفتیں اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ شروع سے آخر تک دونوں دیوانوں کا ایک رنگ ہے ہر شعر یہ کہتا ہے کہ میں رندؔ کے نتائج افکار سے ہوں یہ بات تو خواجہ صاحب کی غزل سرائی میں بھی نہیں دیکھی جاتی ہے، کس واسطے کہ سیکڑوں شعر حضرت خواجہ کے ایسے ہیں جو شیخ صاحب کا رنگ رکھتے ہیں اور اُن کے ذاتی رنگ سے تمامتر علیحدہ ہیں ایک اور خوبی بھی رندؔ کی غزل سرائی میں یہ ہے کہ اُن کی غزلیں بہت سیر ہوا کرتی ہیں۔ واضح ہو کہ رند برخلاف اپنے ملی رنگ کے بیشتر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں اسی لئے اُن کی غزلیں غزلیت کا مزہ دیتی ہیں اگر اُن کے کلام خستگی برشتگی، سوز گداز، بشریت درد متانت جلالت وغیرہ کے مواد حسب مراد ہوتے تو اُن کو دردؔ۔ میرؔ۔ اور غالبؔ کے ساتھ ہمسری حاصل ہوتی۔ خیر اس پر بھی جیسی اُن کی غزل سرائی ہے۔ نہایت غنیمت ہے۔ اور ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہے ذیل میں کچھ کلام حضرت رندؔ کے نذر ناظرین ہوتے ہیں :—

غزل نمبر ۱

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست تنا سا تیرا

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا
تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں حقا تیرا

عقل کیا دخل کرے کنہ حقیقت میں تری
حوصلہ لیست مرا مرتبہ اعلا تیرا

راہ میں اس کی جو ثابت قدمی ہو تجھ سے
سجدہ گہ جانے ملک نقش کف پا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا

تو ہی نے اُس کو بنایا ہے ید قدرت سے
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے درد اے دوست
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا

میں بھی دیکھوں گا دکھا مجھ کو تجلائے جمال
میں بھی شائق ہوں صنم صورت موسیٰ تیرا

آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجلائے جمال
عالم نور ہے اے حور سراپا تیرا

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

پاکدامانی میں تیری نہیں پڑنے کا خلل
اپنے مشتاقوں سے ناحق ہے یہ پردا تیرا

تجھ سے بیزار ہوں جاتا ہوں سوئے ملک عدم
منہ نہ دکھلائے خدا پھر مجھے دنیا تیرا

عاشق روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جان جاں رند ہے دیوانہ و شیدا تیرا

سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے یہ حمد نگاری اور اس کے ساتھ یہ غزلیت آفرین صد آفرین، مرحبا صد مرحبا۔ کیا پر تاثیر کلام ہے، شاعر کی حقیقت دل کا آئینہ

اور حقیقت آگاہوں کے لیئے تماشا گاہ حیرت ہے ایسی لاجواب غزل ہے کہ اگر بزم عشق میں پڑھی جائے تو عاشقوں کی بے قراری کو بڑھاوے اور اگر مسجد میں سنائی جائے تو عابدوں کی توفیق عبادت میں ترقی پیدا کرے

غزل نمبر ۲

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا

روئے بستہ بھی اب کھل نہیں سکتی ہم سے
باندھ لاتے تھے کبھی شیر نیستاں جیتا

گرد کلفت میں دبا جاتا ہے میرا تنِ زار
گاڑ دیگی مجھے کیا گردشِ دوراں جیتا

بندگی کرتا غلاموں کی طرح سے تیری
آج کے دن نہ رہا یوسف علیہ السلام کنعاں جیتا

جس کی دعوت کی زمانے نے دیا زہر اُسے
اس کے گھر سے نہ پھرا ایک بھی مہماں جیتا

پیس ڈالے گی یہ اک ایک کو چکی کی طرح
کوئی بچنے کی نہیں گردشِ دوراں جیتا

مرگ خوشحال ہو مری دے چکی ہو زیست جواب
تیری امید پہ ہوں عیسیٰ دوراں جیتا

آپ دانستہ کوئی کھوتا ہے نعمت اپنی
پھینک دیتا ہے کوئی توڑ کے دنداں جیتا

سخت جاں تھا جو رہا زندہ چمن سے چھٹکر
میں تو دم بھر بھی نہ اے مرغ گلستاں جیتا

چل کے اب عرض کیجئے حضرت آتش سے رند
معرکہ آپ کا یہ طفل دبستاں جیتا

غزل نمبر ۳

لالہ رویوں سے کب فراغ رہا
اک نہ اک گل کا دل پہ داغ رہا

ناز بے جا اُٹھایئے کس کے — اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا
کب مٹا عشق کا نشاں دل سے — زخم اچھا ہوا تو داغ رہا
اک نظر جس نے تجھ کو دیکھ لیا — عمر بھر در پئے سراغ رہا
یاد ہیں کس کو نہ مرے بلبل — مدتوں ہمنوائے زاغ رہا
کبھی نظارۂ چمن نہ کیا — اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

دل کو افسردگی سی ہے اے تند
سیر گل کا کسے دماغ رہا

غزل نمبر ۴

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد — میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھائے گا نہ اگر سیر بوستاں صیاد — پھڑک پھڑک کے قفس ہی میں دونگا جاں صیاد
جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد — پھرا تلاش میں میری کہاں کہاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے — وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد
اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا — الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
میں کھینچوں دام میں بلبل تو آشیانہ جلا — بہم یہ مشورہ کرتے ہیں باغباں صیاد
عجیب قصہ ہے دلچسپ اک حکایت ہے — سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیاد
نہ گل کھلیں گے نہ چہکارے گا کوئی بلبل — بہار باغ کو ہونے تو دے خزاں صیاد
ہمارے زندہ گھسیٹے گا دام میں شاید — بچھائے دانہ بچھاتا ہے استخواں صیاد
خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیسا — قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
رہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس کو شام سے لٹکا کے فرشِ خواب کے پاس
کرے گا یاد مرے زمزموں کو بعد مرے
سناؤں واقعہ اپنا تجھے تمام و کمال
ستم زیادہ نہ کر حکم دے رہائی کا
چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی
ہزار مرغِ خوش الحاں چہکتے ہیں ہر سو
میں جھانکتا نہیں چاکِ قفس سے بھی گل کو
اسیرِ کنجِ قفس کر بہ شوق دام میں کھینچ
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
نہ ہوں گا بندِ قفس میں بھی میں وہ بلبل ہوں
درِ قفس بھی کھلے گا تو اب نہ جاؤں گا
رہا بھی ہو کے نہ بھولوں گا حقِ خدمت کو
چمن میں بلبل و قمری کا پر نہ چھوڑے گا
قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کا
عزیز رکھتا ہے کرتا ہے خاطریں میری
نکالیو نہ قدم آشیاں سے اے بلبل
وہ عندلیب ہوں جل کر کروں جو نالۂ گرم

کئی برس میں ہوا ہے مزا جداں صیاد
قفس سے اڑ کے میں اب جاؤں گا کہاں صیاد
سنا گیا مری تا صبح داستاں صیاد
ہوں چند روز ترے گھر میں میہماں صیاد
جو گوش دل سے سنے میری داستاں صیاد
پکارتے ہیں گرفتار الاماں صیاد
خدا کرے یہیں ہو جائے بے نشاں صیاد
بہ از چمن ہوا اب تو ترا مکاں صیاد
نہ ہوئے نامری جانب سے بدگماں صیاد
قضا لے آئی ہے مجھ کو کشاں کشاں صیاد
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد
ہزار تجھ کو سناؤں گا داستاں صیاد
یقیں نہ ہووے تو کر میرا امتحاں صیاد
ادائے شکر کروں گا میں ہر زماں صیاد
رہا جب آٹھ پہر گھات میں نہاں صیاد
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد
ملا ہے خوبیٔ قسمت سے قدرداں صیاد
لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد
قفس کے چاکوں سے اٹھنے لگے دھواں صیاد

مرے بیان کو سن سن کے کانپ کانپ اُٹھا ۔۔۔ غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد
الہٰی دیکھیئے کیونکر تباہ ہوتا ہے ۔۔۔ زبان دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد
سوائے شکر شکایت اگر کبھی کی ہو ۔۔۔ الہٰی قطع ہو منقار سے زباں صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رند
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

غزل نمبر ۵

دید گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل ۔۔۔ پڑ گئی جب کسی صیاد کے پالے بلبل
کان کھولے ہوئے گل گوش بر آواز ہے آج ۔۔۔ درد دل جو تجھے کہنا ہو سنا لے بلبل
پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر ۔۔۔ چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل
پہلے گلشن کی ہوا دیکھ لے رہ کر چندے ۔۔۔ آشیاں کی تو ابھی طرح نہ ڈالے بلبل
دست انداز نہ ہو گل پہ ابھی اے گلچیں ۔۔۔ صبر کر صبر ذرا باغ سے جا لے بلبل
بے اجازت میں قدم باغ میں دھرتا نہیں ۔۔۔ منتظر ہوں در گلزار پہ آ لے بلبل
ہاتھ اوراق گل آئیں تو بنا کر اجزا ۔۔۔ لکھوں رنگیں مضامیں کے رسالے بلبل
کوئی ارمان نہیں لے کے چلے باغ سے ہم ۔۔۔ دل کے جو حوصلے تھے خوب نکالے بلبل
نہ رہی بوئے وفا ایک بھی گل میں باقی ۔۔۔ اب تو اس باغ سے اللہ اٹھا لے بلبل
ہے یہ ویرانی گلشن تو عجب کیا اس کا ۔۔۔ بچہ بوم جو بیضے سے نکالے بلبل
کس طرف جائے گی برداشتہ خاطر ہو کر ۔۔۔ باغ کیوں کرتی ہے گلچیں کے حوالے بلبل
باغ تک خانۂ صیاد سے اُڑ کر آئی ۔۔۔ یارے پھر تو نے پر و بال نکالے بلبل

عہدِ طفلی سے وہ گل مائلِ عشاق رہا
طائروں کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل

دعویٰ ملک تو اثبات کرے گلچیں پر
لا کے دکھلائے گلستاں کے قبالے بلبل

دام میں پھنس کے نکلنا ترا ناممکن ہے
تا بہ مقدور پر و بال ہلا لے بلبل

درد آمیز پہنچتی نہیں کانوں میں صدا
بے اثر ہو گئے کیسے ترے نالے بلبل

دم بدم سینۂ سوزاں سے نہ کر نالہ گرم
پڑ نہ جائیں تری منقار میں چھالے بلبل

ایک دو گل سے جو تسکین نہ ہووے اس کی
باغ کا باغ ہی سر پہ نہ اٹھا لے بلبل

جس شجر پر ترا جی چاہے نشیمن کرے
پھٹ پڑینگے نہ ترے بوجھ سے ڈالے بلبل

مانگے خالق سے دعا بعد بقائے گل کی
پہلے صیاد سے خیر اپنی منا لے بلبل

نہ رہے گل ہی گلستاں میں جو تھے رتبہ شناس
اڑ گئے سب ترے پہچاننے والے بلبل

کسی غنچہ کو چھوا اور نہ کوئی گل توڑا
گھورتی کیوں ہے مجھے آنکھیں نکالے بلبل

چہچہے بند کرے گا تو یہ ہو جائے گا بند
کہہ دو گلچیں کہ زباں اپنی سنبھالے بلبل

غزل نمبر ٦

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں
اے شہِ حسن فقیروں کی دعا لیتے ہیں

توسنِ عمر نے طے منزلِ ہستی کی ہے
ہم بھی یارانِ عدم رفتہ کو جا لیتے ہیں

میرے ہمراہی مجھے چھوڑ گئے یاں ورنہ
قافلے والے تو سوتوں کو جگا لیتے ہیں

بھیجیں گے پیک بنا کر ترے پاس اے شہِ حسن
سرِ قاصد کے لئے بال ہما لیتے ہیں

سامنا لاکھ مصیبت کا پڑے پر کوئی
آسرا غیر کا مردانِ خدا لیتے ہیں

کوچۂ دوست میں رکھ پاؤں ادب سے غافل
سرکش ہیں راہ میں گردن کو جھکا لیتے ہیں

زلف پر پیچ کا مضموں نہیں بندھ سکنے کا
کیوں وبال اپنے سروں پر شعرا لیتے ہیں

حق تو یہ ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا
اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں

شور و شر کرتے یہ ہیں ہستی دو روزہ پر
آسمان اہل زمیں سر پہ اٹھا لیتے ہیں

لب بلب رہتے ہیں جو شام و سحر دلبر سے
زندگانی کا وہی لوگ مزا لیتے ہیں

گرچہ درویش ہیں یہ لوگ مگر چاہیں تو
سلطنت مول ترے در کے گدا لیتے ہیں

میرے ویرانہ میں درویش بھی سلطاں ہو جائے
ہاں بسیرا سرِ شام آکے ہما لیتے ہیں

جم ہے اُسے رتبہ میں سمجھتے ہیں زیاد
بھیک جس کاسے میں ترے فقرا لیتے ہیں

گذر ہوتا ہے مدفن پہ حسینوں کے کبھی
واں کی ہم خاک کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

عیب سے پاک و مبرا ہے کلام اُن کا رندؔ
جو غزل حضرتِ آتشؔ کو دکھا لیتے ہیں

واضح ہو کہ اُن شعرائے غزل سرا کے علاوہ جن کے کلام نمونہ کے طور پر بالا میں درج ہذا کیئے گئے اور بہت سے اُستادانِ فن گزرے ہیں اور ماشاء اللہ اس وقت بھی موجود ہیں، مگر چونکہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے، اُن حضرات کے ذکر کی ضرورت نہیں دیکھی گئی - اب غزل سرائی کے مادے میں آخر عرض راقم یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقاضائے سلطنت سے انگریزیت نے ایسی تاثیر پھیلائی ہے کہ ہر شے جو ملکی وضع ترکیب ساخت روش وغیرہ کی ہے تنگ چشموں کی آنکھوں میں ذلیل اور خوار نظر آتی ہے جن حضرات نے علوم یورپ حاصل کیئے ہیں اُن کا انقلاب مذاق خیر اتنا حیرت انگیز نہیں ہے مگر تعجب اُن حضرات سے ہے جو نہ انگریزی جانتے ہیں - نہ

فرانسیسی مگر صحتِ عدم صحت مذاق پر بحث کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور ہندوستانی
علوم و فنون کی مذمت بے دھڑک کرنے لگتے ہیں ایسے حضرات کے نزدیک ہر
شے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے لفظ اے یقین مقدوح و مذموم ہے منجملہ دیگر اشیائے
ملکی کے ملکی شاعری بھی اُن کے خیال میں پُر از عیوب متصور ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں۔ مگر یوروپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے یوروپین
شاعری کے عیوب ایسے حضرات کو دکھائی نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ
انھیں یوروپین شاعری کے عیوب کیونکر نظر آئیں، جب اُن کی اطلاع کوٹ۔ پتلون
کرسی۔ میز۔ چھری۔ کانٹے وغیرہ کے اندر محدود ہے ایسے حضرات کو ہومر۔
ورجل۔ ہارس۔ ڈینٹی۔ شکسپیئر۔ ملٹن۔ شیلی بیرن۔ ٹینیس وغیرہ ہم کے حسن و قبح سے
کیا خبر ہے۔ جو یوروپین شاعری کا دم بھرتے ہیں اور شاعری ایسے امر اہم میں رائے زنی
کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات غزل سرائی کے مادے میں جو جو صورتیں
اصلاح کی بتاتے ہیں، اس کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غزل سرائی
کی خوبیوں کو عجزِ طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے یا اُن پر انگریزی کا جہل
مرکب ایسا سوار ہو رہا ہے کہ جب تک اُن کے خیال کے مطابق انگریزی مذاق
کے ساتھ غزل سرائی نہیں کی جائے، تب تک غزل سرائی مطبوع رنگ پیدا نہیں
کر سکتی۔ ان حضرات سے بعض فرماتے ہیں کہ غزل میں ہمیشہ عشقیہ مضامین باندھے
جاتے ہیں جو مخرب تہذیب ہُوا کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ ایسے مضامین کے عوض وعظ
پند نصیحت۔ اخلاق۔ تمدن اور نیچرل سینریوں کی باتیں موزوں کی جائیں۔ نیچرل
سینریاں عبارت ہے جبال۔ بحور۔ صحرا۔ میدان۔ کشت زار۔ حیوانات۔ نباتات

ہوا برق باراں وغیرہ وغیرہ کی نمود سے ایسے معترضین کی خدمت میں عرض راقم یہ ہے کہ غزل وہ صنف شاعری ہے۔ جو مضامین عشقیہ کے لیئے موضوع کی گئی ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ معاملات روحیہ اور امور ذہنیہ حوالہ قلم کیئے جائیں۔ اگر واقعی کسی غزل سرا کو ایسے مضامین کی بندش کی قدرت ہے تو اس کی غزل سرائی مخرب تہذیب ہو نہیں سکتی بلکہ اس کی غزل سرائی سے بہت کچھ اصلاح قلب و روح کی اُمید کی جاسکتی ہے جیسا کہ حافظؔ کی غزل سرائی دیکھی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ اخلاق آموز کوئی کتاب فارسی زبان میں نہیں دیکھی جاتی ہے اسی طرح وعظ و پند کی نسبت یہ عرض ہے کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے عداوت نہیں ہے، البتہ بھونڈے طور کی پند گوئی اور وعظ فرمائی کو غزل ایسی نازک صنف شاعری سے کیا علاقہ۔ یہ میں نہیں کہتا کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے مگر ہاں جو علاقہ ہے وہ نہایت نازک انداز کا ہے یہ بڑے غزل سرا کا کام ہے کہ موعظت بھی کرے اور غزل کے رنگ کو بھی قائم رکھے۔ اس کام کو حافظؔ خوب کرتے ہیں اس کا پورا ڈھنگ سعدیؔ کو بھی نہ تھا، کس واسطے کہ شیخ جب غزل میں پند و موعظت فرماتے ہیں تو غزل سرائی کے پیرایہ سے نکل جاتے ہیں لیکن اگر کسی کو یہ منظور ہے کہ پند و نصیحت کھلے ڈلے طور پر داخل غزل کی جائے تو اُسے اس امر کو فی الذہن رکھنا چاہیئے کہ یہ صنف شاعری اس کام کے لیئے موضوع نہیں ہوئی ہے۔ اس کام کے لیئے اور اصناف شاعری درکار ہیں مثلاً مثنوی۔ قطعہ رباعی۔ قصیدہ اور مسدس جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ مشیران اصلاح غزل اس کی امید نہ رکھیں کہ کھلے ڈلے طور کے پند و موعظت غزل میں کوئی موثر رنگ پیدا کریں گے

کریمائے سعدی اور پندنامۂ عطار کی طرز مضمون بندی غزل کے لیئے زینہار درکار نہیں
ہے۔ اسی طرح نیچرل سینیریوں کے بیان کے لیئے غزل موضوع نہیں ہوئی ہے' اس
صنف شاعری کو مجرد عالم درونی کی سیر درکار ہے۔ غزل گو کو کوئی حاجت نہیں ہے
کہ کوہ کوہ پتھروں کو یا دریا دریا موجوں کو گنتا پھرے۔ نیچرل سینیریوں کے لیئے مثنوی
موضوع ہوئی ہے۔ یوروپین شاعریوں میں بھی نیچرل سینیریوں کا بیان لیرکس میں نہیں دیکھا
جاتا ہے۔ ایسے مضامین کے لیئے مثنوی کے رنگ کی شاعری عموماً کام میں لائی
گئی ہے مثلاً سر والٹر کی وہ مثنوی جس کا نام لیڈی آف دی لیک (- Lady of
The Lake) ہے پس حضرات مشیران اصلاح کی خدمت میں عرض ہے کہ غزل
جس کام کے لیئے ایجاد ہوئی ہے اس میں بےموقع دست اندازی نہ فرمائیں' اس
کے عوض یوروپین مذاق ہائے شاعری کے لیئے یا کوئی صنف جدید اختراع فرمائیں
یا موجودہ اصناف شاعری سے کسی صنف کو جس میں وسعت دیکھیں نہایت شوق سے
اختیار فرمائیں۔ ظاہراً غزل میں کوئی اصلاح کی جگہ نہیں نظر آتی ہے کوئی طبّاع روئے
زمین پر نہ ہے اور نہ ہوگا۔ جو حافظ کی غزل سرائی کی خوبیوں پر ایک جو کے برابر بھی
کسی قسم کی افزائش کرسکتا ہے یا کر سکے گا۔ نامربوط امور کو غزل میں داخل کرنے کی
مثال ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ کسی خاص پز سے کوئی امیر یہ فرمائش کرے کہ تو ایسی
فیرنی پکالا جس میں خاگینہ گریل مرغ مسلم مربے چٹنی اور آچار کی لذتیں موجود ہوں
واضح ہو۔ کہ بعض مشیران اصلاح غزل نے جو اصلاح میں عملی طور پر کوشش کی ہے
وہ نہایت ناکامیاب رہے ہیں ان کی غزل سرائی از آں سو راندہ و ازیں سو درماندہ کی
پوری تصویر نظر آتی ہے دوسرا امر جو مشیران اصلاح غزل سرائی کے مادے میں فرماتے

ہیں وہ یہ ہے کہ غزل میں معشوق کو غزل سرایان اُردو مذکر باندھتے ہیں اور یہ امر خلاف نیچر یعنی خلاف فطرت ہے اس کی بحث راقم اہل عرب کی شاعری کے بیان میں کر چکا ہے یہاں اُس کے اعادہ کی کوئی حاجت نہیں ہے تیسرا امر جو مشیران اصلاح ارشاد فرماتے ہیں یہ ہے کہ غزل کو قطعہ بند ہونا چاہئیے ظاہر ہے کہ اس التزام کی صلاح کا سبب اہل یورپ کی تقلید کورانہ کے سوا دوسرا امر نہیں سوائے بر مشیران اصلاح جو اہل یورپ کے تتبع پر امر ناحق میں جان دیتے ہیں اہل انصاف تجویز فرمائیں کہ غزل سرائی میں اس التزام کی کیا ضرورت ہے بلکہ جو غزل سرائی کا موجودہ طور ہے وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ کس واسطے کہ سوا فارسی اور اُردو کے کوئی زبان روئے زمین پر نہیں ہے۔ جس میں نازک اور دشوار سے دشوار مضامین صرف دو مصرع میں تمام ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ امر فارسی اور اُردو کے لیئے موجب امتیاز نہیں ہے واقعی کوئی۔ ہاں ان دو توں زبانوں کے سوا ایسی نہیں ہے کہ ادائے مطلب پر اس طور سے قادر ہو۔ خواجہ حافظ کے دیوان میں امور قلبیہ ور اخلاق جس چستی بندش کے ساتھ سوا لہ قلم ہوئے ہیں یقیناً کسی اور زبان کی شاعری میں اس ترکیب خاص کے ساتھ نہیں پائے جاتے۔ پس جاننا چاہیئے کہ غزل سرائی میں التزام قطعہ بندی کی کوئی حاجت نہیں ہے اس عدم احتیاج کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خود تقاضائے غزل گوئی سے مضامین غزل ایسے ہوتے ہیں کہ ایک احاطۂ خاص سے باہر نہیں جاتے یعنی غزل سرائی کے مضامین واردات وجذبات قلبیہ ور امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ پس یہ احاطہ یک گونہ خود حکم قطعہ بندی کا رکھتا ہے ایسی صورت میں مشیران اصلاح کی صلاح بیکار معلوم ہوتی ہے بلکہ جس طرح کے التزام کی صلاح

یہ حضرات دیتے ہیں وہ لطف غزل سرائی کو فوت کر دینے والا نظر آتا ہے کس واسطے کہ حسن غزل یہی ہے کہ غزلیت کی خوبیوں کے ساتھ مختلف انداز کے داخلی مضامین شامل غزل رہیں راقم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ قطعہ بند غزلیں بھی ہوتی ہیں مگر جو التزام کی صلاح دیجاتی ہے وہ مفید غزل سرائی نہیں ہے اور درحقیقت اہل یورپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہے۔ چوتھا امر جو بہ سبیل مشورہ حضرات جدت پسند ارشاد فرماتے ہیں عروضی قواعد سے تعلق ہے مشیران اصلاح فرماتے ہیں کہ غزل سرائی میں ردیف کی کیا حاجت ہے صرف قافیہ کا التزام کافی ہے۔ ارباب مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ردیف غزل سرائی کے لطف کو بڑھا دیتی ہے اس کا متروک ہوجانا غزل کے نصف لطف کو ضائع کر دے گا، ہر زبان کے عروض کا ایک خاص تقاضا ہے چونکہ انگریزی میں ردیف کا مضمون کمتر ہے اس لیئے مقلدان اہل یورپ کو راضی کرنے کے واسطے کوئی ضرور نہیں کہ اردو میں بھی انگریزی نظم کا طور اختیار کیا جائے۔ بعض مشیران اصلاح ردیف تو ردیف قافیہ کو بھی نذارد کر دینے پر برسر اصرار نظر آتے ہیں یعنی جس طرح انگریزی میں بے قافیہ اور ردیف کے اشعار جنھیں بلینک ورس کہتے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں، اردو میں بھی لکھے جائیں ایسی صلاح وہی حضرات دیں گے جو اقسام ذیل کے اشخاص ہوں گے۔

نمبر ۱:۔ وہ جو علوم یورپ سے بے خبر ہیں۔ مگر بہت سی یوروپین چیزوں کو جو اچھی طرح دیکھتے آئے ہیں تو اس سے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ جتنی یوروپین چیزیں ہیں سب کی سب اچھی ہیں۔ خذ ما صفا ودع ما کدر کے مضمون سے یہ بیچارے بالکل ناواقف ہیں یہ تنگ چشم حضرات یورپ کی ہر چیز کو دراجس ( )

رہی کی دکان کی بنی ہوئی جانتے ہیں۔ جیسا کہ ایک نادان نے کسی جلسہ میں ایک کتاب کی جلد کی نسبت کہا تھا کہ اس کی جلد رائجس کی دکان کی بندھی معلوم ہوتی ہے' اس زمرہ کے وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ترجمۂ غیرہ کے ذریعہ سے کچھ انگریزی اشعار کے مضامین خبط بے ربط طور سے دریافت کر لیئے ہیں اور اس دریافت کی بنیاد پر رائے زنی کیا کرتے ہیں ؛

نمبر ۲ : وہ جو نہیں جانتے کہ انگریزی و دیگر یوروپین زبانوں میں بلینک ورس کے مروج ہونے کا سبب کیا ہوا حقیقت حال یہ ہے کہ یوروپین زبانوں میں الفاظ مقفا بہت کم ہیں پس ایسی زبان میں جب منظوم ضخیم کتابیں لکھی جائیں گی تو کمی قوافی کی حالت میں بلینک ورس ہی لکھی جائیں گی۔ ہومر کی ایلیڈ ورجل کی اینیڈ اور ملٹن کی پیریڈائیز لاسٹ اگر بلینک ورس میں نہیں لکھی جاتیں تو ایسی مبسوط اور پرمضمون تصانیف کے اتمام کی صورت یونانی لاطینی اور انگریزی زبانوں میں کیا ہوتی اُردو فارسی تو ایسی زبانیں ہیں۔ جن میں قوافی کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے پس ان زبانوں میں بلینک ورس کی کیا حاجت متصور ہے ؛

نمبر ۳ ؛ وہ جو شاعری کا دم بھرتے ہیں مگر انھیں درحقیقت موزونی طبع حاصل نہیں ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ جب قافیہ اور ردیف کی پابندی باقی نہیں رہے گی تو حسب مراد طور پر غزل سرائی کر سکیں گے' یہ اُن کا گمان ہی گمان ہے۔ بودی طبیعت کے لوگ بلینک ورس میں بھی طبع آزمائی نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے متخص طباع پابندی قوافی کے ساتھ اُردو اور فارسی میں غزل سرائی ہی نہیں کر سکتا ہے بلکہ ایلیڈ اینیڈ اور پیریڈائز لاسٹ کی سی مبسوط کتابیں بھی موزون کر سکتا ہے ؛

نمبر ۴ :- وہ جو اپنے کو مصلح قوم سمجھتے ہیں اور قوم کی ہائے وائے سے صرف اپنی شہرت منظور رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے قوم کو نہ کوئی نفع پہنچا ہے اور نہ پہنچے گا۔ البتہ ایسوں سے قوم کو ذلتیں نصیب ہوتی گئی ہیں ایسوں کی حقیقت یہ ہے کہ نفع ذاتی کے خیال سے قوم کی ہزاروں برائیاں بیان کیا کرتے ہیں یہ لوگ جلسہ ہائے عام میں کہا کرتے ہیں کہ میری قوم ایسی اور میری قوم ویسی ایسی تقریروں سے سوا قومی ذلت کے اور کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ یہ تقریریں جب خودداری کے پہلو سے دور ہیں تو غیر اقوام کی آنکھ میں ضرور قومی سبکی بھی پیدا کریں گی۔ ان مصلحان قوم نے بہ سبیل عادت ہر قومی شئے کو برا سمجھ لیا ہے۔ قومی مذہب معاشرت، قومی عادات وغیرہ وغیرہ کو تو برا ہی جانتے ہیں۔ قومی شاعری بھی ان کی بدگوئی سے نہیں بچ سکتی ہے۔

سہرا

واضح ہو کہ غزل کی صورت پر سہرا بھی لکھا جاتا ہے اس کی عروضی ترکیب تمامتر غزل کی ہوتی ہے اس سے اور غزل سے فرق یہ ہے کہ اس کے مضمون غزل کے اعتبار سے بہت محدود ہوتے ہیں۔ ہجر۔ فراق۔ درد۔ رنج۔ الم۔ حسرت۔ یاس حرمان۔ تمنا وغیرہ کے مضامین جو غزل کے لیئے مختص ہیں سہرے میں نہیں باندھے جاتے ہیں۔ خوشی اور خرمی اور ہلکے پھلکے شادی بیاہ کے مضامین اس میں جو آلۂ قلم کئے جاتے ہیں سہرے کی تصنیف میں کبھی ایسے دشوار مضامین کو نہیں دخل دینا چاہیئے کہ سامعین کے دماغ کو اس کے فہم میں ذرا بھی دقت لاحق ہو

غرض سہرے کی یہ ہے کہ شادی بیاہ کے مجمع میں اُسے ارباب رقص گائیں اور حاضرین محفل لطف اٹھائیں۔ مشہور سہروں میں دو سہرے ہیں ایک سہرا حضرت غالبؔ کا فرمایا ہوا ہے اور دوسرا اُستاد ذوقؔ کا۔ غالبؔ کا سہرا اُن کے مذاق غزل گوئی کا رنگ رکھتا ہے اور سہرے کے اعتبار سے اُس کا رنگ سہرے کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے برخلاف اس کے ذوقؔ کا سہرا تمامتر ایسا ہے جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہیئے۔ حضرت غالبؔ مضمون آوری کے کاربند ہوتے ہیں سہرے میں غزل کی مضمون آوری کی حاجت نہیں ہے اُستاد ذوقؔ نے معمولی مضامین کو شاعری کی خوبیوں کے ساتھ اس موزوں فرمایا ہے کہ خاص و عام کو پسند آتا ہے جاننا چاہیئے کہ سہرا کوئی ایسی صنف شاعری نہیں ہے۔ جس میں داخلی مضامین دقیق اور نازک انداز کے باندھے جائیں اس میں اس قسم کے مضامین کو دخل دینا سہرے کے تقاضے کے خلاف عامل ہوتا ہے کوئی شک نہیں کہ جب ذوقؔ کا سہرا گایا گیا ہوگا تو حضار محفل کو بہت لطف حاصل ہوا ہوگا۔ شاعری میں اس امر کا لحاظ واجبات سے ہے کہ جس صنف کی شاعری اختیار کی جائے اُس میں کوئی امر اُس کے تقاضے کے خلاف دخل نہ پائے۔ ہر سخن کے لئے موقع و محل ہے بے موقع اور بے محل کلام کبھی لذت بخش نہیں ہو سکتا ؎

غالبؔ کا سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۔۔۔ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ۔۔۔ ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیئے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا — ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرّر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھُولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک — کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار — لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

ارباب مذاق پر ہویدا ہے کہ یہ سہرا کہے دیتا ہے کہ ہم نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نتائج افکار سے ہیں۔ داخلی پہلو کی مضمون آوری کی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہر شعر حضرت کی غزل سرائی کا رنگ لیئے ہوئے ہے الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے جو حضرت کی غزلوں میں اکثر قائم رہتا ہے حُسنِ دلِ افروز طرف کلاہ۔ رگِ ابر گہر بار۔ تاب گرانباری گوہر ایسے مرکبات ہیں کہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس سہرے کا مصنف کون ہے لاریب سہرے کے واسطے یہ وقت شعاری خوش مذاقی سے بعید ہے اب نواب ابراہیم ذوق کے سہرے پر توجہ فرما کر ناظرین صحت مذاق کی داد دیں۔

ذوقؔ کا سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا نبے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دُھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا انبوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پہ سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کی
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

جن کو دعوئی ہو سخن کا یہ سنادو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

فی الواقع کیا خوب سہرا ذوقؔ نے لکھا ہے سہرے کے تقاضوں کے مطابق یہ سہرا ہے۔ تعقیبات و تعقیدات کے نقصانات کو نظر انداز کر کے لیے جو صاحب

مذاقِ صحیح دیکھے گا۔ آفرین صد آفرین کہے گا۔ جن اشعار پر راقم نے خطوط کھینچ دیئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ زبانِ حال سے اِس مصرع کو پڑھ رہے ہیں۔ مصرع

دیکھو اِس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

واضح ہو کہ راقم اپنے خیالات کے اظہار میں تاحدِ امکان انصاف و راست بازی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے دروغ سرائی کام بے ایمان کا ہے ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ ہے

راست میگویم و یزداں نہ پسندد جز راست — حرفِ ناراست مگر دانِ روشِ اہرمن ست

اس میں شک نہیں کہ فقیر اپنے خیال کے مطابق غالب کی اردو کی غزل سرائی کا بہت معتقد ہے مگر فقیر کے اعتقاد کا طور اُن کی جناب میں کورانہ نہیں ہے امرِ حق جو راقم کو معلوم ہوا اُسے بالا میں عرض کیا اور آئندہ بھی اسی روش کا پابند رہے گا۔ خیر انصاف یہی ہے کہ ذوق نے غالب سے کہیں بہتر سہرا لکھا اور ایسا لکھا جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہیئے۔ لیکن ذوق کے سہرا لکھنے کے بعد جو غالب نے قطعہ معذرت لکھا وہ ایسا لکھا کہ غالب کے عوض اگر ذوق کو اس کے لکھنے کی نوبت آتی تو اس کامیابی کے ساتھ قادر نہ ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق داخلی مضامین کی بندش پر پوری قدرت نہیں رکھتے تھے، اور اگر رکھتے ہوتے تو غزل سرائی اُسی رنگ میں کی ہوتی جیسا کہ درد۔ میر۔ مومن۔ غالب وغیرہ کر گئے ہیں۔ غالب کا یہ قطعہ داخلی رنگ رکھتا ہے۔ کس واسطے کہ معذرت خواہی خود ایک داخلی امر ہے۔ اس کو وہی شاعر حسبِ مراد موزوں کرے گا، جو داخلی شاعری کی صلاحیت رکھے گا۔ اس قطعہ سے اور بھی قلبی اور ذہنی کیفیات عیاں ہیں جو اہلِ دانش سے پوشیدہ نہیں ہیں ؛

قطعہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ، ہاں اِس سے مُدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خُدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

سلام

عروضی ترکیب کی رو سے غزل سہرا اور سلام تینوں واحد ہیں مگر اُن کے مضا
کے تقاضے ایک دوسرے سے علٰحدہ انداز رکھتے ہیں۔ فارسی میں سہرا اِس واسطے

نہیں ہے کہ اُس ملک میں دُولھا یا دولھن کو سہرا نہیں باندھتے ۔ مگر سلام ہے، سلام میں
غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے
ہیں مگر اُن میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے ۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے
ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیئے، سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی رنگینی
اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جُدا نظر آئے ۔ عموماً سلام میں واقعہ کربلا و
شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسن و مصائب حضرت خاتون جنت و رحلت
حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم الی یوم القیام کے مضامین داخل رہتے
ہیں ۔ اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں اندراج
پاتے ہیں علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت
متصور ہے ۔ منظوم کیئے جاتے ہیں ۔ ایسے مضامین کبھی کبھی غزلوں میں بھی باندھے جاتے
ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعض اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ اگر غزلوں
میں داخل کر دیئے جائیں تو بے موقع یا بے محل معلوم نہ ہوں گے، میر انیس اور
میر مونس کے بہت ایسے اشعار سلام ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں، تو
غزلوں کا وقار ترقی کر جا سکتا ہے ۔ ذیل میں کچھ سلام میر ضمیرؔ، مرزا دلگیرؔ، میر انیسؔ
اور میر مونسؔ کے بطرز انتخاب درج کیے جاتے ہیں ۔

سلام میر ضمیرؔ رحمہ اللہ تعالیٰ

جری شہ نے کہا میں جو نہ بے سر ہوتا	حشر کو تاج شفاعت نہ میسر ہوتا
شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا دل پر	دیکھتے تم کہ جواں کیا علی اکبر ہوتا

شاہ نے حُر سے کہا آج جو کچھ تُو نے کیا
ایسا کرتا جو حسنؑ میرا برادر ہوتا

شاہ کہتے تھے ہے ذوقِ شہادت اے شمر
ہم تجھے دیتے جو تجھ پاس نہ خنجر ہوتا

ہوتی خاتونِ قیامت تو قیامت ہوتی
حشر ہو جاتا اگر شافعِ محشر ہوتا

سوچ کر تشنگی شاہ کو بولے عباسؑ
نہر کیا پانی نہ ہم پیتے جو کوثر ہوتا

شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آبِ فرات
ہم لٹا دیتے اگر چشمۂ کوثر ہوتا

سلام میاں دلگیر مرحوم و مغفور

ای سلامی وطنِ شاہ تو کچھ دور نہ تھا
لیک شبیرؑ کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا

ہائے اس ملک میں پائی تھی سکینہ نے وفات
جہاں عابد کو کفن دینے کا مقدور نہ تھا

سر کھلے قید میں لے جائیں کسی کے ناموس
پیش ازیں ملکِ عرب میں کبھی دستور نہ تھا

پا پیادہ کہیں بیمار بھی چلتا ہے بھلا
قابلِ فاقہ کشی عابدِ رنجور نہ تھا

علی اکبر سا ملا خاک میں جو نورِ نظر
جب تلک شاہ جیے آنکھوں میں پھر نور نہ تھا

کس طرح گنجِ شہیداں نہ بناتے سجادؑ
کون سا لاشہ تھا زخموں سے جو وہ چور نہ تھا

تھی سکینہ سے خجالت نہ پھرے جو عباسؑ
ورنہ میدان سے خیمہ تو بہت دور نہ تھا

بانو کہتی تھی کہ کیا جلد سدھارا اصغر
چھ مہینے کا بھی وہ لال تو بھرپور نہ تھا

بسکہ تھے نالۂ سوزانِ حرم شعلہ فشاں
خیمۂ آلِ محمدؐ بھی کم از طور نہ تھا

اور خاصانِ خدا پر بھی مصیبت گزری
پر سوا شہ کے کوئی درد میں مسرور نہ تھا

کچھ قیامت میں نہ باقی تھا دمِ قتلِ حسینؑ
حکمِ خالق کا مگر بہرِ دمِ صور نہ تھا

ان کے ہر گام تلے چشمہ نکلتا دلگیر
پانی پینا ہی مگر شاہ کو منظور نہ تھا

اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ دونوں سلام بالا کی بندش گو ویسی چست نہیں ہے جیسے ہر دو سلام ذیل کی ہے مگر مرثیت کا انداز حسب مراد ہے ؛

سلام میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

فشار سے جو بچا میں ہوا زمیں کو عجب
صدا یہ قبر نے دی حکم بوتراب نہ تھا

اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم
تو رونے والوں کی آنکھوں کا پھر جواب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

حسینؑ اور طلب آب اے معاذ اللہ
تمام کرنے تھے حجت سوال آب نہ تھا

جسے نبیؐ نے بلایا ہو وہ نخل نہال
ثمر اسے بھی دیئے جو کہ بار یاب نہ تھا

علیؑ کے پائے مبارک نے جو ضیا پائی
وہ نور حضرت موسیٰؑ کو دستیاب نہ تھا

فقط حسینؑ کے بچوں پہ بند تھا پانی
بہت قریب تھی وہ نہر قحط آب نہ تھا

حضور شاہ پھر آیا کہاں سے حر شہید
خطا کی راہ میں گر جادۂ صواب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کردو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلام ابوتراب نہ تھا

خوبی زبان چستی بندش، بلند پردازی مضامین رنگینی طبیعت محتاج بیان نہیں ظاہراً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ میر انیسؔ صاحب مرحوم جس عمدگی کے ساتھ مرثیہ نگاری فرماتے تھے اسی طرح سلام کے لکھنے پر ایک حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے :

سلام میر مونسؔ نور اللہ مرقدہٗ

ی جلتا تھا شہ کا جسم بے سر دھوپ میں
شامیانہ تھا نہ لاتے تھے پر نہ چادر دھوپ میں

ب کھنچا عطر گل رخسار سرور دھوپ میں
مجرئی کیا کیا بسی زلف معنبر دھوپ میں

، قدر حدت تھی روز قتل سرور دھوپ میں
اے سلامی لال تھے میداں کے پتھر دھوپ میں

، سے بھی تھی سوا اس دن حرارت مہر کی
باہر آتا گر تو جل جاتا سمندر دھوپ میں

تے تھے ذرے شرر کی طرح ریگ گرم کے
سنگریزے جل رہے تھے مثل اخگر دھوپ میں

، تو ابن سعد کے سر پر لگا تھا چتر زر
یاں کھڑا تھا مہر تابان پیمبرؐ دھوپ میں

ہیں ڈھالوں کے تھا راحت سے شمر رو سیاہ
چھاؤں تلواروں کی تھی سرور کے سر پر دھوپ میں

ہی جرأت کہ تنہا لڑ رہا تھا فوج سے
تین دن کا بھوکا پیاسا میر کوثر دھوپ میں

اری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو
گر کے تڑپے اس طرح ریتی پہ اکبر دھوپ میں

ر عابد بھی نہ لاشوں پہ عجب نیرنگ تھا
سوکھتے تھے باغ زہرا کے گل تر دھوپ میں

نے اعدا سے کہا لازم ہے ستمگر کو رحم
بوند پانی کے لئے نکلا ہے اصغر دھوپ میں

تے تھے شہ اسکو دامن میں چھپائے زمین
جلتی ریتی پر پڑی ہے لاش اکبر دھوپ میں

ٹھا دیا شمر لعیں نے ایک سنگ گرم پر
کاٹ کر تن سے سر سبط پیمبرؐ دھوپ میں

بے کفن چہلم تک افتادہ رہا وہ آفتاب
رہنے دیتی تھی نہ زہرا جسکو دم بھر دھوپ میں

یا مصیبت تھی اسیران ستم پر ہے ستم
اوس میں رہتے تھے ساری رات دن بھر دھوپ میں

سایۂ طوبیٰ میں پہنچائیں گے مونسؔ کو حسینؑ
حشر کے دن دیکھ کر نالان و مضطر دھوپ میں

خوش خیالی، خوبی زبان، چستی بندش کے ساتھ جس قدر میر مونس مرحوم رنگین طبع تھے ظہر من الشمس ہے طبیعت کی رنگینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بعضوں کا یہ خیال ہے کہ سلام گوئی میر مونس مرحوم پر ختم تھی۔ اگر میر انیس غفران مآب عالم وجود میں نہ آئے ہوتے تو یقیناً اس قول کی صحت میں کسی پہلو سے جائے گفتگو ممکن نہ تھی ۞

معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس کو سلام گوئی کا مذاق کم ہے کوئی دلخواہ سلام فارسی کا راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوا اس لیئے داخل جلد ہٰذا نہ کر سکا ۞

قصیدہ

قصیدہ وہ صنف شاعری ہے کہ عروضی ترکیب میں غزل سے تمام تر مشابہت رکھتا ہے، اِلّا یہ کہ اس میں غزل سے بہت زیادہ اشعار ہوتے ہیں، جس طرح غزل پانچ شعر سے کم کی نہیں ہوتی، اُسی طرح قصیدہ اکیس شعر سے کم کا نہیں ہوتا۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے قصیدہ اور غزل میں بڑا فرق ہے۔ یہ صنف شاعری داخلی اور خارجی دونوں پہلو کے مضامین سے تعلق رکھتی ہے اس صنف میں شاعر اعلیٰ درجہ کے مضامین جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ سے متعلق ہوتے ہیں موزون کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قصیدہ کا احاطہ مضامین غزل کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ قصیدہ کے لیئے علو مضامین کی بڑی ضرورت ہے اگر کوئی قصیدہ اس صنف سے متصف نہیں ہے۔ تو اس پر قصیدہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس صنف شاعری کے لیئے ضرور ہے کہ اس میں امور ذہنیہ از قسم مسائل اخلاق و تدبیر المنزل و سیاست مدن و مذہب، شریعت، طریقت، عرفان، توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد، قوانین الٰہی و انسانی وغیرہ اور معاملات خارجیہ از قسم مضامین مشاہدات اشیائے سماویہ و ارضیہ و ما بینہما احاطہ نظم میں در آئیں۔ المختصر قصیدہ گوئی شاعر حکمت مآب کا کام ہے اور

اس کے لیئے وفور معلومات علمیہ کی حاجت ہے لیکن ہزار افسوس ہے کہ اس صنف شاعری سے بہت سے شعرائے اہل علم بھی وہ کام نہیں لیتے گیئے ہیں جو اس کا تقاضا ہے راقم نے قصیدہ کی بحث متنبی کی قصیدہ گوئی کے لگاؤ میں کی ہے جس سے قصیدہ کے استعمال بد کی کیفیتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اسی پر فارسی اور اُردو کی قصیدہ گوئی کو بھی خیال کرنا چاہیئے کہ شعرائے درباری کی بدولت یہ صنف شاعری کس درجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے، جاننا چاہیئے کہ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو یا حمد خداوند و نعت محمد مصطفیٰ و منقبت علی مرتضیٰ و ائمہ باصفا سے شاعر کو ثواب عقبیٰ حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا و رسول و ائمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو لیکن شعرائے ناعاقبت اندیش اس صنف شاعری کو اس بدترکیبی سے استعمال کرتے گئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں کہ عربی اور فارسی اور اُردو کی قصیدہ گوئی ننگ شاعری ہو کر شائستہ ملکوں میں ان زبانوں کی تفضیح کی صورت ہو گئی ہے، ذیل میں کچھ فارسی اور اُردو کے شعرائے قصیدہ گو کے کلام درج کیئے جاتے ہیں اور اُن کی نسبت جو راقم کے خیالات ہیں، وہ بھی خدمت ناظرین میں گذارش ہوتے ہیں ؎

فارس کی قصیدہ گوئی

ظاہر ہے کہ فارس کے تمام شعرائے قصیدہ گو کا ذکر اس کتاب میں کیا نہیں جا سکتا کس واسطے کہ اس کی تصنیف بہ سبیل تذکرہ واقع نہیں ہوئی ہے اس لیئے صرف چند مشاہیر حضرات قصیدہ گو اس کتاب میں یاد کیئے جاتے ہیں اُن کے نمونہ ہائے کلام سے قصیدہ

گوئی کی حقیقت، کم و بیش طور پر منکشف ہو جائے گی۔

رودکی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص فارسی کا پہلا شاعر ہے۔ قصیدہ کا موجد تو کہا نہیں جا سکتا۔ اس واسطے کہ اس کے ظہور کے بہت سی صدیاں پہلے یہ صنف شاعری اہل عرب میں جاری تھی بہر حال رودکی قدیم ترین شعرائے فارس سے ہے اور اس کا کلام فطری خوبیوں سے معمور ہے اُس کے ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہوگا کہ یہ شاعر فطرت کی تبعیت کرنیوالا تھا، بے سروپا طور کے مضامین کا باندھنے والا نہ تھا۔ یعنی اُس کی ترکیب ظہیر فاریابی وغیرہ کی نہ تھی ہر چند قصیدہ ذیل بھی ایک درباری قصیدہ ہے مگر ظہیر کے اناپ شناپ درباری قصیدوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ رودکی کا کلام زیور سادگی سے آراستہ نظر آتا ہے اور فطری رنگ رکھنے کے باعث دلچسپی سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ اُس قصیدہ کا کوئی شعر ایسا نہیں دکھائی دیتا۔ کہ سعدی علیہ الرحمہ کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان ۔۔۔ نہی زیر پائے قزل ارسلان

واقعی سعدی کیا ہی عمدہ مذاق کے شاعر تھے آخر ظہیر کے اس شعر نے ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا ۔۔۔ تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

شیخ سے شعر بالا کہلا ہی چھوڑا کیوں نہ ہو ہر راست باز راست پسند راست طبیعت راست خلقت آدمی کو دروغ سرائی سے وحشت ہوتی ہے، لاریب ایسی ہی مبالغہ پردازیوں نے فارسی کی شاعری کو عالم میں بدنام کر رکھا ہے۔ اگر فارسی شاعری سے مبالغہ پردازی کی بدمذاقی دور ہو جائے تو فارسی شاعری پُر وقار ہو جائے۔ غضب خدا کا

ہے کہ فارسی کے شعراء اپنے سلاطین و امراء کی تعریف ایسے نہج سے کرتے ہیں کہ اگر اُن کے اشعار حمد خدا و نعت محمد مصطفیٰؐ اور منقبت علی مرتضیٰؑ میں پڑھے جائیں تو نہایت ہی حسب حال معلوم ہوں بیشتر شعرائے فارس کے قصائد مدحیہ کا یہی رنگ دیکھا جاتا ہے باستثنائے شعرائے قلیل متقدمین و متاخرین سب کے سب مرض مبالغہ پردازی کے علیل نظر آتے ہیں اور افسوس ہے کہ مرور ایام سے یہ بیماری ترقی ہی کرتی گئی۔ چنانچہ فخر المتاخرین حکیم قاآنی کو آزار مبالغہ میں متقدمین سے بھی زیادہ مبتلا پاتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر اُن کے ایک قصیدہ مدحیہ کا عرض کیا جاتا ہے۔ شعر

شہنشاہے کہ ہست او را بطوع و طبع جان و دل قضا تابع قدر طالع ملک خادم فلک چاکر

کاش قاآنی نے اِس شعر کو مرزا ناصر الدین شاہ کی مدح کے عوض نعت محمد مصطفیٰؐ و منقبت علی مرتضیٰؑ میں کہا ہوتا اسی طرح اِس شاعر نادر کے سیکڑوں اشعار ہیں جو حمد و نعت و منقبت کے لئے موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ نہایت جائے حسرت ہے کہ مبالغہ پردازی کی بیماری سے فارسی کی نظم و نثر دونوں بدحال ہو رہی ہیں۔ مگر ابھی تک اِس کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ کاش اب بھی کوئی علاج کی صورت نکلے کہ فارسی کی شاعری پنجہ اجل سے نجات پائے۔

واضح ہو کہ شاعری کو دروغ سرائی سے کوئی علاقہ نہیں ہے دروغ سرائی شاعری کی پُر تاثیری کو کھو دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر فارسی کے قصائد تمام تر بے اثر نظر آتے ہیں۔ اُنھیں پڑھ کر طبیعت کو کسی قسم کی فرحت نصیب نہیں ہوتی۔ بالیقین ایسے قصائد تعلیم یافتہ دماغوں میں جگہ نہیں کر سکتے۔ اُن سے متلذذ ہوتے کے لئے ضرور ہے کہ پہلے انسان اُن کے مضمونوں کا مذاق پیدا کرے۔ بلا شبہ

ایسا شخص جو شاعری کو سرمایۂ زندگی و قوت روح جانتا ہے ایسی شاعری سے جو دو حقیقۃ سوہان جان ہو کسی طرح کی دلی یا دماغی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ہے بہر حال رودکی کا قصیدہ جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہوتے ہیں ان معائب سے پاک ہے جن سے فارسی کی شاعری انگشت نما ہو رہی ہے اس میں نہ معیوب طور کی مبالغہ پردازی اور نہ نامطبوع انداز کی نازک خیالی۔ ظہیر۔ عرفی۔ قاآنی وغیرہم کے طریقۂ قصیدہ گوئی سے تمامتر علیحدہ ہے۔ معما۔ چیستان اور ہر طرح کے صنائع بدائع کے معائب سے تمامتر پاک ہے۔ نیچرل شاعری کا نمونہ ہے اور جس غرض سے لکھا گیا تھا اس کا پورا کر دالا نظر آتا ہے اسی لئے حسن تاثیر سے آراستہ دکھائی دیتا ہے۔

اشعار از قصائد رودکی

یاد جوئے مولیاں آید ہمی — باد یار مہربان آید ہمی
ریگ آموی و درشتیہا ئے او — زیر پایم پرنیان آید ہمی
آب جیحوں از نشاط روئے ما — خنگ مارا تا میان آید ہمی
اے بخارا شاد باش و دیر زی — میر زی تو شادمان آید ہمی
میر سرو است و بخارا بوستان — سرو سوئے بوستان آید ہمی
میر ماہ است و بخارا آسمان — ماہ سوئے آسمان آید ہمی

صاحب تاریخ گزیدہ لکھتے ہیں کہ رودکی کو اس قصیدہ کے لکھنے کی یہ حاجت ہوئی کہ امیر نصر ۳۲۵ھ میں بخارا کو چھوڑ کر مع ارکان دولت ہرات میں قیام پذیر ہوا تھا۔ اس شہر سے اسے ایسی دلبستگی پیدا ہوئی کہ وہ بخارا کو بھول بیٹھا امرا و وزرا

بہت اِس کے کوشاں تھے کہ وہ وطن مراجعت کرتا مگر وہ کسی کی نہیں سنتا تھا تب رودکی نے یہ قصیدہ لکھا اور یہ قصیدہ بحضور امیر گایا گیا۔ اس قصیدہ کا یہ اثر ہُوا کہ امیر فوراً جلسہ سے اٹھا اور بلا سامان سفر امراء اور رفقاء کو لے کر بخارا کو روانہ ہو گیا۔ صاحب تذکرہ دولت شاہی لکھتے ہیں کہ علماء کو اس قصیدہ کی مقبولیت پر تعجب ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ یہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے اور زیورات شاعری سے تمامتر معرا ہے امیر نصر کے بعد کے سلاطین کے حضور میں اگر ایسا قصیدہ پڑھا جاتا تو ضرور اُن کی ناپسندیدگی کا باعث ہوتا۔ واضح ہو کہ دولت شاہ کی یہ تحریر مذاق شعرائے فارس کے تمامتر موافق ہے مگر راقم کو اس قصیدہ کی مقبولیت میں کوئی تعجب نہیں گزرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قصیدہ نہایت فطری رنگ رکھتا ہے فطری انداز بیان میں اگر پُر تاثیری موجود نہ ہو تو پھر کہاں ہو سکتی ہے۔ حضرت غالبؔ نے بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں تحریر فرمایا ہے۔ اُس کے عمدہ ہونے میں کوئی گفتگو نہیں مگر اس کا انداز اِس قدر فطری نہیں ہے اس لئے اس کو اِس قدر حُسن قبول حاصل نہ ہُوا۔ علاوہ اس کے جائے غور ہے کہ رودکی نے اپنا قصیدہ ایسے وقت میں لکھا تھا کہ تمام امراء وزراء اور رفقائے امیر پر حُبِّ وطن کا جوش غالب ہو رہا تھا۔ رودکی بھی دوری وطن سے پریشان تھا۔ ایسی حالت میں جو کچھ رودکی نے کہا۔ دل سے کہا

آنچہ از دِل خیزد بر دل ریزد

یہ موقع حضرت غالبؔ کو کب نصیب ہُوا۔ پس حسب مراد مقبولیت کی صورت حضرتِ غالبؔ کے قصیدہ کو کیونکر ہو سکتی تھی +

فردوسی طوسی ابو القاسم نام نامی ہے اور فردوسی تخلص چونکہ وطن ملک طوس تھا

اس لیئے طوس کی نسبت کے ساتھ یاد کیئے جانے اور درجۂ حکمت حاصل رہنے کے باعث ملقب بہ حکیم ہیں اِس خدائے سخن کی شہرت قصیدہ گوئی کی بنیاد پر نہیں ہے جس بنیاد پر ہے اُس کی بحث آئندہ آئے گی۔ یہاں ذیل میں ایک قصیدہ جو اِس ہمایوں نہاد کی فکرِ پاک کا نتیجہ ہے۔ نذر ناظرین کیا جاتا ہے یہ قصیدہ منقبت سیدنا امیر المومنین میں ہے اور دوستداران امام کے خلافِ مذاق نہیں ہے ؎

قصیدۂ فردوسیؔ

اگر بری نجم زلف تا بدار انگشت — ز زلف خویش بر آری نزینہار انگشت
بگر شمارۂ زلف تو می کُند شانہ — کہ کردہ درخمِ زلف تو بے شمار انگشت
گرہ گرہ شدہ رگہاے جان خستہ دلان — چو کردہ زلف سیاہ تو تار تار انگشت
بحرفِ قتل من انگشت کش نہادی دوش — سرم فدائے تو زین حرف بر مدار انگشت
سزائے شہادتِ شہید عشق برد — چو بار تیغ بر آرد دلا برار انگشت
پئے نظارۂ مشکین ہلال ادبا ماہ — کشد مہ تو ازین نیلگوں حصار انگشت
بمستی آرزوے پائے بوس او کردم — نہادہ برلب خون نوش خود نگار انگشت
دلا چو پیر شدی بگذر از ہوا و ہوس — ز بہر آرزوے نفس خود برآر انگشت
بگو کہ بود کہ شد فتح باب خیبر از و — کہ کرد بر در آن قلعۂ استوار انگشت
کہ پارہ کرد کمندِ نفاق و رشتۂ کفر — بہ گاہوارہ کہ زد در دہان مار انگشت
علی عالی اعلیٰ کہ دست ہمت او — ہزار تے زدہ بر چشم ذوالخمار انگشت
شہے کہ تا نہ دو انگشت در ز خیبر کند — برآمد از پئے اسلام صد ہزار انگشت

زدست تیغ تو جان برد وز جہان ایمان — ہر آنکہ کرد بدین تو استوار انگشت
کسے کہ حب تواش نیست تا بروز شمار — بہرزہ گوئی تسبیح می شمار انگشت
کسے کہ دست بدامانِ حیدر و آلش — نزد لبسا کہ بدندان کند فگار انگشت
شہا نز است مسلم کرم کہ گاہ رکوع — کند برائے تو انگشتری نثار انگشت
کمینہ چاکر مداح تست فردوسی — ہمیشہ باقلمش گشتہ دستیار انگشت
بگیر دست خدایا بحق حیدر و آل — دران نفس کہ رود خلق راز کار انگشت
موالیان علی را ز روئے لطف و کرم — ز ہول روز جزا برقرار دار انگشت

شہا غلام غلامِ توام مرا بہ گذار
برائے فاقہ برآرم بہ زینہار انگشت

سنائی

مجد الدین نام نامی ہے۔ سنائی تخلص۔ اور حکیم لقب ہے۔ وطن اطراف غزنین میں تھا۔ ظہور اس حکیم نامی کا آل سبکتگین کے عہد میں ہوا اس خاندان کے جن جن بادشاہوں کو اس یکتائے روزگار کے دیکھنے کا اتفاق ہوا حلقہ بگوش عقیدت رہے۔ واقعی حکیم سنائی عجب بزرگ گذرے ہیں اہل سنت اُن کو اولیا و اتقیا سے جانتے ہیں حکما اُن کو حکیم مانتے ہیں۔ شعرا ان کو اُستاد باکمال کہتے ہیں۔ شیعہ اُن کو عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا بطور نمونہ نذر ناظرین ہوتا ہے +

قصیدہ سنائی نمبرا

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا — قدم ازین ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا

بہرچہ از راہ باز افتی چہ کفر آن حرف و چہ ایمان　　بہرچہ از دوست وامانی چہ زشت آن نقش و چہ زیبا
گروہ ہردان بینی کہ مزدش بینی از دوزخ　　نشانِ عاشق آن باشد کہ خشکش بینی از دریا
سخن کز راہ دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی　　مکان کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا
مگو مغرور غافل را برائے امن او نکتہ　　مدہ مجبور رحبا رل راز بہر طبیع او حرفا
نہ حرف از بہر آں آمد کہ سوزی زہرۂ زہراؑ　　نہ حرف از بہر آن باشد کہ دزدی چادر زہراؑ
تو علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب　　چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا!
چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید　　گرفتہ چینیان احرام و مکی خفتہ در بطحا
چو تن جاں را مزین کن بہ علم دین کہ زشت آید　　ازیں سو شاہ عریاں و ازاں سو کوشک اندر دیبا
ترا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ　　ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ز بہر دین نہ بگذاری حرام از حرمت یزداں　　ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتۂ ترسا
مرا باری بحمد اللہ ز راہ حکمت و ہمت　　بہ سوئے خطۂ حدت برد عقل از خطۂ اشیا
نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت　　ہمی گویم بہ ہر ساعت چہ در سراء چہ در ضراء
کہ یارب مر سنائی را سنائے دہ تو در حکمت　　چناں کز وے برشک آید روانِ بوعلی سینا
نگرداں عمر من چوں گل کہ در طفلی شوم کشتہ　　نگرداں حرص من چوں مل کہ در پیری شوم برنا
مکن حرص از شرابے خورم بگیر از من کہ بد کردم　　بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا
بہرچہ از اولیا گفتند ارزقنی و وفقنی　　بہرچہ از انبیا گفتند آمنا و صدقنا

سبحان اللہ! واقعی سوا حکیم کے کون شاعر ایسے اشعار موزوں کر سکتا ہے یہ شعر دفتر حکمت ہے۔ تعلیم دین و دنیا کا خاتمہ ہے کیسے کیسے مسائل منقح پیرایۂ شاعری میں بیان ہوئے ہیں یہ اشعار عالموں کو راہ ہدایت بتانے والے ہیں ان سے فلسفی کو فوائد

عظیم نتیج ہو سکتے ہیں۔ اِن سے طالبِ حق دریافتِ حق کر سکتا ہے کیا کہنا ہے آفرین صد آفرین، لاریب جس زبان میں ایسے اشعار موجود ہوں وہ زبان اپنے وقار پر ناز کر سکتی ہے۔ کاش فارسی کے سب قصائد اِس انداز کے ہوتے۔ حیف صد حیف کہ درباری قصیدہ گویوں نے اِس زبان کو بے آبرو کر ڈالا ہے اِس زبان کے وقار پر بد مذاقی شعراء کا ابر ایسا چھا رہا ہے کہ یہ زبان مبتلائے تیرگی ہو رہی ہے واضح ہو کہ برائے خود قصیدہ ایک نہایت اعلیٰ اور افضل اصنافِ شاعری سے ہے مگر اس کے استعمال بد نے اسے مقدوح بنا رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ صنفِ شاعری بڑے بڑے اہم مضامین کی بندش کے واسطے وضع کی گئی تھی جیسا کہ اس قصیدہ کے انداز سے ہویدا ہے راقم ایک اور بھی قصیدہ اِس حکیم عالی مقام کا درج ہذا کرتا ہے؛

قصیدہ سنائیؒ نمبر۲

برگ بے برگی ندارد لاف درویشی مزن — رخ چو عیاران مبادا جان چو نامردان بکن
ہر چہ یابی جز ہوا آں دین بود در جان بکار — ہر چہ بینی جز خدا آن بت بود درہم شکن
سر برآر از گلشن تحقیق تا در کوئے دین — کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن
در یکے صف کشتگان بینی بہ تیغے چون حسینؓ — در دگر صف خستگان بینی بزہرے چون حسنؓ
درد دین خود بوالعجب دردے ست کاندر وے چو شمع — چوں سوئی ہباید بہتر گردی از گردن زدن
ہر خسے از رنگِ گفتارے بایں رہ کے رسد — درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن
قرن ہا باید کہ تا یک کودکے از لطفِ طبع — عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب — لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماہ ہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش — صوفیئی را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل — شاہدی را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

روز ہا باید کشیدن انتظار بے شمار — تا کہ در جوف صدف باراں شود دُرِّ عدن

صدق و اخلاص درستے باید و عمر دراز — تا قرین حق شود صاحب قرآنے در قرن

با دو قبلہ در رہ توحید نتواں رفت است — یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

کس منہ سے اشعار بالا کی تعریف کی جائے۔ سبحان اللہ وصل علی ہر شعر اعلیٰ درجہ کی تعلیم روحانی کا آلہ ہے کس قدر فطرت کے قرین ہے حق گوئی اور حق جوئی کا خاتمہ ہے کلام ایسا تو ہو کہ ضرب المثل کا حکم رکھتا ہو۔ فارسی کو جس قدر بد مذاق قصیدہ گویوں کی سخن سنجی سے سرمایہ شرمساری مترتب ہوا ہے اسی قدر ایسے اشعار کی بدولت گنجینہ ناز بھی ہاتھ آیا ہے واقعی سنائی ایسے حکیم دین و دنیا گزرے ہیں کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی اُن کے شرف حکمت مآبی کا قائل اگر نہ ہو تو آدمی نہیں ہے اس پر سے حضرت ولائے اہل بیت میں ایسے غرق معلوم ہوتے ہیں کہ خاندان نبوت کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے واقعی جب تک انسان کسی شئے کو محبوب نہیں رکھے گا اس کو گاہ و بے گاہ یاد نہیں کرے گا فرقہ شیعی مذہب کا حکیم سنائی کو نظر عظمت سے دیکھنا بے وجہ نہیں معلوم ہوتا ؛

انوری

حکیم اوحد الدین انوری قصیدہ گوئی میں مشہور آفاق ہیں۔ اطراف خراسان میں پیدا ہوئے سلطان سنجر سلجوقی کے عہد میں ان کی طباعی نے شہرت پکڑی واقعی انوری بڑے طباع تھے علم و فضل میں حکیم کا درجہ رکھتے تھے، مگر مولف کی دانست میں ان کی قصیدہ گوئی حکیم سنائی کی قصیدہ گوئی کی خوش مذاقی تک نہیں پہنچتی ہے انوری درباری شاعر تھے۔ مگر سنائی نے تقرب سلطانی سے اپنی شاعری کے دامن کو

آلودہ ہونے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سنائی کا کلام پاک اور مقدس نظر آتا ہے۔ ان دونوں حکیموں کے حالاتِ زندگانی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اہل کمال دو نہج کے آدمی تھے۔ انوریؔ طالب جاہ و منال تھے۔ اور سنائیؔ تارکِ دنیا انوریؔ نے اپنے کمالات علم و فضل کی بدولت تقرب سلطانی حاصل کیا۔ مگر سنائیؔ نے سلطانی تقرب سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ انوریؔ کے حالات میں محققین نے لکھا ہے کہ ایک روز آپ مدرسہ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ ملک الشعراء حکیم ابوالفتح کی سواری نہایت جاہ و احتشام کے ساتھ سامنے سے گزری۔ انوریؔ نے کہ مبتلائے افلاس ہو رہے تھے۔ پوچھا کہ یہ کون امیر ہے کہ اس تزک سے جاتا ہے لوگوں نے کہا کہ یہ شاعر بارگاہ سلطانی ہے۔ انوریؔ نے کہا کہ میں بھی اپنے کو سلسلہ شعراء میں داخل کروں گا۔ یہ ارادہ کر کے ایک قصیدہ مدحیہ خدمت شاہ میں پیش کیا۔ بادشاہ کو بہت پسند آیا سلطان بڑے اعزاز و احترام سے پیش آئے اور آخر کار انوریؔ کو ملک الشعراء کا رتبہ بخشا۔ اس کے برخلاف حکیم سنائیؔ کی سرگذشت نظر آتی ہے کہ سلطان وقت ابراہیم غزنوی نے اُن کا اپنی بہن سے بیاہ کر دینا چاہا، مگر سنائیؔ کی آزاد مزاجی نے بادشاہ کی خواہش پوری ہونے نہ دی آپ نے فوراً سفر حجاز اختیار فرمایا اور حج و زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ واضح ہو کہ انسان کے اخلاق و اطوار کو اس کے علم و فضل میں تمام تر دخل ہوتا ہے پس جب سنائیؔ کا انداز مزاج ایسا تھا تو ضرور ہے اس کے کلام میں بھی اس کے مزاج کا انداز پایا جائے۔ چنانچہ امر واقعی بھی ایسا ہی ہے کہ سنائیؔ کا کلام بڑی حوصلہ مندی سے خبر دیتا ہے۔ دنیائے دوں کی پستی کی طرف میلان نہیں رکھتا یہ بات درباری شاعر میں پائی نہیں جا سکتی

طالب جاہ ومنال کہاں تک عالی خیال ہو سکتا ہے۔ نہایت جائے افسوس ہے کہ سلاطین اسلام کی بدولت شاعری درجۂ ابتذال کو پہنچ گئی۔ جائے غور ہے کہ حکیم انوریؔ سے قابل شخص کو بھی اس کام کو کرنا پڑتا تھا جو سچے شاعر کے لئے ایک بڑے ننگ کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً سلاطین نے شاعری کو اپنی مداحی کے واسطے مختص سمجھا تھا پس انھیں شعراء کی عزت وآبرو ہوتی تھی جو اپنے بادشاہوں کی مدح میں کوئی دقیقہ دروغ گوئی کا اٹھا نہیں رکھتے تھے انوری کے اکثر قصائد گو بڑی طباعی سے خبر دیتے ہیں مگر درباری شاعری کے معائب سے بھرے ہیں راقم ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا درج کرتا ہے یہ نعتیہ قصیدہ ہے اور غرض قصیدہ گوئی کے موافق ہے حضرات ناظرین حصول ثواب فرمائیں اور اس کے مصنف عالی مقام کے لئے حق تعالیٰ سے خواستگار رحمت ہوں ؎

قصیدہ انوریؔ

اے شادی جان آفرینش	وے گوہر کان آفرینش
اے محرم خلوتی کہ آنجا	محو است نشان آفرینش
اے بلبل بوستان تجرید	در شورہ ستان آفرینش
در جلوہ کشید کشف لطفت	اسرار نہان آفرینش
در دیدہ وجود گفت بیرت	کای بخت جوان آفرینش
تا جستہ ز کرتنت روان تر	تیرے ز کمان آفرینش
آزاد مراتب یقینت	ز آسیب گمان آفرینش
سبے فاتحۂ ثنا بردہ	نام تو نشان آفرینش

در شیوهٔ اختراع ابداع — با تاب و توان آفرینش
کم کردہ گراں رکابی تو — تیزی عنان آفرینش
در بے جہتی ہلال قدرت — فارغ ز بستان آفرینش
در بے صفتی علو نعمت — برتر ز زبان آفرینش
تا بستہ نبود تا کہ بودہ — پیش تو میان آفرینش
ہیبت تو گرفتہ صد ولایت — زاں سوے جہان آفرینش
دہ یازدہ قبول داری — بر کل مکان آفرینش
بیش است زکات مایۂ تو — از سود و زیان آفرینش
سوگند بجان تو خورد عقل — یعنی کہ بجان آفرینش
پر تو بہ مجلست بہاریست — در فصل خزان آفرینش
افتادہ بر آستانہ شمع — مست از تو روان آفرینش
لوزینۂ استعارت تست — آرائش خوان آفرینش
نقد سخنت چو رائج افتاد — در داد و ستان آفرینش
پرسید ز عقل کل کہ آن چیست — گفتا ہمہ اہل آفرینش
صراف سخن کہ نفس کل است — بر طرف دکان آفرینش
تا ابلق تند دہر رام است — اندر رہ جسم و جان آفرینش
در خدمت دور نہ لتت باد — دوران زمان آفرینش
شیریں ز زبان شکر نیت — تا حشر دہان آفرینش

خاقانی: حکیم افضل الدین شروانی حسان عجم کی شہرت شاعری اُن کی قصیدہ گوئی کی وجہ

سے ہے اس صنف شاعری میں انھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی قصائد ان کے بہت پُر زور نظر آتے ہیں۔ اور ہر چند اکثر درباری شاعری کے عیوب سے پاک نہیں ہیں۔ اس پر بھی حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں لاریب خاقانی کے کلام میں بڑی نازک خیالی اور بلند پروازی دیکھی جاتی ہے فقیر کی دانست میں حکیم قاآنی کے قصائد اس قدر حکیمانہ انداز نہیں رکھتے گو ان کی شوکت لفظی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ خاقانی کے کلام کے نقصانات یہ ہیں کہ محض آسان مضامین بھی دقت خیز ترکیبوں سے حوالہ قلم کیئے گئے ہیں اور چونکہ عموماً بیان مضامین کا طور دشوار ہوا کرتا ہے پُر تاثیری ان میں کمتر پائی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی کو دم سخن سنجی یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ خوشخیالی لسانی کی محتاج نہیں ہے ظاہر ہے کہ خوب و مرغوب مضامین کج و کاواک بیان سے بے اثر ہو جاتے ہیں مسائل منطق کیلیئے سادگی بیان ہی عمدہ ہوا کرتی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عالی اور نازک خیالات ایسی دقیق ترکیبوں سے حوالہ قلم کیئے جائیں کہ معمے کی صورت پیدا کریں ذیل میں بطرز نمونہ کچھ اشعار قصیدہ نزہۃ الارواح و نزہۃ الاشباح سے نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

قصیدہ

شب رواں در صبح صادق کعبۂ جان دیدہ اند
صبح را چوں محرمان کعبہ عریاں دیدہ اند

از لباس نفس عریاں ماندہ چون ایمان صبح
ہم بصبح از کعبۂ جان روئے ایمان دیدہ اند

در شکر ریزند زنشتاب خوں کہ گردوں را بہ صبح
پچہ پستہ سبز و خوں آلود خنداں دیدہ اند

وادی فکرت بریدہ محرم عشق آمدہ
موقف شوق ایستادہ کعبۂ جان دیدہ اند

روز و شب دیدہ دوگا دلبستہ در قربانگہش
صبح را تیغ و شفق را خون قرباں دیدہ اند

خوانده اند از لوح دل شرح مناسک بهر آنکه — در دل از خط ید الله صد دبستان دیده اند

نام سلطان خوانده هم به پا مېخ سلطان از آنکه — دل علامتگاه پاسخهائے سلطان دیده اند

از کجا برداشته زاول ز بغداد طلب — در کجا در وادی تجرید امکان دیده اند

صبحدم رانده ز منزل تشنگان ناشنا — چاشت گه هم مقصد و هم چشمه هم خوان دیده اند

در سجود کعبهٔ جاں ساکنانِ سدره را — هم چو عقل ساکنان سرمست و حیران دیده اند

در حریم کعبهٔ جاں محرماں الیاس وار — علم خضر و چشمهٔ ماهی بریان دیده اند

در طریق کعبهٔ جان چرخ زریں کاسه را — از پئے دریوزهٔ جاں کاسه گردان دیده اند

کشتگان کز کعبهٔ جان باز جانور گشته اند — ماهی خضر اند گوئی کاب حیواں دیده اند

کعبهٔ جان زاں سوئے نه شهر جوی هفت و دو — کین دو چار النفس قومی طبع دهقان دیده اند

برگذشته زین ده و زاں شهر در اقلیم دل — کعبهٔ جان را به شهر عشق بنیان دیده اند

خاکیاں دانند راه کعبهٔ جاں سو گفتن — کین ره دشوار مشتے خاک آساں دیده اند

کعبهٔ سنگین مثال کعبهٔ جان کرده اند — خاصگان این را طفیل دیدن آن دیده اند

هر کبوتر کز حریم کعبهٔ جان آمد است — زیر پر آتش نامهٔ توفیق پنهان دیده اند

عاشقان اول طواف کعبهٔ جان کرده اند — پس طواف کعبهٔ تن عرض فرمان دیده اند

مطلع ثانی

با خیال دیده نقش کعبهٔ جان دیده اند — دیده را از شوق کعبه زمزم افشان دیده اند

اشعار بالا سے خاقانی کی طباعی ہویدا ہے یہ اشعار تمامتر حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں اس کی بلند پائگی معرض گفتگو میں نہیں آسکتی واضح ہو کہ خاقانی اکثر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں ان کا کمتر کوئی قصیدہ ہے جو اس پہلو سے خالی نظر آتا ہے یہ ایک بڑا

فرق درمیان خاقانی اور قاآنی کے حائل ہے کما لا یخفی علیٰ ارباب النظر والتحقیق۔

سعدی بحیثیت قصیدہ گو

شیخ علیہ الرحمہ کو قصیدہ گوئی سے بھی مناسبت حاصل تھی اور یہ مناسبت اس قسم کی نہ تھی جو قصیدہ گوئی کو بدنام کرنے والی ہوا کرتی ہے چونکہ حضرت کی طبیعت میں راست خیالی اور راست گفتاری داخل تھی آپ کے قلم سے ایسی باتیں نکل ہی نہیں سکتی تھیں جنھیں سن کر کسی حق گو یا حق جو کا دل پریشان ہو واقعی آپ قولاً و فعلاً مصداق راستی تھے اسی واسطے جب کوئی قصیدہ منظوم فرماتے تھے تو ظہیر فاریابی وغیرہ کی ترکیبوں سے تمامتر علیحدہ رہتے تھے عموماً آپ کا کلام بظاہر آسان اور بباطن دشوار نظر آتا ہے خیالات کی صفائی ایسی ہے کہ فردوسی۔ نظامی۔ انوری اور خاقانی کو بھی نصیب نہیں ہوئی جو بات زبان قلم پر آجاتی ہے ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے حضرت کی قصیدہ گوئی بھی ان صفات سے خالی نہیں ہے۔ ذیل میں ایک قصیدہ موعظت اور دو قصیدے تعریف ربیع کے نذر ناظرین ہوتے ہیں یہ تینوں قصیدے اغراض قصیدہ گوئی کے تمامتر موافق ہیں پہلا قصیدہ موعظت کا ہے اور حسن بیان سے معمور ہے اس کی پرتاثیری غافلوں کو ہوشیار بنا دینے والی اور سوتوں کو جگا دینے والی ہے ہر مصرع تصویر عبرت ہے فصیح سے فصیح اور بلیغ سے بلیغ واعظ بھی اس سے بہتر طریقہ وعظ اختیار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے مساجد میں سر منبر واعظین اس قصیدہ کو پڑھتے ہیں واقعی اس کی پرتاثیری ایسی ہے کہ اگر شخص دنیادار غفلت کردار اس کو بہ توجہ سنا کرے تو اس کی آنکھ میں دنیا ہیچ دکھائی دینے لگے اور یقیناً آخر کار اسے دنیا سے تنفر پیدا ہو جائے گا واہ سعدی واہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے خوب اس قول کو سمجھا تھا کہ دنیا روزے چند و آخر کار با خداوند۔ تب ہی تو آپ ایسی پرتاثیر زبان میں اس خیال کو نظم کر سکے بحضرات سخن آگاہ سے پنہاں نہیں ہے کہ

نیچرل شاعری کا کلام عموماً راستی سے مملو ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ راستی کے ساتھ کلام کمال درجہ کی شاعری کی صفت کے ساتھ بھی متصف ہو۔ یہ بڑی ندرت سے خبر دیتا ہے سعدی کی شاعری بھی ندرت رکھتی ہے کہ راستی مضامین کے اعلیٰ درجہ کے شاعرانہ حسن سے مزین پائی جاتی ہے اِس قصیدہ کو حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شروع سے آخر تک نہ صرف مصداق راستی ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کی تصویر بھی ہے اِس کے علاوہ دو اور دو قصیدے منسلک ہٰذا ہوتے ہیں وہ بھی اغراض قصیدہ گوئی کے تمامتر موافق ہیں۔ ان دونوں قصیدوں میں شیخ علیہ الرحمہ نے ربیع کی صفت بڑی عالی مذاقی کے ساتھ حوالۂ قلم فرمائی ہے اہل مذاق صحیح ان کو پڑھیں اور نیچرل شاعری کا لطف اُٹھائیں؛

واضح ہو کہ سعدی کے اِن دونوں ربیع کے قصیدوں کو دیکھ کر طامسن (THOMSON) شاعر انگلستان یاد آتا ہے اِس بامذاق شاعر نے بھی فصلوں کی کیفیتیں منظوم کی ہیں اس کی اِس تصنیف کا نام ٹامسنز سنیزنس ہے؛

قصیدۂ سعدی نمبر ۱

ترا ز کوے اجل کے فرار خواہد بود	قرار گاہ تو دار القرار خواہد بود
اگر تو ملک جہاں را بدست آوردی	مباش غرہ کہ ناپایدار خواہد بود
بمال غرہ چہ باشی کہ یک دو روزے چند	ہمہ نصیبہ میراث خوار خواہد بود
ترا بہ تختہ و تابوت درکشند از تخت	گرت خزانہ و لشکر ہزار خواہد بود
ترا بہ کنج لحد سالہا بباید خفت	تن تو طعمۂ مور و مار خواہد بود
اگر تو در چمن روزگار ہمچو گلے	دمیدہ بر سر خاک تو خار خواہد بود

نیاز مندی یاران نداردت سودے | مگر عمل کہ ترا بار یار خواہد بود
بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد | بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود
بسا امیر کہ آنجا اسیر خواہد شد | بسا اسیر کہ فرمان گزار خواہد بود
بسا امام ریائی و پیشوائے بزرگ | کہ روز حشر و جزا شرمسار خواہد بود
چراز حال قیامت ہمے نیندیشی | کہ حال بے خبران سخت زار خواہد بود
بہشت می طلبی از گنہ نہ پرہیزی | بہشت منزل پرہیزگار خواہد بود
گزر ز باطل و مردانہ حق پرستی کن | ز حق پرستی بہتر چہ کار خواہد بود
بساز چارۂ رفتن چو رہروان رفتند | کہ سعدی از تو سخن یادگار خواہد بود
بہ قطرہ قطرہ حرامت عذاب خواہد داد | بہ ذرہ ذرہ حلالت شمار خواہد بود

اے حضرات حقائق دستگاہ واقعی سعدی کا کلام کس قدر پُر تاثیر معلوم ہوتا ہے کون شخص دنیا میں ہے جو ان اشعار کو پڑھ کر دنیا کی طرف سے افسردہ خاطر نہ ہو گا یہ وہ اشعار ہیں کہ سلطنت دولت حکومت حسن شباب موت زور اور دنیا کی تمام نعمتوں کے نشہ کو پھاڑ ڈالنے والے ہیں واہ کلام ہو تو ایسا پُر تاثیر ہو یہ پُر تاثیری امر اختیاری نہیں ہے۔ ہر شاعر سعدی نہیں ہو سکتا یہ تمامتر خدا کی دین ہے جسکو خدا دے وہی پائے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست | تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قصیدہ نمبر ۲ در صفت ربیع

علم دولت نوروز بصحرا برخاست | لشکرِ زحمتِ سرما ز سرِ ما برخاست
تا ربایند کلہِ قاقمِ برفت از سرِ کوہ | یزکِ تابشِ خورشید بہ یغما برخاست

بر عروسان چمن بست صبا هر گهرے
که بغوّاصی ابر از دل دریا برخاست

با چه بوئےست که از جانب خلّخ بدمید
وین چه بادیست که از جانب صحرا برخاست

به هوائے است که خلدش بتحیر بنشست
چه زمینے است که چرخش بتولا برخاست

ام اخضر از عکس چمن حمرا گشت
بسکه از طرف چمن لولوے لالا برخاست

یم نغمهٔ چنگ است که در بزم صبوح
بلبلان را ز چمن ناله و غوغا برخاست

وے آلودگی از خرقهٔ صوفی آمد
شور دیوانگی از سینهٔ دانا برخاست

از زمین نالهٔ عشاق بگردون برسید
وز ثری نالهٔ مستان به ثریا برخاست

بسکه خوبان به تفرج سوے بستان رفتند
الغیاث از چمن و گلبن حمرا برخاست

عاشق امروز بذوقی بر زاهد بنشست
که دل زاهد از اندیشهٔ فردا برخاست

هر کجا طلعت خورشید رخے سایه فگند
بیدلے پخته کمر بسته چو جوزا برخاست

هر کجا سرو قدے چهره چو یوسفؑ به نمود
عاشقے سوخته خرمن چو زلیخا برخاست

هر کسے را هوس روے گلے در سر شد
نه که این ولوله از بلبل تنها برخاست

بار خش لاله ندانم بچه رونق بشگفت
یا قدش سرو ندانم بچه یارا برخاست

سر ببالین عدم باز نه ای نرگس مست
که ز خواب سحر آن نرگس شهلا برخاست

بسخن گفتن او عقل ز هر دل برمید
عاشق آن قد سروم که چه زیبا برخاست

وز رویش چو برانداخت نقاب سر زلف
گوئی از روز قیامت شب یلدا برخاست

ورق خوبی معشوق ز هم بر گردید
قلم عافیت از عاشق شیدا برخاست

دل عشقش نه بصبر جهان غارت کرد
که جهان را ز حرم راز معما برخاست

سعدیا نامه سیه کردن سودا تا کے
که قلم را بسر از دست تو سودا برخاست

قصیدہ سعدی نمبر ۳

بامدادان کہ تفاوت نکند لیل و نہار   خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار
صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار   وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار
کوہ و دریا و درختاں ہمہ در تسبیح اند   نہ ہمہ مستمعاں فہم کنند این اسرار
بلبلاں وقت گل آمد کہ بنالند از شوق   نہ کم از بلبل مستی تو بنال اے ہشیار
آفرینش ہمہ تنبیہ خداوند دل است   دل ندارد کہ ندارد بخداوند اقرار
ایں ہمہ نقش عجب بر در و دیوار وجود   ہر کہ فکرت نہ کند نقش بود بر دیوار
خبرت نیست کہ مرغان چمن می گویند   کآخر اے خفتہ سر از بالش غفلت بردار
ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت او   غالب آن است کہ فرداش نہ بیند دیدار
تا کے آخر چو بنفشہ سر غفلت در پیش   حیف باشد کہ تو در خوابی و نرگس بیدار
کہ تواند کہ دہد میوہ رنگین از چوب   یا کہ داند کہ بر آرد گل صد برگ از خار
وقت آنست کہ داماد گل از حجلہ غیب   بدر آید کہ درختاں ہمہ کردند نثار
آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب   سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار
باش تا غنچہ سیراب دہن باز کند   بامدادان چو سر نافہ آہوئے تتار
مژدگانی کہ گل از غنچہ برون می آید   صد ہزار اقچہ بریزند عروسان بہار
باد گیسوئے عروساں چمن شانہ کند   بوئے نسرین و قرنفل ببرد در اقطار
ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر   راست چوں عارض گلگوں عرق کردہ یار
باد بوئے سمن آورد و گل و سنبل و بید   در دکان بچہ رونق بگشاید عطار

خیری و خطمی و نیلوفر و بستان افروز | نقشہائے کہ در و خیرہ بماند ابصار
ارغوان ریختہ بر درگہ خضرائے چمن | ہمچنان است کہ بر تختۂ دیبا دینار
این ہنوز اول آثار جہان افروزی است | باش تا خیمہ زند دولت نیسان و ایار
شاخہا دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز | باش تا حاملہ گردند بالوان ثمار
حیف از عمر گرانمایہ کہ در لہو برفت | یارب از ہرچہ خطا رفت ہزار استغفار
درد پنہاں بہ تو گویم کہ خداوند منی | یا نگویم کہ تو خود مطلعی بر اسرار

مولانا جمال الدین عرفی شیرازی :-

یہ شاعر گرامی ہندوستان میں شہرت عظیم رکھتا ہے مگر اس سے اہل ایران بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ عرفی ۔ حزین کی طرح ایران میں غیر معروف نہیں ہے شہرت عرفی کی قصیدہ گوئی کی بنیاد پر ہے اس کے قصائد درسیات میں داخل ہیں عرفی کی قصیدہ گوئی ایک ممتاز پایہ رکھتی ہے لیکن جو ایشیائی شاعری کے نقائص ہیں اس شاعر کے قصیدوں میں موجود ہیں عرفی کے قصائد کا مجموعہ جس کا معروف نام قصائد عرفی ہے ایسے قصیدوں پر مشتمل ہے جو علاوہ قصائد حمد و نعت و منقبت کے اکبر شاہنشاہ دہلی شاہزادہ سلیم و دیگر امرائے دربار کے مدحیہ قصائد ہیں اور تمامتر درباری رنگ رکھتے ہیں عرفی ایک ذی علم شاعر تھا ۔ اور چونکہ اہل زبان سے ہے ضرور اسے وہ آسانی بیان کی حاصل تھی جو فارسی میں ہندی قصیدہ گو کو فطرت کی رو سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے ۔ واضح رہو کہ اس کتاب میں راقم الحروف کو کسی ملک کی زبان سے بحث نہیں ہے اس لیے یہاں جو کچھ خیالات فقیر کے حوالۂ قلم ہوتے ہیں ۔ ان کو مجرد شاعری سے تعلق ہے اس پہلو سے عرفی کی نسبت یہ عرض اہم ہے کہ عرفی ایک ممتاز شاعر ہے کوئی تعجب

نہیں کہ عہد اکبر اعظم میں اس کی طباعی نے فروغ پکڑا اور آج تک اس کی شاعری کی شہرت قائم رہ گئی ہے لاریب یہ شاعر گرامی دشوار گو مضمون آفرین اور خوش خیال ہے مگر اپنے خیالات کو آسان ترکیبوں سے حوالۂ قلم نہیں کر سکتا ہے ہں کے کلام میں استعارات کی ایسی کثرت ہے کہ بسا اوقات دم کو الجھن ہونے لگتی ہے تشبیہات بھی افراط کے ساتھ داخل کلام دیکھی جاتی ہیں مگر مبالغات درجۂ مبالغہ کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عرفی کی شاعری یوروپین شاعری کے ساتھ کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتی ہے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ان کا ترجمہ کسی مغربی زبان میں حسبِ مُراد اچھے طور پر نہیں ہو سکتا ہے عرفی کو قصیدہ گوئی میں زیادہ تر داخلی شاعری کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے برخلاف مرزا حبیب قاآنی کے جو اس صنف شاعری میں تمامتر خارجی پہلو کے پابند دکھاتی دیتے ہیں۔ عرفی ہرچند ایک نامی شاعر ہے مگر اس کو نیچرل شاعری کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ کشمیر کی تعریف میں جو اس کے اشعار قصیدہ میں ان کو فطرت نگاری سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ہے مطلع ہی اس قصیدہ کا ایشیائی مبالغہ نگاری کی پوری تصویر دکھائی دیتا ہے۔

ہر سوختہ جانیکہ بہ کشمیر در آید ۔۔۔ گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

سارا قصیدہ پڑھ جایئے کہیں بھی کسی سبزی کا بیان حوالۂ قلم نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ ہر جگہ مبالغوں کی بھرمار ہے جس سے طبیعت کو شگفتگی خاطر کا نصیب ہونا معلوم کشمیر کے وصف میں اگر یہ قصیدہ لکھا گیا تھا تو ضرور تھا کہ کشمیر کا بیان فطری رنگ رکھتا۔ کشمیر ایک دلچسپ جگہ ہے اس کا سچا بیان ضرور ہے کہ مسرت خیز ہو۔ اس کے جبال صحرا چشمے سبزہ زار۔ مرغزار لالہ زار جنگل دحوش طیور اور ہزاروں

اقسام کے اظہار و اثمار ایک نیچرل شاعر کے لیے سرمایۂ کثیر کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مولانا عرفی کو نیچرل شاعری کا مذاق ہوتا تو کشمیر کی تعریف میں ایسا کوڈھنگا قصیدہ تصنیف نہ فرمائے ہوتے۔ یورپ کا ایک نیچرل مذاق کا شاعر کشمیر کا ایک ایسا فوٹو تیار کر دیتا جس سے اہل مذاق کو کشمیر کی پوری سیر نصیب ہو جاتی۔ بہت جائے افسوس ہے کہ عموماً فارسی کے قصیدہ گو شعرا نیچرل مذاق سے محروم پائے جاتے ہیں لاریب جس شاعر کو نیچرل مذاق کی دولت نصیب نہیں ہے اس کا کلام دل میں جگہ نہیں کر سکتا۔ ذیل میں ایک قصیدہ اس شاعر گرامی کا داخل کتاب ہذا کیا جاتا ہے یہ قصیدہ حمد کا ہے جیسا کہ مولانا عرفی کا دستور ہے نازک خیالیوں کی دستیابی کا سامان اس قصیدہ میں بھی کثرت استعارات کے ذریعہ سے عمل میں لایا گیا ہے اس پر بھی یہ قصیدہ بہت کچھ قابل توجہ ہے

قصیدہ عرفی

اے متاع درد در بازار جان انداختہ	گوہر ہر سود در جیب زیان انداختہ
نور حیرت در شب اندیشۂ اوصاف تو	بس ہمایوں مرغ عقل از آشیان انداختہ
از کمان ناجستہ چشم تحیر کردہ جا	معرفت کو تیر حکمی بر نشان انداختہ
اے بطبع باغ کون از بہر برہان حدوث	طرح رنگ آمیزی از فصل خزان انداختہ
سرعت اندیشہ را افگندہ در دامان تیر	عادت خمیازہ در جیب کمان انداختہ
در چمن ہائے محبت ہر قدم چون کربلا	از نسیم عشوہ فرش ارغوان انداختہ
مرغ طبع اندر ہوائے معصیت نکشودہ بال	عفو تو شاہین رحمت را بران انداختہ
سایہ پرورد غمت در آفتاب رستخیز	فرش استبرق بزیر سائبان انداختہ

طعمۂ عشق ترا از مغز جان آوردہ ام
آں ہما تا سایہ بر ایں استخواں انداختہ

اے بذلت را روائی دادہ در بازار عشق
عزت و شان ترا از اوج عزوشان انداختہ

ہر کجا تاثیر غم را دادہ اذن عموم
شادی راحت نشاں را ناتواں انداختہ

زیں خجالت چوں بروں آیم کہ در موج خول
نو عروسان غمت را موکشاں انداختہ

فیض را نازم کہ ہر کس پا براہت ماندہ ہست
دل بدست آوردہ و جاں را از میاں انداختہ

صید دل را بہر آگاہی ز صیاد ازل
در کمند طرۂ عنبر فشاں انداختہ

کردہ از عرفاں لباس عجز را دامن دراز
کوتہی در جیب عقل نکتہ داں انداختہ

طعمہ کز خوان عشق افگندہ ام در کام دل
ریزۂ آں را جحیم اندر دہاں انداختہ

شرع گوید منع لب کن عشق گوید نعرہ زن
کاسے توہم در رہ عشق خود عناں انداختہ

دولت وصلت کہ دریابد کہ با آں محرمی
جوہر اول علم بر آستاں انداختہ

حیرت حسن ترا نازم کہ در بزم وصال
جام آب زندگی از دست جاں انداختہ

وصف صنعت کز لب ہر ذرہ میریزد سخن
نطق را در معرض عقد اللساں انداختہ

در ثنایت چوں کشایم لب کہ برق ناکسی
منطقم را آتش اندر خان و ماں انداختہ

من کہ باشم عقل کل را نادک انہم از ادب
مرغ اوصاف ترا از اوج بیاں انداختہ

مست ذوق عرفیم کز نغمۂ توحید تو
لذت آوازہ در کام جہاں انداختہ

قاآنی حکیم مرزا حبیب شیرازی مشہور بہ قاآنی۔ اطراف شیراز میں پیدا ہوئے والد بزرگوار ان کے مرزا ابو الحسن گلشن تخلص کو فن شاعری کے ساتھ بڑی شیفتگی پیدا تھی بیٹے کو اس کی طرف مائل پاکر چاہا کہ اس فن کی تعلیم دیں چنانچہ قاآنی کو نہایت

کم عمری میں خراسان کی جانب بھیج دیا۔ مشہد مقدس میں مرزا حبیب نے علوم مروجہ میں دستگاہ حاصل کر کے شاعری کا مشغلہ شروع کر دیا۔ چونکہ اس فن کے ساتھ طبیعت کو بڑی مناسبت حاصل تھی۔ سخن سنجی میں جلد مشہور دیار و امصار ہو گئے، کوئی شک نہیں کہ قاآنی کو شاعری کی بڑی قوت حاصل تھی۔ لیکن اگر اس شاعر کی فطری استعداد میں تقاضائے زمان و مکان کو دخل نہ ہوتا تو یہ وہ شاعر تھا کہ جودت طبع اور جدت فکر کی بدولت عالم میں اپنا ڈنکا بجا دیتا۔ مگر اس بڑے طباع کو بھی اُن ہی مکروہات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کے مبتلا قبل میں عنصری۔ فرخی عسجدی، انوری۔ عرفی وغیرہ ہو چکے تھے۔ بہت جائے افسوس ہے کہ یہ شاعر کسی ایسے آزاد ملک میں پیدا نہ ہوا جہاں شاعری سے بھٹئی کا کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ جہاں شاعری دولت اور حکومت کے فکر و ذکر سے تمام تر لب بند اور خاموش رہا کرتی ہے بہت جائے حیرت ہے کہ اس انیسویں صدی میں زمانہ نے بہت کچھ ترقیاں کیں۔ مگر فارسی کی قصیدہ گوئی جس مبتذل حالت میں تھی رہ گئی، قاآنی کی قابلیتوں کو خیال کر کے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ یہ نادر روزگار اسی صدی میں تھا جس میں اہل یورپ و اہل امریکہ نے انواع صورتوں کی ترقیاں نمایاں کیں مگر اس کی شاعری اُن بدحالیوں میں مبتلا رہی جن میں اس کے قبل کی صدیوں کی شاعری علی الاتصال گرفتار چلی آئی۔ حالات قاآنی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی شاعری پر اُس کی ملکی بد مذاقیوں کا کیونکر اثر پڑا جس سے نہ اُسے اور نہ اس کی شاعری کو حافظ یا سعدی کی عظمت و جلالت کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ المختصر جب قاآنی کا نام فن شاعری میں بلند ہوا اس کی شہرت نے اُسے

شاہزادہ حسن علی مرزا والئی خراسان کی خدمت میں پہنچایا۔ واضح ہو کہ قاآنی کے درباری شاعر ہونے کی ابتدا اسی وقت سے ظہور میں آئی۔ شروع شروع میں اس کی شاعری کی آزادی کو داغ یہی تقرب سے لگا۔ شاہزادہ نے قاآنی کو ایک قابل شاعر پاکر سلسلۂ ندما میں داخل کیا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کو سلاطین و امرا کی ندیمی سے کیا علاقہ لیکن جب یہ حکیم ندیم بنا تو ایشیائی درباروں کی بے عنوانیوں سے اس کا مامون رہنا محال تھا پس تقاضائے خدمت سے ندیموں کی طرح عمر بسر کرنے لگا اور اس تعلق کی حالت میں اس نے خدمت ندیمی کی مشق کو اس درجہ تک پہنچایا کہ تھوڑے عرصے کے بعد اسے فتح علی شاہ کی حضوری نصیب ہوئی تو بے تکلف ندمائے شاہنشاہی میں در آیا۔ یہ تقرب شاہی اُسے تا دمِ آخر نصیب رہا یعنی فتح علی شاہ جنت آرامگاہ کے بعد محمد شاہ بہشت آرام کی ندیمی کرتا رہا۔ پھر بھی خدمت مرزا ناصرالدین شاہ خلد مکان کے عہد میں برقرار رہی حتیٰ کہ ۱۲۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوا اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ درباری شاعر کی عمر بڑی امید و بیم میں بسر ہوتی ہے ہمیشہ اُسے بادشاہ اور امرا کی رضامندی کی فکر رہتی ہے امید نان و بیم جان کا مضمون پیش نظر رہتا ہے چنانچہ یہی حالت قاآنی کی تمام عمر رہی تا دمِ آخر یہ شاعر کامل ابنائے سلاطین و امرا کی خوشامدیں کرتا رہا۔ اور اپنے کمال شاعری سے شاعری میں داغ نقصان لگاتا رہا اس یکتائے روزگار کا دیوان کھول کر دیکھیے تو چند قصیدوں کے سوا جتنے قصیدے ہیں سب کے سب شاہان و اہل حکومت ہی کی مدح میں دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تیری پناہ۔ جس شاعر کا یہی روزگار دھندا ہو کہ طرح طرح کے جھوٹے اور غیر فطری مضامین دل سے گڑھ گڑھ کر حوالۂ قلم کیا کرے۔ تو اس کے دل میں

راست بازی اور فطرت پسندی کی کیا صلاحیت باقی رہ سکتی ہے پس ایسا شاعر سچی شاعری کی کیا داد دے سکتا ہے اور شاعری کی بلند پائگی کو قائم رکھ سکتا ہے راقم ذیل میں حکیم قاآنی کے دو قصیدے نذر ناظرین کرتا ہے ایک قصیدہ امام ہشتم علیہ السلام کی ثنا میں ہے اور دوسرا ویسا ہی مدحیہ ہے جیسا کہ امرا و سلاطین کے لئے لکھا جاتا ہے۔

اشعار از قصیدۂ منقبت در شان سیّد نا امام علیہ التحیۃ والثنا

بگردون تیرہ ابرے بامدادان بر شد از دریا / جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا
چو چشم اہرمن خیرہ چو روے زنگیان تیرہ / شدہ گیتی ہمہ چیرہ بہ مغزش علت سودا
شبہ گون چون شب غاسق گرفتہ چون دل عاشق / بہ اشک وے بدہ وامق بزنگ طرۂ عذرا
تنش با قیر آلودہ و لبش از شیر آمودہ / برون پر سرمۂ سودہ درون پر لولوے لالا
بدل گلشن بہ تن زندان گہے گریان گہے خندان / چو در بزم طرب رندان ز شور نشئہ صہبا
چو دیوے بر ہوا رفتہ چو دیوے مست آشفتہ / زدہ بس دُر نا سفتہ ز مستی خیرہ بر خارا
شدہ خورشید نور افشان بہ تارے جسم او پنہان / چو شاہ مصر در زندان چو ماہ چرخ در ظلما
دیا در تیرہ چہہ بیژن نہفتہ چہرۂ روشن / دیا روشن گہر بہمن شدہ در کام اژدرہا
لب غنچہ رخ لالہ برون آوردہ تبخالہ / ز بس باران ازان فرخ الہ بہ طرف گلشن و صحرا
ز فیض او دمیدہ گل شمیدہ طرۂ سنبل / کشیدہ از طرب بلبل بہ شاخ سرخ گل آوا
عذار گل خراشیدہ خط ریحان تراشیدہ / ز بس الماس پاشیدہ بہ باغ از ژالۂ بیضا
از او اطراف خارستان شدہ یکسر بہارستان / و ز و رشک نگارستان زمین از لالۂ حمرا
فگندہ بر سمن سایہ دمن را دادہ سرمایہ / چمن زد عرق پیرایہ چو رنگین خامۂ عنقا

ز بیمش مرغ جاں پرّد ز سہمش زہرہا درّد
چو او چوں اژدہا غرّد و یا چوں دُد کشد آوا

بخروشد ہر دم از گردوں کہ پوشد بر تن ہاموں
ز سنبل کسوت اکسوں ز ژالہ خلعت دیبا

فشاند بر چمن ژالہ دماند از دمن لالہ
چناں از دل کشد نالہ کہ سعد از فرقت اسما

کنوں از فیض او بستاں نماید از گل و ریحاں
برنگ چہرۂ غلماں بہ بوئے طرۂ حورا

چمن از سرو و سیسنبر ہمال خلخ و کشمر
دمن از لالہ و عبہر طراز تبت و یغما

زبس گلہائے گوناگوں چمن چوں صحف انگلیوں
تو گوئی فرش سقلاطوں صبا گسترده در مرعیٰ

زبس خوباں فرخ رخ گلستاں غیرت خلّخ
ہمہ چوں نوش در پاسخ ہمہ چوں سیم در سیما

زبس لالہ زبس نسریں دمن رنگیں چمن مشکیں
زبوئے آں ز رنگ ایں ہوا دلکش زمیں زیبا

گل زباد وزاں لرزاں وزاں مشک ختن ارزاں
بلے نبود شگفت ارزاں کساد عنبر سارا

ز فرّ لالہ و سوسن ز نور نار نسترون
دمن چوں وادی ایمن چمن چوں سینۂ سینا

چو در ہاموں چو در بستاں صف اندر صف گل و ریحاں
زیکسو لالۂ نعماں زیکسو نرگس شہلا

تو گوئی اہل ایں کشور برہنہ پا برہنہ سر
چناں در خشک سال اندر بہ ہاموں بہر استقا

چمن از فر فروردیں چناں نازاں بدشت چیں
کہ طوس از فر شاہ دیں بریں نہ گنبد خضرا

واضح ہو کہ اس قصیدہ میں ۸۵ شعر ہیں اور سب اشعار آبدار ہیں بسبیل اختصار ان میں سے کچھ اشعار نقل کر لئے گئے۔ سبحان اللہ کیا سخن آوری ہے متاخرین کو یہ شاعری کیا نصیب ہوتی متقدمین میں بھی یہ طباعی خاقانی کے سوا کسی اور میں پائی نہیں جاتی قاآنی کی تشبیہوں کے مضامین اکثر خارجی رنگ رکھتے ہیں یہ رنگ قصیدہ گوئی کے لئے نہایت مناسب ہے بلکہ قصیدہ کے تشبیبی اشعار کا داخلی رنگ رکھنا قصیدہ کو غزل نما کر دیتا ہے واضح ہو کہ یہ بڑے عالی فکر اور با مادہ شاعر کا کام ہے کہ داخلی رنگ

میں قصیدہ لکھے اور قصیدہ کو غزل نما ہونے نہ دے بہر حال قصیدہ بالا میں جو قاآنی کا رنگ ہے تمام تر قصیدہ گوئی کے حسب حال ہے کاش اس خلاق سخن کے تمام قصائد حمد و نعت و منقبت و مسائل علوم و فنون وغیرہ سے مشتمل ہوتے ہزار حیف کہ اتنی بڑی قابلیت کے شاعر کو مدح سرائی کا مبتذل کام انجام کرنا پڑا اور شاہان و امراء کی پابوسی میں اس کی عمر گرامی تمام ہوئی۔ خیر مقدرات سے کوئی چارہ نہیں ہے اب حضرات اہل انصاف اس شاعر کی خوبیوں پر نظر انصاف ڈالیں واضح ہو کہ یہ قصیدہ منقبت امام ضامن ثامن میں ہے یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص آل محمدؐ کی ثنا خوانی حق ثنا خوانی کے مطابق انجام کر سکے تو بھی بحد طاقت بشریہ یہ ایسا قصیدہ منقبت لکھا گیا ہے کہ اگر اس کی ربع خوبیوں کے برابر کوئی شاعر اظہار فکر کرے تو اسے جس لقب گرامی سے دوستداران آل محمدؐ یاد کریں بجا درست ہے اس قصیدہ کے اشعار تشبیب شوکت لفظی اور معنوی ایسے رکھتے ہیں کہ کمتر کسی قصیدہ کے اشعار تشبیب اس صفت خاص سے متصف دیکھے جاتے ہیں۔ فصاحت کا خاتمہ نظر آتا ہے فصاحت کے ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دکھا رہی ہے رنگینی الفاظ کا یہ عالم ہے کہ مینا کاری کا حکم رکھتی ہے جو لفظ جہاں پر ہے وہ ایک جڑاؤ جوہر ہے ان سب ندرتوں کے ساتھ عالی خیالی بلند پروازی نفاست پاکیزگی تمکنت اس درجہ کی ہے جس کی اعلیٰ درجہ کی شاعری متقاضی ہے ان محاسن کے علاوہ یہ اشعار نیچرل خوبیوں سے مملو ہیں قاآنی نے ملک ایران کی بہار کی تصویر ان اشعار میں کھینچی ہے۔ اشخاص ہندی وطن کے لئے ایسی بہار کو بغیر اس کے دیکھے سمجھنا خلاف توقع ہے ایران کی بہار ہندوستان کی بہار سے آسمان زمین کا فرق رکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں نہ

خزاں ہے نہ بہار ہے کوئی ایران کی بہار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو سمجھے کہ بہار کسے کہتے ہیں وہاں کی خزاں جیسی عبرت خیز ہوتی ہے ویسی ہی بہار بھی عشرت انگیز ہوتی ہے۔ تشبیب کے بعد گریز کیسی خوبصورت ہے پھر اشعار منقبت ایسے ہیں کہ درگاہ امام علیہ السلام میں ان کی مقبولیت مرتبہ یقین رکھتی ہے آفرین صد آفرین بر روح قاآنی باد

قصیدہ قاآنی نمبر ۲

واضح ہو کر یہ قصیدہ کسی حاکم وقت کی مدح میں لکھا گیا ہے نفقیر نے اُس میں سے صرف اشعار تشبیب انتخاب کر لیئے ہیں۔ بقیہ اشعار قصیدہ روٹی کما کھانے کے ہیں جیساکہ درباری رنگ کے اشعار ہوا کرتے ہیں بہرحال اس کے اشعار تشبیب بہت کچھ قابل توجہ ہیں اور اس بات کے ثابت کرنے والے ہیں کہ قاآنی ان شاعروں میں ہے کہ جب آسمان سیکڑوں برس چکر کھاتا ہے تب ایسے شعرائے گرامی پیدا ہوتے ہیں اُس کی بھی تشبیب بہاریہ ہے اور بہار ایران کی تصویر ہے اسی لیئے اس کے جتنے اشعار ہیں محض خارجی رنگ رکھتے ہیں ؛

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئبار ہا — کہ بوئے مشک میدہد ہوائے مرغزار ہا
فراز خاک و خشتہا دمیدہ سبز کشتہا — چہ کشتہا بہشتہا نہ دہ نہ صد ہزار ہا
بہ چنگ بستہ چنگہا بہ تارے ہشتہ زنگہا — چکاوہا کلنگہا تذروہا ہزار ہا
زنای خویش ناختہ دو صد اصول ساختہ — ترانہا نواختہ چو زیر و بم تار ہا
زخاک رستہ لالہا چو بسدیں پیالہا — ببرگ لالہ ژالہا چو در شفق ستارہا
فگندہ اند ہمہمہ کشیدہ اند زمزمہ — بشاخ سرو بن ہمہ چہ کبکہا چہ سارہا

نسیم روضهٔ ارم جهد به مغز دمبدم   ز لبس دمیده پیش هم بطرف جویبارها
بهارها بنفشه ها شقیقها اشگوفها   شمامها خجسته ها ارا کها عرارها
زهر کرانه مستها پیالها بدستها   ز مغز مے پرستها نشانده می خمارها
ز ریزش سحابها بر آبها حبابها   چو جوے نقره آبها روان ز آبشارها
فراز سرو بوستان نشسته اند قمریان   چو مقریان نغز خوان بز مردین منارها
فگنده اند غلغله دو صد هزار یکدله   به شاخ گل پے گله ز رنج انتظارها
درختهاے بارور چو اشتران باربر   همی ز لپشت یک دگر کشیده صف قطارها
مهار کش شمالستان سحاب بهار جالستان   اصولستان عقالستان فروعستان مهارها
دریں بهار دلنشیں که گشته خاک عنبریں   ز من ربوده عقل و دین نگارے از نگارها
رفیق جو شفیق خو عقیق لب شقیق رو   رفیق دل دقیق مو چه موز مشک تارها
بطره کرده تعبیه هزار طبله غالیه   به مژده لبسته عار به برنده ذو الفقارها
مهی دو عوت سال او سواد دیده خال او   شگفته از جمال او بهشتها بهارها
دو کوزه شهد در لبش دو چهر ماه نخشبش   نهفته زلف چون شبش ببارها تتارها
سهیل حسن چهر او دو چشم من سپهر او   مدام مست مهر او نبیذها عقارها
چه گو همیت که دوش چون بناز و غمزه شد برون   به حجره آمد اندرون لبطرز مے گسارها
بکف نطعی ز سرخ مے که گراز و چکد به نے   رهی ز بند بند وے برون جهد شرارها
دونده در دماغ و سر جهنده در دل و جگر   چنانکه بر جهد شرر به خشک ریشه خارها
مر العشوه گفت هے ترا ست هیچ میل مے   بگفتمش بیاد کے بگفتش ہے بیارها
خوش هست کامشب اے صنم خوریم مے بیاد جم   گرگشته دولت عجم قوی چو کوهسارها

زسعی صدر ناموں مہین امیر دا دگر ۔۔۔ گرد و کشود باب در زجصن واز حصار

اُردو کی قصیدہ گوئی

اُردو کی قصیدہ گوئی کا انداز تو وہی ہے جو فارسی کی قصیدہ گوئی کا ہے مگر اُردو میں قصیدہ گوئی کو فارسی کے برابر فروغ حاصل نہیں ہوا ہے اس کی چند وجہیں دیکھی جاتی ہیں اوّل یہ کہ فارسی اُردو کے اعتبار سے قدیم تر زبان ہے چند صدیاں اردو کے وجود کے پہلے فارسی میں قصیدہ گوئی بہت زور شور کے ساتھ رواج پکڑ چکی تھی سیکڑوں سلاطین گزر چکے تھے اور ہزاروں شعراء دفاتر سیاہ کر چکے تھے پس اُردو نے اتنا زمانہ ہی نہیں پایا کہ اس صنف شاعری میں فارسی کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکے دوم یہ کہ جس وقت میں اُردو کی قصیدہ گوئی نے صورت امتیاز حاصل کرنا شروع کی اُس وقت سلاطین ہند مبتلائے ادبار ہو چکے تھے اُن کے اختیار میں اتنا بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے مداحوں کی اوقات بسری کا کوئی معقول سامان کر سکیں اردو کے نامور قصیدہ گو شاعروں میں مرزا رفیع سوداؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ ہیں ان دونوں کی حالت معاش کو اسی سے قیاس کرنا چاہیے کہ سوداؔ تکلیف بے زری سے دہلی سے پایۂ تخت کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور ذوقؔ جو دہلی میں رہے بھی تو مبتلائے افلاس رہے حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوقؔ اور چار روپیہ ماہانہ کی نوکری اختیار کریں اور اس تنخواہ سے رفتہ رفتہ بہ ہزار خرابی آخر عمر میں سو روپیہ ماہواری تک پہنچیں۔ یہ دو مثالیں اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ ہندوستان میں جس وقت اردو کی قصیدہ گوئی رواج میں آئی وہ وقت اس صنف شاعری سے حصول مال و منال کا نہ تھا پس ایسی حالت میں اردو کی قصیدہ گوئی کا فروغ فارسی کے

ہر کیونکر ہو سکتا تھا۔ سوم یہ کہ فارسی میں ایسے درجہ کے شعرائے قصیدہ گو جو وفور علم د
ش کے باعث حکیم کا درجہ رکھتے تھے کثرت سے گزرے ہیں اُن کے فضل و کمال
ا ایک شاعر بھی اُردو زبان میں نظر نہیں آتا ہے اُردو میں جو کچھ ہیں حضرت سودا ہیں
ر سودا نہ ہوتے تو اردو کی قصیدہ گوئی کو زیر بحث لانا بھی فضول ہوتا المختصر اردو کی قصیدہ
وئی کو فارسی کی قصیدہ گوئی کے ساتھ مقابلہ کی کوئی صورت حاصل نہیں ہے اُردو
ں نہ سعدی اور سنائی کے درجہ کا اخلاق آموز کوئی قصیدہ گو گزرا ہے اور نہ خاقانی و
ری و قاآنی وغیرہ وغیرہ کی ترکیبوں کا برتنے والا پیدا ہوا ہے بہر حال جو کچھ حالت
رجودہ اُردو کی قصیدہ گوئی کی ہے ذیل کے بیانات سے منکشف ہوگی۔

ظاہرا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے قصیدے اُردو زبان میں تصنیف ہوئے
ربار ی یا مذہبی اغراض سے لکھے گئے ہیں مذہبی اغراض کے قصائد درباری
غراض کے قصائد سے بہت کم ہیں اس کی وجہ محتاج بیان نہیں ہے دنیاوی
ضرورتیں دینی ضرورتوں پر ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہیں اس کے ثبوت میں راقم استاد
وق کے قصائد پر حوالہ کرتا ہے دیوان ذوق میں منجملہ ۲۴ قصیدوں کے ایک قصیدہ
بھی نہیں ہے جو حمد خدا یا نعت محمد مصطفیٰ یا منقبت علی مرتضیٰ یا محامد ائمہ باصفا میں
ں لکھا گیا ہو صرف ایک قصیدہ ہے جو کسی درویش موسوم بہ عاشق نہال کی شان
ں ہے اسی سے سمجھنا چاہیئے کہ بیچارے ذوق کو درباری تعلقات سے اتنی فرصت
ہاں تھی کہ بہ حیثیت شاعر پیغمبر کی خدمت کر سکتے۔ البتہ سودا مومن غالب وغیرہ
ے درباری قصائد کے علاوہ کچھ مذہبی قصائد بھی لکھ کر سعادت عقبیٰ حاصل کی ہے
ختصر اُردو میں درباری قصیدوں کی تعداد مذہبی قصائد کے اعتبار سے بہت زیادہ

پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں ترکیبوں کے قصائد کے سوا اور کسی ترکیب کا قصیدہ اردو میں پایا نہیں ہے۔ یا راقم کی نظر سے نہیں گزرا ہے راقم نے آج تک کوئی قصیدہ اردو میں ایسا نہ دیکھا جو قصائد سبعہ معلقہ کی ترکیب رکھتا ہو یا سعدی یا سنائی کے اخلاق آموز قصائد کا جواب سمجھا جائے۔ درحقیقت اردو کے قصائد بیشتر ایک تنگ دائرہ خیال میں محدود پائے جاتے ہیں خاص کر وہ قصائد جو درباری رنگ رکھتے ہیں ایسے قصائد کے مضامین ہمیشہ اُن خیالات پر مشتمل ہیں۔ جن کو نہ کوئی راست باز صحیح مزاج شریف آدمی زبان پر لاسکتا ہے اور نہ راست باز صحیح مزاج شریف آدمی سن سکتا ہے اکثر ایسے قصائد کے مضامین اس طرح پر بندش پاتے ہیں کہ شاعر پہلے تشبیب کے اشعار لکھتا ہے تشبیب میں یا زمانہ کی شکایت کرتا ہے اور اپنی بدحالیوں کو دکھاتا ہے یا موسم بہار کی کیفیتوں کو رقم کرتا ہے یا اپنے جوہر ذاتی اور عالی صفاتی کو موزوں کرتا ہے اور بھی اسی طرح کے مضامین جن کو تشبیب سے مناسبت ہے حوالہ قلم کرتا ہے اس کے بعد مضامین تشبیب سے گریز کر کے ممدوح کی تعریف کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رکھتا ہے ممدوح کی خوبصورتی وجاہت دولت جلالت عظمت شوکت قدرت ہمت سخاوت وغیرہ وغیرہ نہایت غیر فطری طریقوں سے کی جاتی ہے پھر اس کے ہاتھی گھوڑے تلوار وغیرہ کی تعریفیں از بس نامربوط رنگ پر باندھی جاتی ہیں پھر اس کے طول عمر کیلئے اس وضع دعا کی جاتی ہے کہ ہرگز قبول ہونا معلوم۔ آخر میں اس کے دشمن کے لئے بددعا بھی اسی بدقرینگی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جس بدقرینگی کے ساتھ دعا کی جاتی ہے المختصر اکثر قصائد مدحیہ کا یہی انداز ہوتا ہے جیسے راقم نے عرض کیا اب ارباب مذاق یہ فرمائیں کہ جس شاعری کا یہ انداز ہے وہ شاعری کیا ہے۔ لاریب اردو کی قصیدہ گوئی بہت اصلاح طلب ہو رہی ہے

تھی جو اس وقت کی قصیدہ گوئی ہے شاعری کو بدنام کرنے والی ہے ایسی قصیدہ گوئی
رف شاعر اور ہیں کے ممدوح کو ذلیل نہیں کرتی ہے بلکہ تمام ان اقوام کو جو اُردو کو اپنی
دری زبان جانتے ہیں بہت جائے افسوس ہے کہ ابھی تک اُردو کی قصیدہ گوئی نے
سی قسم کی اصلاح کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ حاجت مند شعرا جو ریاستوں میں حصول رزق
ہا نظر بار کے پھرتے ہیں وہی پرانا راگ گایا کرتے ہیں۔ ممدوح کو سخاوت میں حاتم، شجاعت
ں رستم عدل میں نوشیرواں حکمت میں لقمان لکھا کرتے ہیں، سپاہ ممدوح کو مور و ملخ
ماتے ہیں۔ اُس کے تابع فرمان آفتاب ماہتاب فلک ملک ابر باد آتش خاک
نماؤ قدر سب ہی کو کر دیتے ہیں اُس کی تلوار کو برق ہاتھی کو کوہ اور گھوڑے کو ہوا
سا کرتے ہیں۔ اُس کی عمر کو خضر سے بھی طویل تر جانا کرتے ہیں اور یہی طرح کے سیکڑوں
مربوط مضامین حوالہ قلم کیا کرتے ہیں ایسے شعراء سے اصلاح مذاق کی امید تو فضول
فضول ہے لیکن مگر اُن کے ممدوحین اظہار رضامندی کے عوض اظہار نا رضامندی
رادیں تو شاعری کا یہ نامحمود طریقہ دُور دفع ہو جائے اور واقعی حال کے مذاق کی
صیدہ گوئی میں ایک انقلاب معقول پیدا ہو لاریب حال کی قصیدہ گوئی نہایت
رجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے حتیٰ کہ گدائی کی صورتوں میں سے یہ بھی ایک صورت ہو رہی
ہے۔ کیتے: قصیدہ گو شعرا مالدار اشخاص کے پاس قصائد مدحیہ لے کر آیا کرتے ہیں
بھی سوال کا ایک طریقہ ہو گیا ہے۔ یہ نکبتی شعرا صرف مالداروں پر نازل
نیں ہوتے، ہم غربا اور مساکین کو بھی تنگ کرتے ہیں ایک بار ایک قصیدہ گو
ماحب فقیر کے گھر تشریف لائے عاجز نے انھیں مسافر سمجھ کر اپنے مقدور کے
طابق کچھ سلوک کرنا چاہا، شاعر صاحب بہت برہم ہوئے اور فرمانے لگے کہ ایسے

قصیدہ غرا کا اس قدر انعام قلیل دیا جاتا ہے فقیر نے عرض کی کہ حضرت یہ آپ کے قصیدہ کی کی اجرت نہیں ہے یہ حیثیت شاعر آپ مجھ سے کچھ بھی پانے کے مستحق نہیں ہیں آپ کو مسافر سمجھ کر کچھ دیا چاہتا ہوں آپکا قصیدہ آپ کو مبارک ہو آپ اس کو کسی ایسے احمق کے پاس پیش فرمایئے گا جو اپنے کو دارا کیکاؤس کیخسرو و فریدون رستم حاتم نوشیروان لقمان ارسطو فلاطون وغیرہ وغیرہ سمجھے مَیں بیچارہ کہاں اور یہ مشاہیر عالم کہاں آپ ہی انصاف فرمایئے کہ مَیں آپکو ایسی شئے کی کیا اجرت دوں جو طومار دروغ گوئی ہو اس پربھی جب وہ اپنے احسانات مجھ پر دھرنے لگے تو ناچار ہو کر عاجز نے یہ عرض کی کہ حضرت مجھ سے آپکے احسانات کی جزا نا ممکن نہیں ہے آپ دو گھنٹہ کی مہلت دیں میں ایک ایسا ہی قصیدہ آپ کی تعریف میں لکھ دیتا ہوں ہل جزاء الاحسان الا الاحسان مختصر یہ ہے کہ قصیدہ گوئی تو زمانہ اس مذلت کو پہنچ گئی ہے کہ تمامتر گدائی ہو گئی ہے اللھم احفظنا من ذلک لیکن اس بدحالی پربھی اس طرح کی قصیدہ گوئی مذموم نہیں سمجھی جاتی ہے۔ ملکی مذاق ابھی تک اس کے موافق ہے اور اہل دول یہی مدح سرائی سے خوش ہوتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ یہ مدح سرائی نہیں ہے اُن کی ہجو ہے فقیر کی نگاہ میں قصیدہ مدحیہ ایسا ہی نظر آتا ہے اور عمل بھی فقیر کا اسی پر ہے چنانچہ ایک بار کا یہ ذکر ہے کہ کسی خاص وجہ سے فقیر ایک بڑی ریاست میں گیا ہُوا تھا وہاں احباب نے صلاح دی کہ عاجز ایک قصیدہ تصنیف کر کے بحضور والی ریاست پیش کرے صلاح دوستانہ تھی مگر ایسے فعل قبیح کا مرتکب ہونا طبیعت کو سخت ناگوار معلوم ہُوا۔ احباب سے فقیر نے معذرت کی اور جو حضرات صاحب مذاق صحیح تھے اُن سے اپنے خیالات کو ظاہر بھی کیا فرمانے لگے واقعی قصیدہ گوئی لغو سرائی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے ارباب مذاق ایسے شیوہ کو

کیونکر پسند کر سکتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کثرت مدح سرائی سے قصیدہ گوئی کی غرض فوت ہوگئی ہے نا واقف اشخاص تو یہی سمجھتے ہیں کہ قصیدہ گوئی سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شاعر شاہان و امراء و خوانین کی مدح لکھ کر رسوخ پیدا کرے یا ردی ٹکا کھائے حالانکہ غرض قصیدہ گوئی یہ زنہار نہیں ہے قصیدہ گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اعلیٰ درجہ کے مضامین داخلی اور خارجی کو پسندیدہ عنوان سے پیرایہ نظم میں بیان کرے یاد رہے کہ یہ صنف شاعری غزل سے زیادہ وسیع دائرہ خیال رکھتی ہے قبل میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غزل میں صرف مضامین داخلی بندش پاتے ہیں اور مضامین خارجی کو غزل سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا مگر قصیدہ کے لئے جو مضامین داخلی درکار ہوتے بھی ہیں وہ غزل کے مضامین داخلی سے تمامتر علیحدہ رنگ رکھتے ہیں، قصیدہ کے مضامین داخلی کو تمامتر حکیمانہ رنگ رکھنا چاہیئے مثلاً یہ قصیدہ کی شان سے ہے کہ اس میں توحید عدل نبوت ۔ امامت ۔ معاد ۔ تمدن ۔ معاش معاشرت و دیگر امور دینی و دنیوی کے مضامین جگہ پائیں یا اخلاقی معاملات از قسم صداقت و خلوص و شجاعت و ہمت و فتوت و مروت و سخاوت وغیرہ موزوں کئے جائیں ۔ یا اعلیٰ درجہ کے مضامین ذہنیہ جو اقسام جذبات قلبیہ سے ہیں ۔ زور بیان کا لطف دکھائیں داخلی مضامین کے علاوہ جو خارجی مضامین باندھے جائیں ان کو تقاضائے فطرت سے خالی نہیں ہونا چاہیئے کہ قصیدہ میں بھی نیچرل مضامین کی حاجت ہے ۔ گو اس قدر وسعت بیان کے ساتھ نہیں جس کی محتاج مثنوی ہوا کرتی ہے ذیل میں کچھ اردو قصائد کے انتخابات نذر ناظرین ہوتے ہیں چونکہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس لئے صرف سوداؔ اور ذوقؔ کے قصائد سے اشعار انتخاب

کر لئے جاتے ہیں ورنہ سحر اور انشاء اللہ خاں و دیگر حضرات کے قصائد بھی موجود ہیں اہلِ ذوق انھیں ملاحظہ فرمالیں ؂

مرزا رفیع سودا بہ حیثیت قصیدہ گو

سودا اگر اردو کے سلطان المتغزلین نہیں ہیں تو کشورِ قصیدہ گوئی کے بادشاہ کامگار تو یقیناً ہیں اردو کے کسی قصیدہ گو شاعر کو سودا کی ذہانت اور طباعی کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا میر ہرچند غزل سرائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں مگر قصیدہ گوئی میں سودا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، مومن خاں نے بھی مذہبی قصائد لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں اور غالب کے بھی دو مذہبی قصیدے اُن کے دیوان میں موجود ہیں سحر اور انشاء اللہ خاں بھی قصیدہ گوئی کی معقول صلاحیت رکھتے تھے اور ذوق کی شہرت تو زیادہ تر قصیدہ گوئی ہی کے باعث ہوئی مگر انصاف یہی ہے کہ ان حضرات میں کوئی صاحب بھی اس صنف شاعری میں سودا کو نہیں پہنچتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہرچند سودا قصیدہ گوئی میں سنائی، انوری، خاقانی اور قاآنی کے جواب نہیں سمجھے جا سکتے ہیں مگر سچ یہ ہے اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتے، سودا کے قصائد جو ان کے دیوان میں دیکھے جاتے ہیں بیالیس ہیں ان میں چودہ قصیدے مذہبی ہیں اور بقیہ پانچ مدح میں یا ذم میں، تمام قصائد اعلیٰ درجہ کی سخن آفرینی اور سباقی سے خبر دیتے ہیں ذیل میں ان کے قصائد کے کچھ انتخابات نذر ناظرین ہوتے ہیں ؂

نمبر ۱ قصیدہ نعت ۸۳ اشعار

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی | نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی
ہنر پیدا کر دل ترک کیجیے تب لباس اپنا | نہ ہو جوں تیغ لیے جوہر و گرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے ۔۔۔ نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی
خوش آمد کب ہیں عالی طبیعت اہل دولت کی ۔۔۔ نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروج دست ہمت کو نہیں کچھ قدر بیش و کم ۔۔۔ سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی
کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی ۔۔۔ ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا ۔۔۔ ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی
اذیت وصل ہیں دونی جدائی سے ہے عاشق کو ۔۔۔ بہت رہتا ہے نالاں فصل گل میں مرغ بستانی
ہو توقیر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں ۔۔۔ کہ ہو جو تیغ پر جوہر اسے عزت ہے عریانی
بزنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا سن کر ۔۔۔ کہ تا بدگو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی
یہ روشن ہے بزنگ شمع ربط باد و آتش سے ۔۔۔ موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا ۔۔۔ نفس جب تک ہے داغ دل سے فرصت کیونکہ ہو پانی
کرے ہے سبز زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو ۔۔۔ کہ زیب ترک چشم یار سرمہ ہے صفاہانی
طلوع مہر ہو پامال حسرت آسمان اوپر ۔۔۔ لکھوں گر یہ غزل اس زمیں میں مطلع ثانی

مطلع

عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاج سلطانی ۔۔۔ فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہیں معلوم ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا ۔۔۔ کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
ہماری آہ تیرا دل نہ برما دے تو یا قسمت ۔۔۔ دگر نہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی
تری زلفوں سے ہے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا ۔۔۔ کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی
زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں ۔۔۔ گرہ غنچوں کی کھولے ہے صبا کیونکر باسانی
جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کا شیدا اتنا ہوں ۔۔۔ کہ اعضا دیدہ زنجیر کے کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھی جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے
مگر زلفوں سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں اے سودا نہیں طول سخن لازم
نمط خامہ کی سر کٹوائے گی ایسی ہاں دانی

سمجھ اے ناقباحت فہم کبتک یہ بیان ہوگا
ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کیواسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان سے چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی

زہے دین محمد بری ہیں ان کی جو ہوویں
لیے ہے خاک قدم سے اس کی چشم عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اس کی
امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

اسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی ہیں تا آیات قرآنی

خیال خلق اس کا گر شفیع کافراں ہووے
رکھیں بخشش کے سر منت یہودی و نصرانی

واہ کیا خوب قصیدہ ہے۔ سبحان اللہ قصیدہ کاہے کو ہے مرزا سودا کا توشہ آخرت ہے بلکہ گوش ایمان سے سننے والوں کا پروانہ نجات بھی ہے لاریب۔ مذہبی قصیدہ کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے قصیدہ کیلئے جتنی باتیں ہیں اس میں موجود ہیں ۔

نمبر ۲ ۔ قصیدۂ منقبت تا چہل و ہفت اشعار

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

سجدہ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزوجل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کیے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہر زینت دجبل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جیسے آ لگے
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہناتے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹتے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل

شاخ میں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع سا گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوزمیں کی بھی جو پھوٹی کوپل

دم عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دیں ہیں قسم جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتا ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

حد ایام کے پیش از مدد نامیہ سے
بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سخن پر ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل

دست گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں بس ضرب مثل

غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل

آڑے ہے اسکے نظر لاکھ طرح کا وہ گل
اُن گلوں چھوٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل

یاسمیں رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے لسماعت کے سنجرے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کی زبس ہے درپے
غنچہ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل

اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیارہ گلستاں میں جھپکتی نہیں پل

آبجو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے بس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل

فکر نے رتبہ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی دست ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے ۔۔۔ گل کو دیکھو تو نگہ جاتی ہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم ۔۔۔ پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرت لغزش زمین ہر باغ ۔۔۔ جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے ۔۔۔ شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل
دانہ جس شور زمیں پر نہ پھیلا دہقاں سے ۔۔۔ سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیض ہوا ۔۔۔ گرتے گرتے پہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گلہ رو ۔۔۔ خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل
جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل ۔۔۔ آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی ۔۔۔ اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل
نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے ۔۔۔ ہے قضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل
اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام ۔۔۔ رہے گا سبز ہر مجمع و ہر یک دنگل
تا ابد طرز سخن کی ہے میری رنگینی ۔۔۔ جلوہ رنگ چمن جائے گا اک ان میں ڈھل
نام تلخی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی ۔۔۔ یک طرف تار گلستاں میں ہے یکسو حنظل
ہیں بہ دو ممتد سخنور سے ہر مصرع سے ۔۔۔ مصرع سرو سے بالا ہے کسی نے بھی پھل
ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سر سبز ۔۔۔ نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل
ہے مجھے فیض سخن اس [illegible] ہی مداحی کا ۔۔۔ ذات ہر جس [illegible] ہن کنہ عز و جل
مر سے جس کے منور ہے دل [illegible] ۔۔۔ رو سیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل
فیض جس کا ہے یوں مور سلیمان کو ضعیف ۔۔۔ مور کو حب سے ملے جس کی پیلوں کا سا بل
پائے وصلت نہیں جس کو نہ غیر از عرش ۔۔۔ فرش گلزار زمیں حق نے سمجھ مستعمل

نخیر یزدان شہ مردان علیؑ عالی قدر　　وصی ختم رسل اور امام اوّل

خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے　　پہنچے اُس شخص کو جو شخص ہوا عمامۂ ازل

وہ نظر آئے اُسے دہر کی بینائی سے　　رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل

مدح غائب ہے کھلے اُس کے نہ مداح کا دل　　مطلع　ایک شے دو نظر آتی ہے بہ چشم احول

بلا شبہ مرزا سوداؔ نے قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر دیا ہے کیا تاب کہ کوئی شاعر منقبت میں ایسا لامیہ قصیدہ لکھ سکے طبیعت داری سخن آفرینی متانت جلالت شکوہ وقار بلند پردازی عالی خیالی ہر شعر میں جلوہ گر ہے حقیقت یہ ہے کہ ذہانت اور طباعی سوداؔ کی گھٹی میں پڑی تھی اُردو کے کسی قصیدہ گو شاعر میں خلاقی سخن کی ایسی قدرت نہیں دیکھی جاتی ہے اس منقبت کے علاوہ سوداؔ نے اور بھی منقبت کے قصائد لکھے ہیں اور اکثر ائمہ علیہم السلام کی شان میں قصائد نظم کیے ہیں۔ یہ سب کے سب قصائد قابل توجہ ہیں لاریب سوداؔ نے اپنی قوت شاعری سے یہ اچھا کام لیا کہ قصائد مذہبی رقم کر کے ثواب عقبیٰ حاصل کیا۔ قصیدہ نگاری کے اغراض سے یہ بھی ایک بھاری غرض ہے عربی میں بھی اس وضع کے قصائد ہیں جیسے قصیدہ بردہ و قصیدہ فرزدق وغیرہ جو مذہبی پہلو کی شاعری سے خبر دیتے ہیں ؁

نمبر ۳۔ تشبیب قصیدہ در مدح نظام الملک

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک　　دی دہیں آ کے خوشی نے در دل پر دستک

پوچھا میں کون ہے بولی کہ وہ میں ہوں غافل　　نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا ایں ہوں عزیز دلہا
زندگانی کی حلاوت ہے، جہاں ہیں مجھ تک

کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی نادان
پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

سن کے یہ مژدہ جان بخش جونہیں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک

آنکھیں ملکر کے جو دیکھوں ہوں تو اک بادلہ پوش
سر سے لے غرق جواہر ہیں وہ ہی پانوں تلک

حسن ایسا کہ جیسے ماہ شب چار دہم
پلک بیک دیکھے تو پلچند ہی رہ جائے جھجک

چہرے میں ایسی ہے گرمی کہ شب روز جیسے
یاد کرتی ہی رہے دامن مژگاں کی جھپک

زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرہ پہ مانگیں تھیں دل
جسطرح ایک کھلونے پہ پڑیں دو بالک

جعد وہ قہر کہ گندھنے میں ہو جس کی ہر لہر
گھر ڈبا دینے کو عشاق کے دریائے اٹک

ناگنی تیچ ہیں اس کے نہ مانگے پانی
کھیل جاوے ہیں کالا جو ڈسے اس کی لٹک

جبیں ایسی کہ جگر ماہ کا ہو جاوے داغ
اس کی تشبیہ سے جب اس کو تجاوز دے فلک

قتل کرنے کے یہ جوہر ہیں شمشیر کے بیچ
اس کے ابرو سے مشابہ نہ بنادیں جبتک

دست وہ تیز کہ عالم میں نہیں جس کی پناہ
چشم وہ ترک کہ ہم قوم جنھوں کا ازبک

فتنہ اس چشم کا ایسا کہ مژہ سے خونخوار
متصل جو نکتے پا کر دیا کرتے ہیں تھپک

حسن سے کان کے آویزے میں وہ لطف کہ جوں
مستعد قطرۂ شبنم کہ پڑے گل سے ٹپک

بحر خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ
نتھ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنے کی پھڑک

نظر آیا نہ دہن بیتی کو تنگی کے سبب
منحرف اپنے سے گو ان نے ترا اتنی عینک

مسی آلودہ لب اخگر تھے تہ خاکستر
کہ ہوا سے وہ سخن کرنے میں جاتے ہیں دھک

سلک گوہر کی صفا وام لے ان دانتوں سے
برق در لرزہ کرے موج تبسم کی چمک

دونوں عارض گویا شیشے ہیں جسے گلگوں کے
زنخ ان دونوں میں یوں جیسے نمکدان میں نمک

وصف میں اُسکی ملاحت کے پڑھوں اک مطلع — جس کے آگے نہ رکھے مطلع خورشید نمک

سبحان اللہ اِس سے زیادہ خوبصورت تشبیب کیا ہوسکتی ہے ایسی ایک تشبیب انسان کے شاعر نامی ہونے کے واسطے کافی ہے اشعار بالا میں غزل کی پُر تاثیری کے ساتھ قصیدہ کی متانت اور جلالت کس آن بان سے جلوہ گر ہے فی الواقع ایسے اشعار کوئی شخص بے شاعر پیدا ہوئے نہیں کہہ سکتا ہے ان کو پڑھ کر طبیعت کو کیا شگفتگی پیدا ہوتی ہے حضرات ناظرین اپنے اپنے دل سے پوچھ لیں راقم اپنی کیفیت قلبی کیا عرض کرے بیشک یہ وہ اشعار ہیں کہ ہر ملک کے اہل مذاق کو اُن کا پسند آنا ایک امر مجبوری ہے کیا طرز بیان ہے کیا بندش مضامین ہے کیا خلاقی سخن ہے کیا مضمون آوری ہے کیا صورت نگاری ہے کیا مرقع سازی ہے مرحبا صد مرحبا آفرین صد آفرین اے سودا کن لفظوں سے تیری تعریف کروں کن حرفوں سے تیری ثنا لکھوں لاریب تو سچے شاعروں کی طرح الہامی قدرت رکھتا تھا ورنہ ہر ناظم کا یہ کام نہیں ہے کہ مضمون کے زور سے تسخیر دل کر سکے اے سودا تو نے اِس تشبیب میں خوشی کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے کہ بہزاد و مانی کیا یورپ کے استادان مصوری بھی تیری قلمکاری پر قربان نظر کرتے ہیں سچ یہ ہے کہ تُو نے کمال صناعی سے شاعری اور مصوری کو شئے واحد کر کے دکھایا ہے تیرے حسن تحریر سے خوشی ایک معشوق مجسم دکھائی پڑتی ہے واقعی تو نے اپنے اعجاز بیان سے ایک بیجان چیز میں جان ڈالدی ہے اے سودا تیرا کیا کہنا یہ شاعری نہیں ہے سحر نگاری ہے

نمبر ۴۔ قصیدہ در تہنیت فتح

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار — دیکھا جسے نہ ترک فلک نے بروزگار

بے سر ہوئے ہیں آج یہ سرکش کو گر نہال
خاک انکی پر ہو تو نہ ثمر لائے شاخسار

سر جنگ اس طرح کی نہ کھائی کرتا بہ حشر
مدفون ہوں جہاں یہ تو دل اُٹھ سکے غبار

آتش غضب کی تو نے یہ ان کی فسردہ کی
تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورت شرار

نام اُس کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا
نہ عف کرے ہے سگ ہے نہ فان زاغ کو سہائے

یک خم تھا دل انھوں کا پر از بادۂ غرور
تن اس میں کر دیا نمک تیغ آبدار

تھا عزم یہ ہر ایک کا گاڑیں گے بیٹھ ہم
تیغوں کو کھینچ کھینچ کے قلقاری مار مار

آئے تھے وہ چنانچہ اسی طرح روز جنگ
پایا تھا جوں دلوں میں خیال انکے نے قرار

گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے
سایہ میں جھنڈیوں کی صفیں باندھ بے شمار

وہ جھنڈیاں نظر پڑیں اک دم میں اس طرح
گاڑ دیں بچھا دیں پارچہ جوں نہر کے کنار

پوچھو تو بجانب انکے ہی تھا کچھ اس امر میں
تیرے دلاوروں کا نہ دیکھا تھا کار زار

جو غول تیرے سامنے آیا تو سمجھے یہ
اک کھیت رو برو ہے ہمارے پر از خیار

جیسی ہی اس گروہ نے پی تھی شراب کبر
کھینچا ہے اسکے نشہ نے ویسا ہی کچھ خمار

اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں
لشکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلتے قمار

حق ناشناس قوم یہ تھی غرہ اس قدر
غارت پہ ہر برد کے لیتے تھے سب اُدھار

لیکن خدا کے فضل سے یاں ناگرفتہ قرض
جو لائے تھے سو دے گئے رکھا نہ ایک تار

شمشیر دست و بازو کے ہیں یہ بہت بلی
اپنا تو حرف حق سے گذرتا نہیں شعار

پردہ جو ہیں غلام غلام اس جناب کے
آگے قدم انھوں کے نہیں ان کا استوار

جرات میں انکے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
صحبت نہ دل سے اُن کی تھو دلے کی برار

ان میں سے اس غلام کے تھے اکثر آشنا
میں نے کہا انھوں سے کہ تم جیسے جانگزار

یک قوم ہو یک دری و یک گروہ کے
ہو سامنے حریف کے بے حد و بے شمار

حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم
فتح و شکست مردوں کو ہے پر یہ اضطرار

ان میں سے ایک نے بدم سرد یہ کہا
خواہش خدا کی یوں ہے نہ تھا اپنا اختیار

لیکن جو کچھ کہ واقعی دیکھا سو ہم کہیں
آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہرادلی
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار

سنتے ہیں اب ہر ایک سے اُس فوج کی یہی
سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار

محبوب و دلبسندت و لطافت تھے یکطرف
یک سو تھا میر سید علی مستعد کار

لیکن انھوں کو آدمی کہیئے کہ دیو و دد
اُن کا قدم دغا میں یہ پایا ہم استوار

ایدھر سے بان و رہکلہ و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار

بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اُس پلے پر جہاں سے جزائر کی ہوئے مار

لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اُس گھڑی
دکھلاتی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار

تھی کرتیاں تفنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابر سیاہ تگرگ بار

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار

گنجال مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم
آواز شتر نال تھی طاؤس کی چنگھار

بارہ و گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جس نے کہ قوم عاد اُڑائی تھی جوں غبار

فرصت کسو نے اتنی نپائی کہ ڈکرے
بندوق و تیر و تیغ سے جا اُن میں کارزار

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا ادھر جو ٹاپے ہے ادھر پڑا ہے سوار

اُڑتے تھے یوں پیادہ کہ توڑے کو روئی کے
نداف کا کمانچہ جوں دے ہے انتشار

تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہمنشین
ساتھ ان کے ہم پیالہ و باہم نوالہ خوار

وہ بھاگ گئے ہیں طرح کہ یہ کہتی تھی اُن کو خلق | بھاگا وہ دیکھو جاتا ہے میداں سے کو بہا
نے لڑنے کے حواس تھے نے بھاگنے کا ہوش | نے سوچ جینے کا ہے نہ مرنے کا کچھ بچار
باور ہی کیجو اس کو تو اے یار اس گھڑی | آیا جو کچھ عمل میں نہ تھا اُس میں اختیار
جدھر کو بس کا منہ اُٹھا اودھر کو وہ چلا | سوجھے بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قرار
ہو یہ غضب تو لاش کا حافظ کے ذکر کیا | بیٹا سکتا چھوڑ کیا باپ نے فرار
حافظ کی لاش ہم سے نہ اُٹھی تو نزد فہم | جا گہ نہیں ہے طعن و تعرض کی ہم پہ یار
لازم نہ تھا اسے کہ ہوا ایسے کے سامنے | ہمت میں اور کرم میں جو ہے طاق روزگار
بے زر سے تا جواہر از اسپ تا بہ فیل | جس کے ہمت کے آگے نہ رکھے کچھ اعتبار
نہ رتبہ نقد کو ہے نہ جواہر کو منزلت | نے قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار
خلعت کسی کو اسپ کسی کو کسی کو فیل | بخشے کسی کو لاکھ کسی کو دیے ہزار
حافظ یہ چاہے عہد سے اُسکے برآویں | پیادہ کو دے کے تین روپیہ نو روپیہ سوار
کیا کیا کروں میں اس کی شجاعت کا اب بیان | ہمت کو اس کے کیا کروں اظہار بار بار
حافظ نے سر دیا نہ دیا زر ہوئی ہے یہ | تاریخ اس کی فوت کی کر کے عدد و شمار
تاریخ فتح عرض کی سودا نے یوں کہ ہو | یہ فتح نو مبارک نواب نامدار

واضح ہو کہ یہ قصیدہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور سودا کے عہد کے معاملات ملکی سے خبر دیتا ہے اس قصیدہ کے لکھے جانے کا یہ سبب ہوا کہ حافظ رحمت خاں روہیلہ اور نواب شجاع الدولہ نواب وزیر الممالک اودھ کے درمیان جنگ واقع ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور حافظ مارے بھی گئے نواب اودھ کو یہ فتح زنہار نصیب نہ ہوتی۔ اگر لشکر انگلیشیہ مدد پر نہ ہوتا۔ فوج انگلیشیہ کی شرکت کی یہ وجہ ہوئی کہ سرکار

اودھ سے سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کو اتحاد تھا یہ اتحاد ملکی اصول پر اور تقاضائے وقت کے مطابق تھا، اُس زمانہ کی تاریخ قابل سیر ہے اس وقت کے ہندوستان سے اُس عہد کے ہندوستان کو کوئی مناسبت نہ تھی یہ ملک اس وقت طوائف الملوکی کی بلا میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دہلی کی سلطنت پرزے پرزے ہو چکی تھی۔ ہر صوبہ دار بادشاہ وقت بن بیٹھا تھا چنانچہ اودھ بھی دلی سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد سرکار ہو گیا تھا اسی طرح روہیلوں نے کچھ ملک دبا لیا تھا اور نہ نواب اودھ کا ماتحت اپنے کو سمجھتے تھے اور نہ دلی کے بادشاہ کو کوئی شئے جانتے تھے، اس وقت اہالیان کمپنی بڑی حکمت عملیوں سے کام لے رہے تھے جن ریاستوں سے موافقت کی ضرورت دیکھتے تھے موافقت کرتے تھے اور جس سے خلاف کی حاجت دیکھتے تھے مخالفانہ کارروائی عمل میں لاتے تھے اس لڑائی میں بھی انگریزوں کی شرکت بھی ملکداری اور ملک گیری کے قاعدہ کی بنیاد پر تھی یہ شرکت سودا کے کلام سے عیاں ہے اب حضرات ناظرین سودا کی طباعی اور قابلیت کی طرف توجہ فرمائیں کہ قصیدہ بالا میں اس یکتائے روزگار نے کیا کیا شاعری کے تماشے دکھائے ہیں۔ یہ قصیدہ تہنیت فتح میں لکھا گیا ہے نواب کی تعریف کے بعد سودا روہیلوں کی آمد کو کس عمدگی سے لکھتے ہیں اس عہد کی فوجیں یوروپین فوجوں کی طرح باقاعدہ تو نہیں ہوتی تھیں، ہندوستانی لشکروں کے انداز وہی ہوتے تھے جو اس وقت بھی بعض ریاستوں کے لشکروں کے دیکھے جاتے ہیں اب انگریزوں کی تقلید سے ریاستوں کے لشکروں کی کچھ ظاہری صورت درست ہوئی ہے ورنہ اکثر ریاستوں کے سپاہیوں کی وہی قطع ہے کہ اگر دگلا درست ہے تو موزا پھٹا ہوا ہے۔ تلوار صاف ہے تو بندوق زنگ آلودہ ہے یا دگلا موزا تلوار بندوق اور جمیع اسباب جنگ سب کا سب ہی مبتلائے نکبت

ہو رہا ہے۔ یہی حال حافظ کے لشکروں کا بھی تھا۔ کہ لیٹروں کی صورت پھٹا پُرانا پہنے طرح طرح کے کہنہ آلاتِ حرب لگائے غل شور مچاتے میدانِ جنگ میں آئے۔ نواب کے لشکریوں کی بھی حالت اِس سے اچھی نہ تھی اودھ کی فوجیں نپولین (NAPOLEON) اور ولنگٹن (WILLINGTON) کی تعلیم کردہ نہ تھیں کچھ تھوڑا باقاعدہ جو لشکر نواب تھا بھی وہ پوری یوروپین تعلیم جنگ پائے ہوئے نہ تھا۔ اگر فوج انگریزی کمک نواب پر نہ ہوتی تو اس فتح کا نصیب نواب ہوتا کوئی امر یقینی نہ تھا۔ چنانچہ غنیم کی مستعدی کا ثبوت سوؔدا کے کلام سے ملتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

شمشیر و دستِ بازو کے تھی یہ بہت بلی
اپنا تو حرفِ حق سے گزرنا نہیں شعار

بردہ جو ہیں غلام اس جناب کے
آگے قدم اُنھوں کے نہیں اُن کا استوار

جرأت ہیں ان کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
صحبت نہ دل سے اُن کے تھوڑے کی برار

خیر اس کے بعد سوؔدا جو میدانِ جنگ کی تصویر کھینچتے ہیں ایسی ہے کہ مصوری کا عالم دکھا رہی ہے اہلِ مذاق بیانِ جنگ کو پڑھیں اور لذت یابِ سخن ہوں اس کی لڑائی کے آلاتِ حرب اور طریقہ حرب پر توجہ فرمائیں وہ زمانہ ہنری مارٹینی اسنائیڈر اور کریپ گن کا نہ تھا یہی گجنال شترنال اور جزائر سے لڑائیاں لڑی جاتی تھیں لہٰذا یہ بیانِ جنگ مورخ کی توجہ فرمائی کے بھی قابل ہے اس سے اس عہد کی لشکر آرائی اور نبرد آزمائی کا پورا اندازہ ظاہر ہوتا ہے واہ سوؔدا واہ۔ شاعری واقعہ نگاری کا لطف دکھا رہی ہے شاعری کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ پھر تشبیہات کو ملاحظہ فرمایئے تو خوبیوں سے معمور نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر تشبیہات

ڈھونڈنے سے دستیاب نہیں ہو سکتی ہیں اِن میں غیر فطری انداز کی کوئی تشبیہ نظر نہیں آتی ہے المختصر حضرتِ سوداؔ نے اِس قصیدہ میں بڑی خوش مذاقی کا اظہار کیا ہے اور فقیر کی دانست میں یہ قصیدہ نیچرل بیانات سے خالی نہیں ہے۔

نمبر ۵ - قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

مَیں حضرتِ سوداؔ کو سنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ ہی کیا نظم بیاں ہے

آشنا ہیں کیا عرض کہ فرمایے حضرت
ایام سے کٹنے کی کوئی طرح بھی یاں ہے

سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی کٹی شکل
ہے وجہ معاش اپنی ہو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے

ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں بیچ پر گیری تو لیے چلہ کماں ہے

کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جاکر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دبا کچھ تو ہوئی عید دگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کا پھر بیٹنا اس تشکل سے یاں ہے

لینے ہیں بایں ارد بیہی وہ تو دو ماہہ
ٹک ڈھونس دھڑکے کی جھنجھیں تا ڈ تواں ہے

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھتے ہیں ہیں
بیٹھا ہوا اس تشکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کے اس کا
کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے

بولا جو خطیب اس میں تو باری اسے اک ڈھول
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپڑ اور وہاں ہے

رینکے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

اور وہ جو ہیں کمزور وہاں آن کے بیٹھیں
زینہ کے جو آگے کی یہ پہرا یکے کاں ہے

اٹھ اٹھ کے دکھاتے ہیں انھیں حال وہ اپنا
دربار رواس عہد میں جو خرد و کلاں ہے

یوں بھی نہ ملا کچھ تو پھر اک پالکی آگئے
اس سیج سے رسائی کا رسالہ ہی رواں ہے

کوئی سر پہ کیئے خاک گریبان کو کر چاک
کوئی روئے ہے منہ پیٹ کوئی نالہ کناں ہے

ہندو و مسلماں کو پھر اس پالکی اوپر
ارتھی کا تو ہم ہے جنازہ کا گماں ہے

یہ منتر گی دیکھ کے جا صاحب ارتھی
کرتا ہے جو وال عرض تو نے نہ نہ ہاں ہے

گر سوچئے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت بڑی ہی آفت جاں ہے

وہ جاگئے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خراب گراں ہے

بے وقت خورش اس کی جو ہوا اپنے تئیں بھوکھ
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے

گھڑیاں کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور ریچ خلا رو دو تئیں جو راس پہ واں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور جرت اوپر جرت
منہ صورت سوفار کمر شکل کماں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی تو کرے
سو دو سو روپیے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے

صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے تو وہ اس کو جو شو نت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

اور ماحضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے

مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ
ہے دودھ پہ مچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہے

یہ بھی تو نہیں ہے کہ ابھی سے ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کیلئے بیسنی ناں ہے

اُس میں جو کہیں درد اُٹھا پیٹ میں اُن کے
لکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی
سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ تا ثالث
جب مال مشخص ہو امر صحی کے موافق
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے
دو بیل کی جا گر جو کہیں کیجیے کھیتی
ہیں خشکی و غرقی کے تفکر میں شب و روز
گر خان و خوانین کی لے کوئی وکالت
ہر عمدہ کے دروازہ پہ زیں پوش پہ بیٹھا
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں
دیوان کے بخشی کی بیوتات کے حاضر
ہر بات پلٹتا ہی رہے صبح سے تا شام
لاوے جو گھری سے وہ داموں کا سیاہا

پھر بو علی سینا ہے تو واں ہیچمداں ہے
گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر شام بہ دل وسوسہ سود و زیاں ہے
یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
سمجھے ہے فروشندہ یہ زر دیکھا گماں ہے
پھر پیسوں کے جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
دیوان و بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
ہر اک متصدی سے میاں اور بیاں ہے
جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
اور مینہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے
نہ امن ہے دلگی تیر نے جیکو اماں ہے
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
پوچھے ہے اجی مر رہے نواب کہاں ہے
ہر کوچہ میں جوں آب چکابودہ رواں ہے
مانند کنہیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
پیپل کے پتوں کی طرح منہ میں زباں ہے
للچائے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے

سودا ہے یہ بیٹھے ہے ولے پانسو ہے خرچ
اور نذر کے اجالیے کی بھی اُدھیڑ بن کاں ہے

بتلادے غرض پیسے اُڑا کر ہوئے مدپوش
گھر جاکے پکائے جو کوئی لالہ کہاں ہے

جس وقت سنا یہ وہیں آواز بدل کر
آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے یاں ہے

پھر ہو جو موکل سے کہیں راہ میں بیٹھا
استاد کا جاگیر کے یہ اس سے بیاں ہے

عرضی یہ ہوا میم سیاہی یہ ہوا جیم
پروانہ میں تم پہ ہوں تصدق مرتجاں ہے

کاہے کی غرض عرضی ہے اور کس کا سیاہہ
کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے

انصاف جو کیجیے تو نہیں اس کی بھی تقصیر
سب ماحصل ان باتوں کا اک آسیہ جاں ہے

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھیے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے

مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں اُن سے جو فلاں ابن فلاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھے جاکے دوگانہ
نیت قطعہ تہنیت خان زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے ستے نطفہ خاں ہے

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

ملائی اگر کیجیے ملا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپیے اسکے جو کوئی مثنوی خواں ہے

اور ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں
یک کاسۂ دال عدس و جو کی دو ناں ہے

دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

تم پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے

اب کیجیے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے

جن وزر سے کاتب کا لکھا حال ہی تب سے
ہر صفحہ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے

وہ بیت ٹکے سیکڑے لکھنے کو ہے محتاج
خوبی میں خطاب جس کا بہ از خطبتاں ہے

یہ بھی تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے

احیا ہو جو مرتا کا زمانے میں نئے سر
خطاط کی اتنی ہی لیے قدر جو یاں ہے

ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گذری میں آکر
یاقوت پکارے جو بکا ڈیڑھ قراک ہے

دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ
بیٹھے ہوئے واں میر علی جو کہ جہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت
چھٹتی ہے تو شعرا کی وہ مطعون زباں ہے

دیتا ہے دُم خر سے کوئی شملہ کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

اور اس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت
اس فکر و تردد میں ہر ایک زباں ہے

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر
ہے آج کدھر عرس کی شب بود کہاں ہے

تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی
لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد
گو ورد ہے کوئی رو دیکھے کئی نعرہ زناں ہے

بے تالے ہوئے شیخ جو ٹک وجد میں آکر
سرگوشیوں میں پھر بد اصولی کا بیاں ہے

گر تال سے پڑتا ہے قدم تو بھی ہنس ہنس
کہتے ہیں کوئی حال ہی یہ رقص زناں ہے

اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو
ڈلا ہوا واں دال نخود قلیہ و ناں ہے

سب پیشہ یہ تج کر جو کوئی ہو متوکل
جورو یہ سمجھتی ہے نکھٹو یہ میاں ہے

اور بیٹی کے دل کو ہے خرافت کا تیقن
بیٹے کو جنوں ہونے کا بابا کے گماں ہے

پھر چوم کے جب لڑکے لگے بھوک سے مرنے
ہر خان و خوانین کے ہمراہ دواں ہے

جب راہ خدا پیسے نکالے کوئی نواب
تب اس کی سفارش میں بھی اک رقعہ رواں ہے

مضموں بھی رقعہ کا کہ کچھ دیجیے اس کو
مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے

بالغرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری — یہ شکل بھی مرت سمجھو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال — چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور تیر دہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رہتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ یقیں کسی کے دل کو نہیں ہے — یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے
یہاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر — آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال — جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے

یہ شہر آشوب قصیدہ نہ صرف سوداؔ کی بڑی طبیعت داری سے خبر دیتا ہے بلکہ اس امر کا بھی مثبت ہے کہ یہ شاعر ہمہ دانی کی صفت سے بھی متصف تھا سوداؔ کا پورا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے عہد کے معاملات کلی و جزئی سے تمام تر باخبر تھا ہندوستان کے ملکی درباری شہری بازاری سب کے امور اس پر ہویدا تھے فرمانرواؤں کی کیا حالت تھی۔ لشکروں کا انتظام کیسا تھا وزرا اور امرا کے کیا طور تھے، ان کے اخلاق کی کیا صورت تھی پیشہ وروں کی کس طرح گذرتی تھی مساجد و مدارس اور خانقاہوں کی کیفیتیں کیا تھیں اطبا ر کی اوقات بسری کیونکر ہوتی تھی شعرا کا گذران کس نہج پر ہوتا تھا ملاؤں کے مشاغل کس طرح کے تھے تاجروں کے کاروبار کیونکر چلتے تھے نوکری پیشوں کی کمائی کا کیا ڈھنگ تھا کاشتکاروں کی کیسی کٹتی تھی الغرض اسی طرح ہر طبقہ اور ہر درجہ کے آدمی کے حالات سے یہ یکتائے روزگار اطلاع کافی رکھتا تھا اس قصیدہ سے بھی اس کی اطلاع عام کا اظہار متصور ہے فی الواقع یہ قصیدہ بڑی طباعی اور واقف کاری سے خبر دیتا ہے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کے بہت اشعار ضرب المثل کی طرح زبان زد خلائق ہو رہے ہیں۔

نمبر ۶ - قصیدہ در ہجو اسپ

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایّام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار

تنہا دلے نہ دہر سے عالم خراب ہے
نسبت سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہربان
پاوے سزا جو اُنکا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپیہ کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نہ دانہ نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ناطاقتی کا اُس کی کہاں تک کروں بیان
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کی کھونٹی بندھا ہے وہ
گزرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چگنے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے منہ پسار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹپکے ہے بار بار

پیدا ہوئی ہے تپ سے اگن باد اس قدر
ہرگز دروغ اُس کو تو مت جان زینہار

گزرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف نسیم
بادِ سموم ہووے دریں گر گرے گزار

دیکھے ہے جب وہ تو بڑھ وہ تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں تا ہیں مار مار

ہے اس قدر ضعیف کہ اُڑ جائے باد سے
میخیں گر اُس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخوان نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
…نکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

یہ حال اس کے دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کے تو چھڑا اسکو کردگار

پھر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

لے جاویں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم
اس تئیں بات سے کوئی جلدی ہو آشکار

تنہا نہ اُس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا جب اُنھوں نے کہ اے مہربان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے نت ہے جسکی سگ خشمگین کو عار

بدرنگ جیسے لید ہو بدبو ہے جوں پیشاب
بدمیں یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار

مانند میخ چوکی لکڑ ان ہے تھان پر
لا جنب وہ زمیں سے ہے جوں میخ استوار

…نتری ہے اس قدر کہ جشتر اُس کی پشت پر
دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار

اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اُکھڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لیکے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روے تواریخ یاد ہے
شیطان اُسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنائے کبھو لوہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا برات میں
دولہا جو بیاہنے کو چلا اُس پہ ہو سوار

سبزے سے خط سیاہ و سبہ سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار

پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

بیٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایکدن کی حقیقت کہوں میں یار

دلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کروں میدان کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دو تو ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹک ٹک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑہ اُسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رہ برہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہوئے یہ رواں
یا بادبان باندھ پون کے دو اختیار

میں کیا کہوں غرض کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار

کہتا تھا کوئی ہے بز کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہوگا ولایت کا یہ حمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

کہنے لگا پھر آ اسی مجمع میں کوئی شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنہ کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار

دھوبی کمہار کے گدھے اسدن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گزار

ہر اک نے اسکو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان کھینچے تھا دم کمہار

دریئے کشمکش ہوا اس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبیے خفت سے ایکبار

بدپشیمی اس کی دیکھ کے کر خر میں کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بیشمار

رکھتا تھا کوئی لا کے سپاری کو منہ کے بیچ
مو لیکے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا تجھے میں نو جینے کے اتیوار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اسکے گرد و پیش
ساتھ اس سمند خر میں نما کے ہو چشم چار

اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ رو رو کے زار زار

جھگڑوں میں دھوبیوں کے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب
واں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گزار

دستِ دعا اٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار

پہلے ہی گولا چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے جگر کے پار

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرمٹا بھی ہوا مجھ سے آ دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پہ
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا البغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سنی
اس پر بھی دل میں آئے تو اب ہو جیے سوار

سنکر تب اُن سے میں نے یہ قصہ دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا کیا ہے ضرور یار

گفتن ہمیں بس است کہ اسپ من ابلق است
سمجھوں گا دل میں اپنے اگر ہوں میں ہوشیار

سوداؔ نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدہ کا "تضحیک روزگار"

ہر چند یہ قصیدہ ہجو کا ہے مگر سوداؔ کی قابلیت شاعری اس سے تمام تر آشکارا ہے کوئی مضحک بات گھوڑے اور سوار کی نسبت چھوٹ نہیں رہی ہے لیکن اس تضحیک کے ساتھ اس کی نتیجہ خیزی محل گفتگو نہیں ہے اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو حضرات اپنے گھوڑے کو منگنی دینا نہیں چاہتے کچھ ایسا لنگڑا عذر پیش کرتے ہیں کہ فی الفور یہ قصیدہ خیال میں آجاتا ہے۔ اور خاصکر یہ شعر: "گفتن ہمیں بس است کہ اسپ من ابلق است"

خیر سوداؔ کی ہجو نگاری ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ اس کے ساتھ ناتوجہی کا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا ہے اس طباع زمانہ کی ہجو گوئی میں جو نقصان ہے وہ یہ ہے کہ کلام کبھی کبھی فحش گوئی تک پہنچ جاتا ہے اگر یہ نقصان نہ ہوتا تو سوداؔ کی ہجو نگاری کسی طرح قابل گرفت نہ ہوتی کس واسطے کہ ہجو گوئی سے کسی ملک کی نظم یا نثر خالی نہیں دیکھی ہے۔ ہجو گوئی میں کہ یہ مضامین سے اجتناب کرنا واجبات سے ہے ہجو گو ایسا ہونا چاہیئے کہ مہذب سے مہذب آدمی بھی اس کے پڑھتے یا سننے سے احتراز نہ کرے۔ لاطینی شاعر جو ینل اور انگریزی نثر نگار سوفٹ (SWIFT) بڑے ہجو گو گذرے ہیں ان کی تصنیفوں کو ہر تعلیم یافتہ آدمی نے دیکھا ہے ان کی تحریر دل

کے اغراض قابلِ توجہ ہیں اُن کی تحریریں نتیجہ خیزی سے معرا نہیں ہیں لیکن کیونکر ایسی تصنیفات قابلِ توجہ نہیں بھی جا سکتی ہیں البتہ قاآنی کی نثر ہیں جو جواب گلستان کے طور پر لکھی گئی ہے جہاں جہاں فحش آرائیاں عمل میں آئی ہیں تعلیم یافتہ اشخاص کے تحمل سے باہر ہیں بہر حال اس قصیدہ میں صرف ایک شعر کہ یہ مضمون سے مشتمل تھا جو ترک کر دیا گیا اور اسی طرح اگر تمام کریہ اور فحش مضامین سوداؔ کی دیگر تصنیفات سے متروک کر دیئے جائیں تو اس یکتائے روزگار کے کلام کا حسن دوبالا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ سوداؔ کی طباعی فحش گوئی کی محتاج نہیں ہے اسی قصیدہ کو ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ کس قدر طبیعت داری اور خلاقی سخن سے خبر دیتا ہے اور اسی سے سوداؔ کی ہمہ دانی کس قدر نمایاں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دانائے روزگار کو اپنے ملک کے ہر کلی اور جزوی امر سے اطلاع کامل حاصل تھی۔ ایسا قصیدہ وہی لکھے گا جو اپنے ملک کے ہر طبقہ کے آدمی اور ان کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج سے پورے طور پر باخبر ہوگا پھر اس قصیدہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کے شاہی رسالے کا یہ حال ہو رہا تھا کہ گھر بیٹھے تنخواہ پایا کرتے تھے قواعد اور پریڈ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے جب غنیم نمودار ہوتا تھا تو نقیب انھیں لڑائی پر جانے کو کہتا تھا سبحان اللہ کیا لشکر آرائی تھی۔ کوئی اس عہد کے سرکاری رسالوں کو دیکھے کہ گورے اور کالے سوار کس نہج سے سکھے جاتے ہیں اور کیونکر انجام خدمت کرتے ہیں۔ آخر میں عرض راقم یہ ہے کہ حضرات ناظرین اس قصیدہ کی ترکیب پر نظر فرمائیں کہ شاعر گھوڑے کی بدحالی کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کر کے مالک اسپ سے اس کی برائیوں کو افراط مبالغہ کے ساتھ کہلاتا ہے پھر مالک کو الزام دروغ گوئی دے کر خود حقیقت حال کہہ دیتا ہے ۔ واقعی ذہانت

ذکاوت طبیعت داری سخن آفرینی ہمہ دانی سوداؔ پر ختم ہے۔ ان صفات سے متصف یا فارس میں سعدیؔ تھے یا انگلستان میں شکسپیئر۔ جب ہزار برس زمانہ چرخ کھاتا ہے تب دو چار شخص ایسی ترکیبوں کے وجود میں آتے ہیں ؟

ذوقؔ بحیثیت قصیدہ گو

مرزا رفیع سوداؔ کے بعد قصیدہ گوئی میں شیخ ابراہیم ذوقؔ ہی کا نمبر ہے مگر ان دونوں شاعرانِ نامی میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق ہے ذوقؔ میں ایک ربع بھی سوداؔ کی طبیعت داری نہیں ہے سوداؔ ایک نیچرل شاعر تھے ان کی فطرت نگاری کی ہوا بھی ذوقؔ کو نہیں لگی تھی ذوقؔ کی مضمون آفرینی کوئی شک نہیں کہ ایک ممتاز درجہ کی ہے مگر یہ مضمون آفرینی اس قسم کی ہے جو ایک درباری شاعر کے لئے درکار ہوا کرتی ہے حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوقؔ کے چوبیس قصیدہ میں مگر ایک بھی فطری شاعری کی داد نہیں دیتا ہے سب کے سب مصنوعی ترکیبوں سے معمور نظر آتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ذوقؔ کو درباری تعلق نہ ہوتا تو ان کی شاعری کچھ نہ کچھ نیچرل رنگ نکالتی مگر خدمت شاہی کے بکھیڑے سے انھیں اتنی بھی فرصت نہ مل سکی کہ ایک قصیدہ بھی اپنے پیشوائے دین صلعم کی شان میں یادگار چھوڑ جاتے حقیقت حال یہ ہے کہ جس وضع سے ذوقؔ عمر بسر کرتے تھے وہ فطرت نگاری کی بہت منافی تھی بہت جائے افسوس ہے کہ ایک اتنے بڑے طباع کی زندگی ایسی بدحالی سے بسر ہو گئی بااین ہمہ ذوقؔ کو اگر آزادی حاصل رہتی اور فطرت نگاری کے سامان بہم رہتے تو نیچرل شاعری سے اُن کی قصیدہ نگاری کو اس قدر بے تعلقی نہ ہوتی۔ واضح ہو کہ راقم کو ذوقؔ کی خلاقی سخن میں کوئی گفتگو نہیں ہے بلا شبہ اس شاعر گرامی کی فکر بہت عالی ہے بندش مضامین استادانہ ہے اور روش ادائے مطلب کی خوب د

مرغوب ہے مگر وہ دل آویزی جو نیچرل کلام کی ہوا کرتی ہے اس کا جلوہ کسی قصیدہ میں نمایاں نہیں ہے حضرات ناظرین پر ہویدا رہے کہ یہ رائے محض شخصی ہے ممکن ہے کہ راقم نے اس کے قائم کرنے میں دھوکا کھایا ہو کس واسطے کہ کسی اہل رائے کی تحریر یا تقریر سے راقم کو ان امور میں کسی قسم کی مدد نہیں ملی ہے یہ بھی ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان بلکہ فارس میں بھی شعرا کے کلاموں پر رائے زنی نہیں کی جاتی ہے اس وقت تک جو تذکرے فارسی یا اُردو کے فقیر کی نظر سے گزرے ہیں ان سے کسی شاعر کے حسن و قبح کلام کا پتا نہیں لگتا مثلاً کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خاقانی اور انوری کے قصائد کے امتیازی حسن و قبح کیا ہیں یا ہلالی اور میلی کی غزل سرائیوں میں کون شے تمیز کرنے والی ہے اسی طرح اردو کے شعرا کی نسبت کوئی تالیف یا تصنیف ایسی نہیں دیکھی جا سکتی ہے کہ مثلاً غالب اور مومن کی غزل سرائی کا فرق دکھلائے یا ان کے کلاموں کے حسن و قبح کو واضح طور پر بتلائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن جسے انگریزی میں کریٹی سیزم (CRITICISM) کہتے ہیں۔ فارسی اور اُردو میں نہیں مروج ہے یہ وہ فن ہے جو سخن سنجوں کی کیفیت کلام سے بحث رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص دریافت کرنا چاہے کہ پوپ (POPE) جو ایک انگریزی شاعر ہے کس قابلیت کا سخن سنج تھا تو اس کی شاعری کا ایک پورا آزادانہ بیان انگریزی تصانیف میں ملے گا یہ کیفیت فارسی اور اُردو کے تذکروں کی نہیں ہے ان ایشیائی تذکروں میں اگر دس نامی شاعروں کے کلاموں کی حقیقت کو دریافت کرنا چاہیے۔ تو سب کی تعریف کمال مبالغہ پردازی کے ساتھ ایسے انداز سے جو اُس قلم نظر آئے گی کہ کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ جامی کیا تھے اور نظامی کیا تھے یا تاسخ

ئیا تھے اور راسخ کیا تھے یہ تو تذکرہ نگاری کی حالت ہے تقریظ نگاری کی حالت پر نظر ڈالیئے تو یہ بد مذاقی اور بے عنوانی تحریر کا دریا امڈا ہوا دکھائی دیتا ہے اگر کسی طفل دبستاں نے بھی ایک جزو کا دیوان ترتیب دیا ہے یا چار ورق کی مثنوی لکھی ہے تو اُس کے تقریظ نگار نے اسے فردوسی، سعدی، حافظ، انوری بنا چھوڑا ہے المختصر فارسی یا اردو میں کوئی ایسی تصنیف فقیر کی نظر سے نہیں گزری جو کسی شاعر کی سچی اور واقعی کیفیت شاعری سے خبر دے، خدا جانے واقعہ نگاری میں ان دونوں زبانوں کے مصنفین کیوں پس پا نظر آتے ہیں اور افسوس ہے کہ اب تک اس کی اصلاح کی طرف کسی صاحب علم و صاحب رائے نے توجہ نہیں کی۔ امر بالا کے متعلق فقیر ایک اپنی مایوسی کی سرگذشت عرض کیا چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اس عاجز کو معلوم ہوا کہ دیوان ذوق کو شمس العلماء جناب محمد حسین صاحب آزاد نے کچھ اپنی تحریر کے ساتھ چھپوایا ہے، تو یہ امید ہوئی کہ ضرور مولانائے ممدوح نے انگریزی ترکیب پر اس شاعر نامی کے کلام پر رائے زنی بھی فرمائی ہوگی اس شوق میں ایک نسخہ اُس کا دستیاب کر کے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا مگر کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ ذوق داخلی شاعر تھے یا خارجی۔ اُن کی غزل سرائی تقاضائے غزل سرائی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اُن کی قصیدہ گوئی مناسب رنگ رکھتی ہے یا نہیں۔ انھیں فطرت نگاری کی قدرت حاصل تھی یا نہیں۔ اُن کی خلاقی سخن اعلیٰ درجہ کی تھی یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ ان میں اور میر، مومن، غالب، آتش، ناسخ میں کیا فرق ہے۔ سودا اور دیگر قصیدہ گو شعراء کو اُن کے ساتھ کیا مناسبت ہے الغرض مولانا کا وہ مشرح دیوان کچھ اور ہی مطلب کا نکلا۔ المختصر جب کوئی تصنیف راقم کے مفید مطلب نظر نہیں آتی ہے

تو کچھ اس کتاب میں اظہار رائے کیا جاتا ہے وہ محض شخصی امر ہے اگر حضرات ناظرین اس عاجز کو بر سر خطا پاویں تو اپنی کریمی سے در گذر فرمائیں۔ اس جگہ پر راقم اس امر کو بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس نے بہ سبیل اظہار رائے زیب حوالہ قلم کیا ہے اس کا منشا خوش نیتی کے سوا دوسرا نہیں ہے کبھی اس نے بد زبانی دل آزاری بدخواہی حق فراموشی حق تلفی حق پوشی کو دیدہ و دانستہ اپنی تحریر میں جگہ نہیں دی ہے اس معذرت کے ساتھ راقم ذیل میں قصائد ذوق کے انتخابات مع بیباکانہ رائے کے نذر ناظرین کرتا ہے

نمبر ۱ تشبیب قصیدہ در مدح اکبر شاہ ثانی صفحہ دیوان ذوق

سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نمط زدہ و حیران
تو اک پری چہرہ خوش طلعت بہ شکل بلقیس شاہ کنعان
پری کی صورت چمن کی نگہت گہر کی آب و شمیم گل کا جلوہ
زبان شیریں بیان نمکیں کلام رنداں خرام مستانہ
انیس خلوت جلیس جلوت حریف حکمت ظریف صحبت
بہ بزم یاراں بہ جلوہ ساغر بہ پیالہ عزلت کے بدنام
جبیں بہ شکل مہ منور عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو نگاہ جادو خدنگ مژگاں و چشم فتان
بوئے رنگین نگہ گلستان شگوفہ خنداں مگر نہ خنداں
بموسم بیچاں ہے جوش پیچاں [illegible]

وہ گوش پر زیب کج کلاہی جو دیکھو بیٹی ثریا الٰہی
دہن میں غنچہ لبوں میں گلبرگ رُوئے روشن میں مہر تاباں
نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو وہ گورے ساعدؔ پنجہ رنگیں بخون مرجان
کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اس پہ سو نور لہر کھائے پھر اُس پہ ہیں دو قمر فروزاں
وہ ران روشن وہ ساق سیمیں وہ پائے نازک حنا میں رنگین
وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت دلوں پہ شامت جو ہو خرامان
جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
بہت جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجب ہے نادان
وہ شاہ جو ہے محمد اکبر جہاں میں رشک جم و سکندر
جلوس جشن اُس کا ہے فلک پہ اُسی کے پرتو ہیں سب سامان
یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت لکھا وہ مطلع شفق شباہت
کہ جس کو حسن کہے سخنور پڑھے بہ تحسین ہر اک سخنداں

ارباب مذاق ملاحظہ فرمائیں کہ اس تشبیب میں ذوقؔ نے اسی مضمون خوشی کو موزوں کیا ہے جسے سوداؔ نے اپنے اُس قصیدے کی تشبیب میں نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے

صبح ہوتے جو گئی آنکھ مری آج جھپک　　دی خوشی نے وہیں آ کر در دل پر دستک

اب اہل نظر منصفی فرمائیں کہ سوداؔ نے کس طباعی کے ساتھ اپنے اشعار تشبیب میں خوشی کی تصویر کھینچی ہے اُس نے اپنے بیان سے خوشی کو ایک مجسم باجان نقشہ دکھایا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوشی ایک معشوقہ دلفریب ہے جو پیش نظر کھڑی ہے شاعری اتنی بھی تو ہو کہ غیر مجسم کو مجسم اور بے جان کو جاندار کر کے دکھائے' ذوق نے سودا کے اُسی خیال خوشی کو حوالہ قلم کیا ہے مگر خوشی کی تصویر نہیں کھینچ سکے ہیں۔ اس میں جان کا داخل کرنا تو خارج از بحث ہے یہ دونوں تشبیبیں سودا اور ذوق کی شاعریوں کا خوب فرق دکھاتی ہیں۔ ظاہرا ذوق کے اشعار پر زور ہیں شوکت لفظی اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں بندش چست ہے ترکیب درست ہے یہ سب کچھ سہی مگر جو شے شاعری کی جان ہے وہ سودا کے اشعار میں ہے ذوق کے اشعار میں نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک شاعری مصوری کا تماشا نہیں دکھاتی ہے بلکہ جب تک جان آفرینی کا کمال اُس سے نمایاں نہیں ہوتا ہے تب تک شاعری شاعری کا حکم نہیں رکھتی ہے ذوق کا بیان خوشی زنہار ایسا نہیں ہے کہ خوشی کو ایک مجسم اور ذی جان پیرایہ میں دکھاتا ہے۔ شاعر کامل کا یہ کام ہے کہ اگر غیر مجسم شے کو مجسم کر کے دکھانا چاہتا ہے تو مجسم کر کے دکھائے اور بے جان کو باجان بنانا ہے تو اعجاز بیانی سے باجان بنا دے ملٹن نے گناہ اور موت کا بیان کیا ہے اُس کے بیان نے گناہ اور موت کو باجسم اور باجان کر کے دکھایا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور موت دو مجسم باجان شے ہیں شاعری اس کو کہتے ہیں اسی طرح میر انیس کے اس مصرع سے "جب زلف کو کھولے ہوئے لیلا سے شب آئی" صاف درک ہوتا ہے کہ شب کوئی مجسم اور زندہ شے ہے حالانکہ شب نہ جسم رکھتی ہے نہ جان

نمبر ۲ تشبیب قصیدہ غسل صحت صفحہ ۳۴۹ دیوان ذوق

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ ہے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں رنگِ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خون
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

تام کو اشیا میں نہ تلخی رہی نہ سمیت
بن گئی تریاق افیون زہر میٹھا ہو گیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آبِ حنظل دے لبوں پہ شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا

راحت و آرام کا اس دہر میں ہے دور دور
چاہیے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنے نہ رکھتی تھی صدف
اب رہی ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا

آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

نسخے پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
کہتا ہے بیمار لیس کر مجھ کو ہے بالکل شفا

فرق ہوتا یاں تک عضلۂ بدن سے درد سے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کمالِ تابِ طاقت یہ شتاب
کیسے دو ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا

صبحِ صادق کہہ ہے گو سر پر سپیدی آ گئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت ہے اس کو اک نفس فرصت نہ ہو
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا

رات بھر ڈونگا کیا انجم کے دانے چرخِ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تفریح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس بھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدے نے پہنچایا بہم
جیسے الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخط استوا

لکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیونکر اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

ہے گلوں نے اپنے بال و پر سے سارے نقش چھو
پھینک دی ہیکل توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

کوئی امر شک نہیں کہ اشعار بالا بہت خوب ہیں ذوق کی اطلاع عام سے بے خبر نتیجے ہیں اور ہر چند نیچرل پیرایہ نہیں رکھتے اس پر بھی درباری مذاق کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ بہت کچھ قابل تعریف و توصیف ہیں ؂

نمبر ۳ - قصیدہ مدح صفحہ ۳۵۲

جس کا مطلع یہ ہے ؎

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور نخوت

واضح ہو کہ یہ قصیدہ بہت طولانی ہے اس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں نظر آئی اس لیے راقم صرف اپنے خیالات اس قصیدے کی نسبت ذیل میں عرض کئے دیتا ہے کوئی شک نہیں کہ ذوق نے جیسی مضمون خیز طبیعت پائی تھی یہ قصیدہ ان کی تمنا کے

قوتِ شاعری سے خبر دیتا ہے اِس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی وہبی اطلاع
ایک ممتاز درجہ کی ہے واقعی علوم کی فہرست خوب تیار کی ہے گو اس میں اظہارِ شاعری
بہت نہیں ہے پھر اِس علم شماری کا نتیجہ اِس قدر مستخرج ہوتا ہے کہ بے قسمت علم سے
کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوتا یہاں پر ذوقؔ کی فکر نے لغزش کی ہے کاش ذوقؔ حصولِ علم
کا نتیجہ کچھ معقول طور پر دکھاتے ایسی تقریر سے انسان کو علم اندوزی کی طرف توجہ نہیں
ہو سکتی ایسی تقریر تو سراسر منافی علم اندوزی ہے مگر درباری شاعر ہونے کے باعث
ذوقؔ معذور تھے اُن کو تو باوجود حاصل رہنے تمام علوم دنیا و دین کے بادشاہ کے روبرو تہی
قسمت اپنے کو دکھانا ایک امر مجبوری تھا لاریب آزاد شاعر علم کو محتاج قسمت نہیں دکھا سکتا
ہے صاحبِ علم ہونا خود ایک بڑی خوش قسمتی ہے جیسا کہ امیر المومنین فرماتے ہیں ما الفضل
الا لاہل العلم انہم ۔ علی الہدیٰ لمن استہدیٰ ادلا ۔ ففز بعلم ولا تبغی لہ بدلا فالناس موتیٰ واہل علم
احیاء ۔ بہرحال تہی قسمتی کے بیان طویل کے بعد ذوقؔ جو نویدِ بہجت کا مضمون رقم فرماتے
ہیں وہی سوداؔ کا گڑھا ہوا مضمون ہے اس میں کوئی جدت کا پہلو نظر نہیں آتا جس طرح
سوداؔ کی آنکھ لگ گئی اور خوشی سامنے آ کھڑی ہوئی اُسی طرح ذوقؔ کی آنکھ بند ہوتے ہی
ذوقؔ کے روبرو نویدِ بہجت حاضر آئی اس نویدِ بہجت کو مجسم پیرایہ میں ذوقؔ نے بڑے
زوروں کے ساتھ بیان کیا ہے، بیان کیسا ہی ہو مگر سوداؔ کے تتبع سے خالی نہیں ہے
لیکن اس کے ساتھ انصاف یہی ہے کہ پھر ذوقؔ ہی کا کام تھا کہ سوداؔ کی راہ میں قدم مار
سکے اس تتبع کی بدولت بے شک ذوقؔ نے نویدِ بہجت کو مجسم کر کے دکھایا مگر اتنی کسر رہ
گئی کہ جسم میں جان نہ دے سکے، بیان نویدِ بہجت کے بعد جو مدحیہ اشعار ہیں وہ درباری
شاعر کے حساب سے اچھے ہیں اربابِ مذاقِ صحیح پر اُن کا ملاحظہ بار ہو تو ہو ؛

نمبر ۴ تشبیب قصیدہ مدح صفحہ ۳۷۰ دیوان ذوق

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق

یہ جوش نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن میں گویا چھا گیا نور سحر رنگ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیب چمن شان چمن
ہر سیم بر گلگوں قبا نور سحر رنگ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوش بہار و موج گل
دندان پان خوردہ ہیں یا نور سحر رنگ شفق

افشاں جبیں پر سربسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نور سحر رنگ شفق

ہر مجمع پیر و جوان اک طرفہ مشرق ہی کہ واں
روشن دل و رنگین ادا نور سحر رنگ شفق

جام بلوریں میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگ شفق

دیکھے چمن میں برگ گل آلودہ شبنم جو گل
خجلت سے پانی ہو گیا نور سحر رنگ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے لطف کو چسپیدگی
کس رنگ ہل مل کر چلا نور سحر رنگ شفق

ساقی مئے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر
آب و ہوا جائے فضا نور سحر رنگ شفق

جشن بہادر شاہ ہے روز علو جاہ ہے
ہے اس لئے بہجت فزا نور سحر رنگ شفق

یہ قصیدہ ایشیائی خیالات شاعری کے اعتبار سے جو کچھ پُر مضمون سمجھا جائے ورنہ حقیقت میں اس کو خوبی مضامین سے کوئی علاقہ نہیں ہے ردیف کی خوشنمائی نے جو کچھ اس کی شہرت پھیلائی ہو ورنہ اس میں مضمون آوری بہت کم ہے اس قصیدہ میں نہ کوئی حکمت آموز بات ہے اور نہ فطرت نگاری کا کوئی لطف ہے قصیدہ گوئی کی غرضیں تو تمام تر فوت ہیں ہاں الا یہ کہ نا تعلیم یافتہ دماغوں کو خوش کرنے کا اچھا آلہ ہے ابھی سے ایشیائی درباروں کے مذاقوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہاں شاعری سے کیا نتیجے مراد لی جاتی ہے

اور وہ کیسی شاعری ہے جس کی قدر کی جاتی ہے۔

نمبر ۵ تشبیب قصیدہ مدح صفحہ ۳۸۴ دیوان ذوق

لاتا نیرنگ سے ہے ہر رنگ نئے چرخِ محیل
واہ کیا گرگ ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ ہے نیل

ڈر زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا
لاکھ بہروپیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار
کہ بجز حفظِ خدا جس کے نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی
زنگ میں جیسے چھپا جوہرِ شمشیر اصیل

پیشِ دشمن نہ گزرتی ہے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں ہے قیدِ علائق کسی عالم میں بزرگ
رسمِ تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل

ہے تہِ خاک بھی تاروں کو سفر حشر تلک
نہیں بامحنت ترقی منزلِ اقدام بخیل

عید اک روز جہاں میں رمضاں ہے یکماہ
بعد ہے کثرتِ تکلیف کے یاں عیش قلیل

کشتِ سبزِ فلک نے دی ہے نہ کچھ تخم ثمر
خوشۂ فیض ہے سب بے ثمر یہ مزرعِ نیل

قابلِ انسان کی صحبت سمجھے ہے انسان نہ فلک
بن گیا پیشِ نبی صورتِ دحیہ جبریل

جتنا خورشید نے اتنی ہی پرستش ہو ہوا
ہو گئے کیونکہ تپش عشق و حرکت کی دلیل

عشق کھنچوائے ہے اک ادنیٰ کشش سے بزور
بارِ صد کوہِ الم سینے عمل جرِ ثقیل

نہ لگے چرخ کو گر نالۂ عاشق کی ہوا
دم میں اجزا اُڑائے دخانی کی طرح ہوں تحلیل

شمعِ کشتہ کے لئے ہے دمِ عیسیٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

معتبر ہے جو کرے نالۂ دل دردِ اظہار
ناد ہے دل کی زباں دل ہے موکل یہ وکیل

دل کسے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری ۔۔۔ جس کا اجمال قضا اور قدر ہے تفصیل
ہمہ میں ہے ورپڑھوں میں کوئی مطلع ایسا ۔۔۔ گوہر مخزن معنی سے ہو جس کی تاویل

اس قصیدے کے اشعار تشبیب ویسے ہیں کہ جیسا اشعار تشبیب کو ہونا چاہیئے ان میں کچھ اقوال حکیمانہ اور محققانہ بھی ہیں پھر شاعری کا پیرایہ بھی اچھا رہا ہے مزید برآں کلام احاطہ غزلیت سے بھی نکلا ہوا ہے ان اشعار کا رنگ بعض عربی قصائد کے اشعار کا رنگ رکھتا ہے اکثر عربی قصائد کے اشعار تشبیب بیکار آمد مضامین سے مشتمل ہوتے ہیں حتیٰ کہ متنبی کے اشعار تشبیب بھی حکیمانہ اور محققانہ مضامین خالی نہیں ہوتے فقیر کی دانست میں اتنے بکار آمد مضامین ذوق کے اور کسی قصیدہ میں نظر نہیں آتے،

واضح ہو کہ قصائد بالا کے علاوہ اور بھی چند قصائد ذوق کے ایسے ہیں کہ توجہ طلب ہیں، ایشیائی مذاق کی رو سے تو لاریب ذوق کے یہ سب قصائد اس شاعر نامی کی بڑی خلاقی سخن طبیعت داری عالی پروازی اور بلند خیالی سے خبر دیتے ہیں مگر سچی شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر جو ان کا موازنہ کیجیے تو اُن میں چند نقصانات پائے جاتے ہیں اوّل یہ کہ شاعری کو جو آزادی خیالات درکار ہے ان میں نہیں ہے دوم یہ کہ ان میں معاملات فطرت کا جلوہ کہیں نظر نہیں آتا ہے سوم یہ کہ ان میں ایسے اقوال کہ مفید اخلاق و تمدن و معاشرت ہوں کمتر پائے جاتے ہیں چہارم یہ کہ ان میں ایسے مضامین مفقود ہیں جن سے مذاق شاعری کی اصلاح متصور ہو بہرحال ان سب نقصانات کی معذرت اُستاد ذوق کی طرف سے صرف ایک جملہ کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت کو اتفاق وقت سے درباری شاعر بننا پڑا تھا ورنہ جو قابلیت شاعری حضرت کو مودعہ تھی اس قابلیت کا شاعر ایک آزاد ملک میں بہت کچھ

بکار آمد تصانیف سے شاعری کو زینت اور قوم کو عزت دے سکتا ہے اس جگہ ایک امر بہت قابل لحاظ ہے کہ ہر چند تقرب شاہی سے حضرت کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچا، مگر ان کے فاتی معاملات اخلاق میں کوئی فساد واقع نہ ہوا ذوق جس طرح کے سچے خوش نیت قانع خدا پرست آدمی تھے۔ تادم مرگ رہے ان کی قناعت ایک ممتاز درجہ کی تھی ظاہر ہے کہ جس دربار سے ان کو تعلق تھا وہ غایت بدحالی میں مبتلا رہا تھا ناچار ان کو ایک قلیل رقم تنخواہ کے طور پہ وصول ہوا کرتی تھی اس پر بھی انھوں نے شاہ نصیر کی چال نہیں اختیار کی، کبھی ملک دکن کا منہ نہ دیکھا دلی میں رہے اور دلی میں مرے اگر شاہ صاحب کی طرح جادۂ قناعت سے قدم باہر نکالتے تو شاہ صاحب سے زیادہ مال دنیا حاصل کر لیتے اس واسطے کہ درباری شاعری میں ان کو شاہ صاحب سے بہت زیادہ دخل تھا لیکن ذوق نے دامن قناعت کو نہ چھوڑا جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

واضح ہو کہ شاہ نصیر کے متواتر سفر دکن اختیار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں ملک دکن ایک اچھا زر اندوزی کا میدان تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جس وقت مہاجہ چندو لعل کی او بھلول فیاضی بر سر طغیانی تھی لیکن اس عہد میں بھی ملک دکن کچھ کم مرجع اہل حاجت نہیں رہے ہزاروں بے روزگار اب بھی بشکل امیدوار آتے جاتے ہیں اور ہزاروں بیرونی اشخاص سرکار دکن سے تعلق خدمت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے افلاس میں مسلمانان ہند مبتلا ہو رہے ہیں اگر یہ ریاست نہ ہوتی تو بہت سے ایسے نوکر پیشہ لوگوں کو جن کو انگریزی نوکری کا ملنا معلوم اوقات بسری کی صورت سخت دشوار ہو جاتی واقعی یہ ریاست بہت فیض رساں ہے مگر یہ کی فیض رسانی سے

ہم مسلمانوں کی بدحالی کا پتا خوب لگتا ہے اس کی غیض رسانی کہہ رہی ہے کہ اے مسلمانان ہند تم اپنے دیاروں کے غیر اقوام سے قابلیت میں بہت پیچھے پڑ گئے ہو تب تو میرے ہاں روٹی ڈھونڈنے آتے ہو۔ خدایا! کاش وہ دن ہم کو نصیب ہو کہ ہم لوگ کافی طور پر ماآ.. قابلیت حاصل کر کے اکتساب معاش میں اپنے ہم وطن غیر اقوام کے برابر ہو جائیں۔ بلکہ ان سے بڑھ جائیں تاکہ ہم دکنیوں کے حقوق کو غصب کرنے کی محتاجی باقی نہیں رہے ؛

قطعہ عروضی ترکیب اس صنف شاعری کی وہی ہے جو قصیدہ کی ہے الّا یہ کہ اس صنف شاعری میں ہمیشہ مطلع ندارد ہوتا ہے اور اشعار کے عدد چار سے کم نہیں ہوتے مضامین کے اعتبار سے یہ صنف شاعری ایک اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اس کے مضامین کو مسائل اخلاق و حکمت پر مشتمل ہونا چاہیئے قطعہ نگاری کا تقاضا یہی ہے۔ مگر بعض شعرا نے اس صنف شاعری کو پست مضامین کی بندش سے درجہ ابتذال کو پہنچا دیا ہے۔ واضح ہو کہ قطعہ نگاری کے لئے داخلی شاعری (LNTERAL POETNY) درکار ہے چنانچہ فارسی اور اردو کے جتنے عمدہ قطعات ہیں اسی پہلو کے مضامین سے مزین نظر آتے ہیں مگر اس جگہ ایک امر قابلِ گزارش یہ ہے کہ قطعہ نگاری میں شاعر کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس کا کلام غزلیت کا رنگ پیدا نہ کرے الّا اس حال میں کہ قطعہ بند اشعار وہ کسی غزل میں موزوں کرنے کو ہے ؛

فارسی کی قطعہ نگاری

راقم کی دانست میں اکثر فارسی شعرا کی قطعہ نگاری کا مذاق اچھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ صنف شاعری درباری شاعری کے اغراض کے لئے قصیدہ کے

برابر موزون و مناسب نہیں ہے اس لئے درباری اغراض میں کمتر صرف ہوئی ہے اگر کسی شاعر نے اس میں مدح سرائی وغیرہ کی ہے تو اس کی مثال محض شاذ و اتفاقی ہے واضح ہو کہ فارسی میں ابن یمین نے اچھے قطعات نظم فرمائے ہیں بلکہ اُن کے قطعات نے مدوّن ہو کر ایک مختصر دیوان کی صورت پیدا کی ہے۔ ابن یمین کی شہرت شاعری قطعات نگاری کی بدولت ہے ہر کہ و مہ قطعات ابن یمین سے خبر رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب منظوم از سرتا پا مسائل حکمت سے مسعود ہے اور ارباب مذاق کے قابل توجہ ہے ذیل میں کچھ ابن یمین کے قطعات نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

انتخاب قطعات ابن یمین

دانی چہ موجب است کہ فرزند از پدر (قطعہ ۱) منت نگیرد ارچہ فراواں دہد عطا
یعنی دریں جہاں کہ محل حوادث است در محنت وجود تو افگندۂ مرا
سائلے حال جہاں را ز یکے کرد سوال (قطعہ ۲) آں شنیدی کہ چہ فرمود حکیمش بجواب
گفت دنیا و نعیمش چو بیابان سراب یا خیالیست کہ صاحب نظرش دید بخواب
خواب را مردم بیدار دل اصلا ننہند نہ شود اہل خرد غرہ بہ تمویہ سراب
مرد آزاد درمیان گروہ (قطعہ ۳) گرچہ خویش نجو عاقل و دانا است
محترم آنگہے تواند بود کہ ازایشاں بمالش استغنا است
وانکہ محتاج خلق شد خوار است گرچہ در علم بوعلی سینا است

واضح ہو کہ یہ ترجمہ قول امیر المومنین علیہ السّلام کا ہے

گر نوازد فلکت غرہ مشو از پے آں (قطعہ ۴) کہ صعودے نبود کش نہ سقوطے زپے است

گر بلندی دہدت بخت برو نیز مناز
کار ترفعے نبود کش کہ ہبوطے ز پے است

اگرچہ بے ہنرے را درم فزون باشد (قطعہ ۵) گمان مبر تو کہ نادان برابر داناست
بہیچ حال ابوجہل چون محمدؐ نیست
اگرچہ طینت ہر دو ز آدم و حواست

کسے کز طریق تواضع رود (قطعہ ۶) کند بر سریر شرف سلطنت
ولیکن محلش بدان ذکن
ملک سیرتی در گہ شلطنت
تواضع بود با بزرگان ادب
بود با فرو مایگان مسکنت

یہ بھی قول امیر المومنین علیہ السلام کا ترجمہ ہے۔

ہر کہ موجود حقیقی را شناخت (قطعہ ۷) ذات ایزد را بلا اشباہ گفت
رہ بہ یزدان ہیچ میدانی کہ برد
آنکہ لا موجود الا اللہ گفت

چو میدانی کہ احوال زمانہ (قطعہ ۸) مبدل می شود ساعت بساعت
گرت باید کہ یابی لذت از عمر
وگر خواہی کہ یابی ذوق طاعت
ز دام حرص چوں سیمرغ بگریز
نشیمن ساز بر قاف قناعت

ہر کہ دارد کفاف عیش جہاں (قطعہ ۹) کہ نباشد دراں بکس محتاج
کلبہ نیز بایدش کہ ازاں
نہ کند ہر دمش کسے اخراج
درجہاں بادشاہ وقت خود است
وین چنیں کس نہ بنگرد سوے تاج
بیشتر زیں مجو اے ابن یمین
تا بمانی ہمہ ازیں محتاج
کانچہ افزوں ازین کنی حاصل
بہرہ دادنی است یا تاراج

مرد باید کہ ہر کجا باشد (قطعہ ۱۰) عزت خویشتن نگہ دارد
خود پسندی دالہی نہ کند
ہر چہ کبر و منی است بگزارد

بطریقے رود کہ مردم را | سر موے زخود نیازارد
ہمہ کس را ز خویش بہ داند | ہیچ کس را حقیر نہ شمارد
سروزر در طلب نہد وانگہ | تا مگر دوستے بدست آرد

راقم نے قطعات بالا اس لئے انتخاب کئے ہیں کہ قطعہ نگاری کی غرض ظاہر ہو جتنے مضامین قطعات بالا کے ہیں تلے اور جچے ہوئے ہیں ارباب دانش سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اُن سے قطعہ نگاری کی غرض ہویدا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس رنگ کی قطعہ نگاری ایک بڑے حکمت مآب شاعر کا کام ہے، ہر شعر راستی کا مرقع ہے اور سچی شاعری کا نمونہ ہے اب ذیل میں کچھ قطعات سعدی علیہ الرحمہ کے عرض کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اِس صنف شاعری میں بھی حضرت ایک بڑا ممتاز پایہ رکھتے ہیں بلکہ فقیر کی دانست میں کوئی فارسی کا شاعر قطعہ نگاری میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا ہے جو صفائی خیالات جدت مضامین حق پسندی راست گفتاری اثر انگیزی کا جلوہ حضرت کے کلام میں پایا جاتا ہے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں دیکھا جاتا حق یہ ہے کہ ہر چند ابن یمین بڑے قطعہ نگار ہیں مگر سعدی کے صفاء خیالات اور اثر انگیزی کو نہیں پہنچتے ہیں۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

انتخاب قطعاتِ سعدی

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب | گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمناں نظر داری

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کار اند (قطعه ۲) تا تو نانی بکف آری و بغفلت نخوری
همه از بهر تو سرگشته و فرمان بردار   شرط انصاف نه باشد که تو فرمان نبری

ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وهم (قطعه ۳) وز هر چه گفته اند شنیدیم و خوانده ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر   ما همچنان در اول وصف تو مانده ایم

گر کسی وصف او ز من پرسد (قطعه ۴) بیدل از بی نشان چه گوید باز
عاشقان کشتگان معشوق اند   بر نیاید ز کشتگان آواز

ای مرغ سحر عشق ز پروانه بیاموز (قطعه ۵) کان سوخته را جان شد و آواز نیامد
این مدعیان در طلبش بی خبر انند   کانرا که خبر شد خبرش باز نیامد

گلی خوشبوئی در حمام روزی (قطعه ۶) رسید از دست محبوبی بدستم
بدو گفتم که مشکی یا عبیری   که از بوئی دل آویز تو مستم
بگفتا من گلی ناچیز بودم   ولیکن مدتی با گل نشستم
جمال همنشین در من اثر کرد   وگرنه من همان خاکم که هستم

کنونت که امکان گفتار هست (قطعه ۷) بگو ای برادر به لطف و خوشی
که فردا که پیک اجل در رسد   به حکم ضرورت زبان درکشی

زبان در دهان خردمند چیست (قطعه ۸) کلید در گنج صاحب هنر
چو در بسته باشد چه داند کسی   که جوهر فروش است یا شیشه گیر

اگر چه پیش خردمند خامشی ادب است (قطعه ۹) بوقت مصلحت آن به که در سخن کوشی
دو چیز طیره عقل است دم فرو بستن   بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

بس نامور بزیر زمین دفن کرده اند (قطعه ۱۰) کز هستیش بروی زمین یک نشان نماند

آں پیر لاشہ را کہ سپردند زیر خاک　　خاکش چناں بخورد کزو استخوان نماند
زندہ است نام فرخ نوشیروان بخیر　　گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر　　زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

آں شنیدی کہ لاغرے دانا (قطعہ ۱۱) گفت روزے بابلہے فربہ
اسپ تازی اگر ضعیف بود　　ہمچناں از طویلہ خر بہ

نیم نانے گر خورد مرد خدائے (قطعہ ۱۲) بذل درویشاں کند نیمے دگر
ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ　　ہمچناں در بند اقلیمے دگر

ابر گر آب زندگی بارد (قطعہ ۱۳) ہرگز از شاخ بید بر نخوری
با فرومایہ روزگار مبر　　کز نئے بوریا شکر نخوری

(قطعہ ۱۴)

پسر نوح با بداں بہ نشست　　خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند　　پئے نیکاں گرفت مردم شد

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے　قطعہ ۱۵　ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس
باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

قطعہ ۱۶

زمین شور سنبل بر نیارد　　درو تخم عمل ضائع مگردان
نکوئی با بداں کردن چناں است　　کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

واضح ہو کہ یہ سب قطعات راقم نے کتاب "گلستان" سے داخل انداکئے ہیں ظاہرا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کے تمام قطعات اور بھی وہ قطعات جو کلیات

سعدی میں مندرج ہیں مدون کر دیئے جائیں تو ایک عمدہ مجموعہ قطعات سعدی کا ترتیب پا سکتا ہے فقیر کی دانست میں فارسی کا کوئی قطعہ نگار شاعر سعدی کے حسن بیان، صفائی، پرتاثیری مضامین حق پسندی، حق آموزی، حق جوئی، حق گوئی، راست گفتاری، راست کرداری کو نہیں پہنچتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو خوبیاں سعدی کے قطعات میں ہیں۔ زنہار ابن یمین کے قطعات میں نہیں ہیں، لاریب سعدی قطعہ نگاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ ذیل میں کچھ قطعات اُن کی کلیات سے بھی درج ذیل کیئے جاتے ہیں؛

قطعہ ۱۷

ناگہاں بانگ در سرائے فتد — کہ فلاں را محل وعدہ رسید
دوستاں آمدند تا لب گور — قدمے چند و باز پس گردید
وانکہ او دوست تر ہمی داری — مال و ملک و قبالہ برد و کلید
آنکہ پیوستہ با تو خواہد بود — عمل تست و نفس پاک و پلید
نیک دریاب و بد مکن زنہار — کہ بد و نیک باز خواہی دید

قطعہ ۱۸

کسے بچارہ و شنامے برادران عزیز — ز عیب خویش نباید کہ بے خبر باشد
ز دشمنان شنو اے دوست تا چہ میگویند — کہ عیب در نظر دوستان ہنر باشد

قطعہ ۱۹

پدر کہ جان عزیزش بلب رسید چہ گفت — یکے نصیحت من گوش دار جان عزیز
بدوست گرچہ عزیز است راز دل مکشای — کہ دوست نیز بگوید بدوستان عزیز

قطعہ ۲۰

ایکہ وقت نطفہ بودی بے خبر — وقت دیگر طفل بودی شیر خوار
مدتے بالا گرفتی تا بلوغ — سرو بالائے شدی سیمیں عذار

رہ پنہاں تا مرد نام آور شدی ۔ فارس میدان و مرد کارزار
آنچہ دیدی بر قرار خود نماند ۔ وانچہ بینی ہم نماند بر قرار
این ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد ۔ بخت و تخت و امر و نہی گیر و دار
نام نیک رفتگان ضائع مکن ۔ تا بماند نام نیکت یادگار

ذیل ہیں کچھ اور استادوں کے بھی ایسے قطعات جس سے قطعہ گوئی کی غرضیں ہویدا ہیں۔ عرض کیئے جاتے ہیں۔

قطعہ فردوسی

بیا بگوے کہ پرویز از زمانہ چہ خورد ۔ برو بہ پرس کہ کسری ز روزگار چہ برد
گر او گرفت ممالک بدیگراں بگزاشت ۔ در این نہاد خزائن بدیگراں بسپرد

قطعہ نظامی

دوش رفتم بہ خرابات مرا راہ نبود ۔ میزدم نعرہ و فریاد کس از من نشنود
یا نہ بد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار ۔ یا نہ من ہیچکسم ہیچکسم در نہ کشود
پاسے از شب چو لشد بیشترک یا کمتر ۔ رندے از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر لست درین وقت کرا میخواہی ۔ بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوے ۔ کاندرین وقت کسے بہر کسے در نکشود
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند ۔ کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش آئی زود
این خرابات مغاں است درو رندانند ۔ شاہد و شمع و شراب و شکر و نالے و سرود

ہرچہ از جملۂ آفاق در انجا حاضر   مومن وارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود
گر تو خواہی کہ دل از صحبت اینان بزنی   خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

واضح ہو کہ اِس قطعہ کی عروضی ترکیب غزل کی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قطعہ میں مطلع بھی لکھتے ہیں مگر یہ غزل نما ترکیب قلیل الوجود ہے لیکن غرض قطعہ نگاری سے قطعہ کو خالی نہیں ہونا چاہئے اِس قطعہ کا مصراع آخر اس قطعہ کی غرض پر مشتمل ہے

قطعہ سنائی

گویند چو پیغمبر ما رفت ز دنیا   میراث خلافت بفلاں داد ز بیگان
نے نے ملکے بہ بیگانہ ندا داست   بود فرشاہان جہاں جملہ تو برخوان
با دختر و ابن عم و داماد و دو فرزند   میراث بہ بیگانہ دہد ہیچ مسلمان
روزے ز سر سنگ عقابے بہوا خاست (قطعہ) واندر طلب طعمہ پر و بال بیاراست
از کبر و منی ہا کہ در او بود ہمی گفت   امروز ہمہ ملک خدا زیر پر ماست
ناگہ ز کمین گاہ یکے سخت کمانے   تیرے بزہ آورد فرستاد بدو راست
بر بال عقاب آمدہ آں تیر جگر دوز   در سینہ برون رفت و پس پشت ہمی کاست
در حیرت آں بود زمانے بہ تفکر   کاین آہن و ایں چوب بریدن ز کجا خواست
چوں نیک نگہ کرد بر خویش در آں دید   گفتا بکہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست

قطعہ غالب دہلوی

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابی و سرودی

زنہار ازان قوم نباشی که فریبند
حق را به سجودی و نبی را به درودی

ایضاً

به آدم زن به شیطان طوق لعنت
سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

واضح ہو کہ قطعات بالا میں شوخی کا لطف ہے، غالب کے قطعات فارسی بہت ہیں مگر بیشتر درباری رنگ کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے قطعات بضرورت تصنیف ہوئے ہوں گے اور چونکہ اغراض قطعہ نگاری کے موافق نظر نہ آئے درج ہذا نہیں کیے گئے، یہی حالت عرفی کے قطعات کی بھی نظر آتی ہے کہ حکیمانہ مضامین پر کمتر مشتمل ہیں۔

اردو کی قطعہ نگاری

معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شعرا نے قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ فرمائی ہے اردو کا شاعر اس صنعت شاعری میں نہ سعدی کا نظیر نظر آتا ہے نہ ابن یمین کا جواب دکھائی دیتا ہے ذیل میں اردو کے کچھ قطعات بہ سبیل انتخاب عرض کیے جاتے ہیں

قطعات ذوق

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اِدھر کے اِدھر سے اُدھر ہُوا پیوست
گزرتی ہوگی بہ آرام زندگی تیری
کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات میں انسان
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گر ہو مست الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے لیک کیا امکان
کہ با فراغ کرے کنجِ عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی — تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہوا پابست
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں — کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر — کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوف میں بھی ہوئی اس کو — تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالادست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی — کہ نفس دشمن سرکش ہے اس کو دیجیے شکست
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند — پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی — مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ — گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست
کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد — بریدہ ز ہمہ با خدا گرفتار است

قطعہ

دیکھتے ہیں جلوہ گلہائے رنگا رنگ ہم — مثل نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے — جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم نظارہ رنگ بہار — پھر کہاں یہ سبزہ و گل اور یہ ابر و ہوا
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت — ایں تماشائے جہاں را مفت می بینیم ما

قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

قطعہ

گو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق — ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے — کیوں بُرا کہنے سے تو اس کے بُرا مانتا ہے

قطعاتِ غالب

کلکتہ کا جو ذکر کیا تُو نے ہمنشین
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس قطعہ میں صرف شوخی ہے کوئی شعر حکیمانہ مذاق نہیں رکھتا۔ اس قطعہ پر کیا موقوف ہے، جتنے قطعات دیوان غالب میں موجود ہیں کسی مسئلہ علمی سے علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔

قطعہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
خود ہوں اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر !
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال
کچھ بنایا نہیں ہے ابکے بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ ۔۔۔ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ۔۔۔ شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس ۔۔۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس قطعہ میں جس قدر شوخی ہے محتاج بیان نہیں مگر راقم نے اس قطعہ کو اس لئے منتخب کیا کہ اس میں مرزا غالب نے بڑی واقعہ نگاری خرچ کی ہے، ہندوستانی سرکاروں کا بیشتر یہی طور ہے کہ بدانتظامیوں کے باعث تنخواہیں بڑی دشواریوں سے ملتی ہیں، ہندوستانی ریاستیں سرکار انگریزی نہیں ہوتیں کہ مشاہرہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ ملازموں کو وصول ہو جایا کرے، یہ قطعہ بہت عبرت خیز ہے، ظاہر ہے کہ جن سرکاروں کی یہ حالت ہو کہ ملازموں کو مزد خدمت وقت پر نہ ملا کرے تو بالضرور یا وہ چوری کریں گے یا مارے تکلیف کے بھاگ کھڑے ہوں گے، ارباب مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ قطعہ ہجو کا ایک نہایت مطبوع پیرایہ رکھتا ہے گو ایسی نیت سے لکھا نہیں گیا۔

ایک قطعہ ذیل میں میر پرورش علی صاحب متخلص بہ سخی کا نذر ناظرین ہوتا ہے۔

ایک دن وہ لے کے کچھ لوگوں کو ساتھ ۔۔۔ تربتیں یہ کہہ کے دکھلاتے رہے
اس میں مجنوں ہے اور اس میں کوہکن ۔۔۔ عاشقان ناز تھے جاتے رہے
بعد اس کے پھر ہماری قبر پر ۔۔۔ دیر تک افسوس فرماتے رہے
پوچھا جب سب نے کہ اس میں کون ہے ۔۔۔ آپ جو رو رو کے پچھتاتے رہے
بولے ہے ہے یہ سخی کا ہے مزار ۔۔۔ جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے

رُباعی وہ صنف شاعری ہے جس کے لئے حکیمانہ مضامین کی حاجت

ہے۔ شاعر کو لازم ہے کہ مسائل اخلاق و تمدن و معاشرت و مذہب و دیگر مضامین جلیلہ سے اپنے کلام کو زینت دے۔ اگر پست خیالی کی طرف اس کے کلام کو میلان ہوگا تو اس کی رباعی نگاری بامراد تاثیر پیدا نہ کر سکے گی۔ جاننا چاہیئے کہ جیسی عالی خیالی قطعہ نگاری کے لیئے درکار ہے اس صنف شاعری کو بھی اسی قدر اس کی حاجت ہے مگر فرق یہ ہے کہ قطعہ میں گنجائش مضامین زیادہ ہے اس لیئے کہ قطعہ صرف چار مصرعوں میں محدود نہیں رہتا۔ اور رباعی کو چار مصرع کے سوا چارہ نہیں ہے، چونکہ یہ صنف شاعری عروضی ترکیب کے رو سے بہت محدود صورت ہے، شاعر کو لازم ہے کہ منتخ مسائل کو اس طرح موزوں کرے کہ تھوڑی لفظوں سے بہت معنی پیدا ہوں اور چوتھا مصرع بہت پر مضمون اور پُر زور ایسا ہو کہ گویا ہر سہ مصراعہائے سابق کا خلاصہ یا نتیجہ ہو اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ صنف شاعری کے لیئے زیادہ تر داخلی مضامین کی حاجت ہے۔ مسائل اخلاق و تمدن و معاش و معاد کے علاوہ عشقیہ مضامین بھی اس میں موزوں کیئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسے مضامین پست خیالی کے عیب سے پاک متصور ہوں۔

فارسی کی رُباعی نگاری

فقیر کی دانست میں فارسی کی رُباعی نگاری فارسی کی قطعہ نگاری کی طرح ایک اعلیٰ درجہ کی شاعری سے خبر دیتی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فارسی میں جو عمدہ رباعی نگار گزرے ہیں وہ عموماً حکمائے وقت سے بھی تھے ذیل میں بعض شعرائے نامی کا ذکر رُباعی نگاری کے تعلق کے ساتھ حوالہ قلم کیا جاتا ہے

اور اُن کے کلام کے نمونے بھی نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

فردوسی بہ حیثیت رباعی نگار

فردوسی کی شہرت رُباعی کے ذریعہ سے نہیں ہے مگر اس شاعر گرامی کی رُباعی نگاری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں بھی رُباعی نگاری فارسی میں مروّج ہو چکی تھی۔ یہ صنف شاعری اہل عرب کا ایجاد ہے جیسا کہ کتب تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی فردوسی

تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد — تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد
زاں پیش کہ گردد نفس گرم تو سرد — با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

ظاہر ہے کہ رُباعی بالا اخلاق و تمدن اور معاشرت کے ایک بڑے مسئلہ سے خبر دیتی ہے۔ یہ رُباعی تمامتر اپنے تقاضوں کے مطابق ہے،

مولانا جلال الدین رومی بہ حیثیت رُباعی نگار

مولانائے رومی کی شہرت رُباعی نگاری کی وجہ سے نہیں ہے۔ بہر حال دو رباعیاں مولانا کی درج ذیل ہوتی ہیں۔

نمبرا۔ رُباعی رومی

در مذہب عاشقاں قرارے دگر است — وین بادۂ ناب را خمارے دگر است
ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم — کارے دگر است و عشق کارے دگر است

نمبر ۲ - رُباعی رومی

ہر دیدہ کہ در جمال جاناں نگرد　　شک نیست کہ در قدرت یزدان نگرد
بیزارم ازاں دیدہ کہ در وقت اجل　　از یار قمر و ماند در جان نگرد

واضح ہو کہ رباعیات بالا عشقیہ ہیں مگر بوالہوسوں کی عشق بازی کے مضامین سے تمام تر بے لگاؤ ہیں یہ وہ عشق ہے جس کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ

تعالیٰ العشق عن فہم الرجال

خاقانی بہ حیثیت رُباعی نگار

خاقانی کی شہرت قصیدہ نگاری کی بدولت ہے اس شاعر نامی کی ایک رُباعی ذیل میں عرض کی جاتی ہے۔

رُباعی خاقانی

توفیق رفیق اہل تصدیق شود　　رندیق درین طریق صدیق شود
گر راز مرا نہ دانی انکار مکن　　تقلید کن آن قدر کہ تحقیق شود

انوری بہ حیثیت رُباعی نگار

انوری قصیدہ گو ہیں مگر اُن کی ایک رباعی ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہے

رباعی انوری

با گل گفتم ابر چرا می گرید　　ماتم زدہ نیست ہر کجا می گرید

گل گفت اگر راست ہمی باید گفت   بر عمر من و عہد شما می گرید

پیرایہ شاعری میں تعلیم کا پہلو اچھا رہا ہے۔ غرض رباعی نگاری ہویدا ہے۔

اس شاعر کی شہرت مجرد رباعی نگاری کی بنیاد پر ہے۔ جس طرح ابن یمین قطعہ نگاری کی بدولت مشہور دیار و امصار ہو رہے ہیں اسی طرح رباعی کی وجہ سے عمر خیام کا نام شہرۂ آفاق ہو رہا ہے یورپ میں بھی رباعیات عمر خیام کی بڑی قدر کی جاتی ہے چنانچہ ملک انگلستان میں ایک کلب (   ) یعنی جلسہ اس شاعر گرامی کے نام سے قائم ہے۔ ذیل میں خیام کے کچھ حالات بہ سبیل تذکرہ عرض کئے جاتے ہیں۔

واضح ہو کہ اس مشہور عالم کا نام غیاث الدین ابو الفتح عمر بن ابراہیم الخیام ہے اور وطن نیشاپور جو صوبہ خراسان کا ایک شہر ہے۔ عمر خیام سلطان سنجر کے عہد میں تھے اور اُن کی وفات کا سن ۵۱۷ ہجری صلعم معلوم ہوتا ہے نظام الملک جو الپ ارسلان اور ملک شاہ شاہان سلجوقیہ کے زمانوں میں وزیر رہے اپنی کتاب وصایا میں میں لکھتے ہیں کہ ہم اور خیام عہد طالب العلمی میں ہم سبق اور ہم اُستاد تھے بعد اختتام تعلیم کے ہم سیر و سفر کو چلے گئے اور بعد معاودت کے وزیر ہوئے، ہماری وزارت بابلی کے بعد خیام ہمارے پاس آئے ہم اُن کے ساتھ تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آئے اور اُن سے یہ کہا کہ آپ کی قابلیت کے آدمی کو خدمت سلطان میں در آنا چاہیے خیام نے اس کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ مجھے علم اندوزی کے لئے چھوڑ دو مجھے گوشہ عافیت درکار ہے۔ جب ہم نے خیام کو اس خواہش میں مستحکم پایا تو شاہی خزانہ سے بارہ سو اشرفیاں سالانہ کفاف کے طور پر مقرر کر دیں، الپ ارسلان کے بعد جب ملک شاہ

تخت نشین ہوئے تب خیام مرو میں آئے۔ اس وقت اُن کے علم و فضل کا شہرہ تھا سلطان نے بڑی توقیر کی اور بڑے بڑے عہدے اُن کو بخشے ابوالفدا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مرو میں جس عہدے پر خیام کو سلطان نے سرفراز فرمایا تھا وہ علم الافلاک کے شاہی سررشتہ کی افسری تھی۔ اس خدمت کے زمانے میں خیام نے سرنو سے تقویم سال فارسی کی اور بہت سے زیچ تیار کیے۔ جو زیچ ملک شاہی کے نام سے مشہور ہیں اسی تقویم کو جلالی کہتے ہیں اور وجہ اس کی تسمیہ کی یہ ہوئی کہ سلطان وقت جلال الدین ملک شاہ تھے اور انھیں کی توجہ فرمائی سے یہ کار دشوار انجام کو پہنچا۔ ابن خلدون کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خیام کو علم جبر و مقابلہ میں بھی بڑا دخل تھا اور اس علم میں ان کی تصنیف موجود ہے ایک کتاب ان کی تصنیف سے جس کا موضوع اقلیدس کی تعریفات کی دشواریاں ہے لیڈن (LEGDEN) کے کتب خانہ میں ابھی تک موجود ہے شہرستانی خیام کی نسبت لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ کا یہ عالم ترین شخص تھا علم الافلاک اور فلسفہ میں اس کا کوئی نظیر نہ تھا مختصر یہ ہے کہ خیام اُن علماء میں ہے جن کے تمام نامی نامور وہ ہوا لسنہ خلائق پر جاری رہ جائیں گے خیام کے عقائد دین کی نسبت طوسی لکھتے ہیں کہ اسے تدبیر کی طرف میلان تھا اور یہ میلان اس کو انہماک علمی کے باعث تھا۔ ابوالفدا کی تحریر سے ہویدا ہوتا ہے کہ خیام کو شاعری سے بڑی رغبت تھی مگر راقم کو اُس یکتائے روزگار کی رباعیات کے علاوہ اس کے اور اصناف کلام منظوم سے خبر نہیں ہے یہ رباعیاں مختلف مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں کچھ تو شکایت روزگار میں ہیں اور کچھ ہجو میں پھر کچھ فراقیہ اور وصالیہ ہیں۔ تھوڑی بہاریہ بھی ہیں، علاوہ ان کے کفریہ اور مناجاتیہ ہیں۔ یورپ میں خیام کی رباعیوں کی بڑی قدر ہے اس کا سبب اور کوئی

نہیں معلوم ہوتا ہے۔ الا یہ کہ خیام کے کفریہ مضامین مذاق یورپ کے قرین ہیں۔

انتخاب از رباعیات عمر خیام

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما نمبر۱ کاے رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

برخیز و بیا بیا برائے دل ما نمبر۲ حل کن بہ جمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ می بیار تا نوش کنیم زاں پیش کہ کوزہ کنند از گل ما

گر مے نخوری طعنہ مزن مستان را نمبر۳ گر دست دہد توبہ کنم یزدان را
تو فخر بدین کنی کہ من مے نخورم صد کار کنی کہ مے غلام است آن را

با بط می گفت ماہئ در تب و تاب نمبر۴ باشد کہ بجوے رفتہ باز آید آب
بط گفت چو من و تو بہ گشتیم کباب دنیا پس مرگ من چہ دریا چہ سراب

این کوزہ چو من عاشق زارے بود است نمبر۵ در بند سر زلف نگارے بود است
این دستہ کہ در گردن او می بینی دستیست کہ بر گردن یارے بود است

پیش از من و تو لیل و نہارے بود است نمبر۶ گردندہ فلک نیز بکارے بود است
زنہار قدم بہ خاک آہستہ نہی کان مردمک چشم نگارے بود است

پر خون ز فراقت جگرے نیست کہ نیست نمبر۷ شیدائے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست
با آنکہ نداری سر سودائے کسے سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

در فصل بہار اگر بتے حور سرشت نمبر۸ پر می قدحے دہد مرا بر لب کشت
ہر چند بہ نزد عام بد باشد این از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت

هنگام گل و مل است و یاران سرمست — خوش باش دمے که زندگانی این است
چون جان بلب آمد چه نشاپور و چه بلخ — نمبر ۱۰ — پیمانه چو پر شود چه شیرین چه
مے نوش که بعد از من و تو ماه بسے — از سلخ به غره آید از غره به
این قافلۂ عمر عجب می گذرد — نمبر ۱۱ — دریاب دمے که از طرب می گ
ساقی غم فردائے حریفاں چه خوری — پیش آر پیالۂ که شب می گ
آن قوم که سجاده پرستند خرند — نمبر ۱۲ — زیرا که به زیر بار سالوس د
وین اند همه طرفه ترکه در پردۂ زهد — اسلام فروشند وز کافر ته
افسوس که سرمایه زکف بیرون شد — نمبر ۱۳ — وز دست اجل بسے جگرها خون
کس نامد ازان جهان که پرسیم ازوے — کاحوال مسافران عالم چون
از گردش روزگار بهرے برگیر — نمبر ۱۴ — بر تخت طرب نشین بکف ساغ
از طاعت و معصیت خدا مستغنی ست — بارے تو مراد خود ز عالم ب
عمر تو چه دو صد و چه سه صد چه هزار — نمبر ۱۵ — زین کهنه سرا برون برندت نا
گر بادشهے و گر گدائے بازار — این هر دو به یک نرخ بود آخر
گر گوهر طاعتت نسفتم هرگز — نمبر ۱۶ — گرد گنه از چهره نه رفتم هرگز
نومید نیم ز بارگاه کرمت — زیرا که یکے را دو نه گفتم هرگز
از حادثۂ زمان آینده مپرس — نمبر ۱۷ — وز هرچه رسد چو نیست پاینده مپرس
این یک دمه نقد را غنیمت میدان — از رفته میندیش وز آینده مپرس
از آتش آخرت نمیداری باک — نمبر ۱۸ — در آب ندامت نشدے هرگز
چون باد اجل چراغ عمرت به کشد — ترسم که ترا ز ننگ نپذیرد خا

صورت کون جملہ نقش است وخیال نمبر۱۹ عارف نبود ہر کہ ندارد این حال

ن قدح بادہ بنوش و خوش باش فارغ بشو ازیں نقش وخیالات محال

ں ہمیشہ در بزدم چہ کنم نمبر۲۰ وز کردۂ خویشتن بدردم چہ کنم

م گر ز من بد گزرانی بکرم زاں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

سعدی علیہ الرحمہ سے رباعیاں بھی ہیں ذیل میں کچھ رباعیان سعدی کی نذر ناظرین

ہیں۔

رباعیات سعدی

نادان ہمہ جا با ہمہ خلق آمیزد نمبر۱ چوں غرفہ بہر چہ دید دست آویزد

با مردم زشت نام ہمراہ مباش کز صحبت دیگدان سیاہی خیزد

بشنو بہ ارادت سخن پیر کہن نمبر۲ تا فہم کنی کار جہاں را سر و بن

خواہی کہ کسے را نرسد بر تو سخن بنگر تو ہر چہ آں نہ نیکوست مکن

تا کے بجمال و مال دنیا نازی نمبر۳ وقت است کہ برگ راہ عقبیٰ سازی

اے دیر نشستہ وقت آنست کہ جائے یک چند نیو خواستگان پردازی

زانگہ کہ ترا بر من مسکین نظر است نمبر۴ آثارم از آفتاب مشہور تر است

گر خود ہمہ عیبہا بدین بندہ در است ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر است

دانی کہ چہ گفت زال با رستم گرد نمبر۵ دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد

دیدیم بسے آب ز سر چشمہ خورد چوں بیشتر آمد شتر و بار ببرد

خیزم چو نماند بخشش ازیں تدبیرم نمبر۶ خصم ار ہمہ شمشیر زند یا تیرم

گر دست رسد کہ آستینش گیرم ورنہ بروم بر آستانش میرم

اُردو کی رُباعی نگاری

اردو میں جس طرح کوئی مدون نسخہ قطعات ابن یمین کے رنگ کا نہیں۔ اُسی طرح رباعیات عمر خیام کے طور کی بھی کوئی کتاب نظر نہیں آتی معلوم ہوت کہ شعرائے اُردو نے شعرائے فارسی کے برابر رباعی نگاری میں ترقی نہیں کی ہے شعراء میں کوئی شاعر رباعی نگار عمر خیام کے درجہ کا نظر نہیں آتا ہے مرزا سودا او صاحب نے رباعیاں لکھی ہیں مگر اُن کی رباعیاں اعلیٰ درجہ کی شاعری سے کمتر دیتی ہیں۔ ذوق نے تو جو کچھ رباعیاں لکھی ہیں اُن میں بادشاہ وقت کی خوشامد کے کوئی ایسا مضمون نہیں پایا جاتا ہے کہ جس کو اخلاق تمدن معاشرت معاش معاد وغیرہ سے کسی طرح کا تعلق حاصل ہو۔ قریب قریب یہی کیفیت غالب کی رباع کی بھی ہے۔ نہایت جائے افسوس ہے کہ ذوق اور غالب سے نامی شاعرو بھی اس صنف شاعری کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ خوشامدانہ انداز تحریر سے ا کو درجہ ابتذال تک پہنچا ڈالا۔ سچ ہے کہ شاعری کو درباری تعلق سے ہمیشہ و مترتب ہوا ہے۔ اگر کاش ذوق اور غالب کو درباری تعلق نہ ہوتا تو اُن کے قصائد، قطعات اور رباعیات سے شاعری کو اِس قدر ذلت نصیب نہ ہوت تب یہ ہر دو شاعران نامی آزادی کے ساتھ تصانیف معقول سے شاعری کو زین دیتے، ذیل میں کچھ رباعیاں خواجہ میر درد صاحب اور مومن خان کی نذر ناظرین جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو رباعی نگاری کا مذاق حاصل تھا، مگر مو خاں اس صنف شاعری سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال اُن کی

باعیوں سے کچھ رباعیاں چُن لی جاتی ہیں آخر میں چند رباعیاں میر انیسؔ صاحب
مرزا دبیرؔ صاحب کی منسلک اندا کی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ ہردو بزرگوار
ی نگاری کے اعتبار سے بھی بہت قابل قدر ہیں بلکہ اُردو شعراء میں یہی حضرات
جنھوں نے رباعی نگاری کی شرم رکھ لی ہے ؎

رُباعیات خواجہ میر دردؔ

اے ہر چند تقدّس بندا — نمبر ۱ — مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندا
نے میں بھی اکل و شرب ہے کب ہے نجات — دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندا

نے کبھی جام و سبو دیکھا تھا — نمبر ۲ — جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
باتوں کو اب غور جو کیجیے اے دردؔ — کچھ خواب سا تھا وہ کہ کبھو دیکھا تھا

م نہ دن کو بیقراری کے سبب — نمبر ۳ — نے رات کو چین آہ و زاری کے سبب
ن نہ تھے ہم ان بلاؤں سے کبھو — یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

رُباعیات مومن خان

لطف وہ یاں نہ لائے افسوس افسوس — نمبر ۱ — مرتے دم بھی نہ آئے افسوس افسوس
رہ گئیں دل کی حسرتیں دل ہی میں — افسوس افسوس ہائے افسوس افسوس

ن شوق گناہگاری کب تک — نمبر ۲ — اے تیرہ دروں سیاہ کاری کب تک
اپنے خدا کو باز آ بہر خدا — اے دشمن دیں بتوں سے یاری کب تک

ی تھی یہ لیس مرے ستانے کے لئے — نمبر ۳ — گرمی تھی یہ آگ پہ لٹانے کے لئے

دشمن پہ نگاہ سرد مہری کے سبب — تم آگ ہوئے مرے جلانے کے لئے

رباعیات میر انیسؔ

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے — نمبر۱ — لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

راہی طرف عالم بالا ہوں میں — نمبر۲ — دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے — گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — نمبر۳ — رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے — نمبر۴ — جرأت واجب ہے کجکلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زبان — تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

جو تجھ سے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے — نمبر۵ — جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحر جہاں میں عمر مانند حباب — غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے — نمبر۶ — آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد — مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے — نمبر۷ — ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیط زخار — ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں — نمبر۸ — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا   نمبر۹   جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ   ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

کھینچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے   نمبر۱۰   پیری میں یہ شکل نوجوان پھرتا ہے
عرصہ ہے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر   خم ہو کے زمین پہ آسمان پھرتا ہے

یارب کبھی جلد وہ زمانہ ہووے   نمبر۱۱   بندہ سوئے کربلا روانہ ہووے
لیکن یہ دعا ہے یا مجیب الدعوات   جانا ہووے تو پھر نہ آنا ہووے

بے جا ہر کوشش و طلب کو پایا   نمبر۱۲   اپنی اپنی غرض کا سب کو پایا
مطلوب ملا ابن ابی طالب رضؑ سے   جب شاہ عرب ملے تو رب کو پایا

دم الفت حیدر کا جو بھرتا ہوں میں   نمبر۱۳   حال آتا ہے دل کو وجد کرتا ہوں میں
ممکن ہیں صفات واجب اللہ اللہ   کیا آگے کہوں خدا سے ڈرتا ہوں میں

ناکام بھی کامیاب ہو جاتا ہے   نمبر۱۴   لے قدر فلک جناب ہو جاتا ہے
گر اک نظر مہر سے دیکھیں حیدرؑ   ذرہ ابھی آفتاب ہو جاتا ہے

گر صورت دریا ہمہ تن جوش ہوں میں   نمبر۱۵   لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا   مانند حباب خانہ بر دوش ہوں میں

آئینۂ خاطر کی جلا ہے رونا   نمبر۱۶   اور دیدۂ مروم کی ضیا ہے رونا
پوچھا جو علاج دل مسیحا نے کہا   ہر درد کی دنیا میں دوا ہے رونا

عزت ہے یار و آشنا کے آگے   نمبر۱۷   محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں   یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

آنکھ ابر بہاری سے لڑی رہتی ہے   نمبر۱۸   اشکوں کی روا منہ پہ پڑی رہتی ہے

دونوں آنکھیں ہیں میری سلطان بچھا دوں — یاں سائے سے برن ایک چھتری رہتی ہے

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — نمبر ۱۹ — اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں — وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا — نمبر ۲۰ — برسوں نہ کبھی روز فراغت دیکھا
راحت کا مکاں امن کا گھر خانۂ عیش — دیکھا تو جہاں میں کنج عزلت دیکھا

جز مدح سخن منہ سے کوئی کم نکلے — نمبر ۲۱ — ہر دم سینے سے آہ پرنم نکلے
روحی بفداک یا حسینؑ ابن علیؓ — نکلے تو محبت میں تری دم نکلے

پیری آئی عذار بے نور ہوئے — نمبر ۲۲ — یاران شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیسؔ — جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

کس منہ سے کہوں لائق تحسیں میں ہوں — نمبر ۲۳ — کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں میں ہوں
ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر — کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں میں ہوں

آدم کو عجب خدا نے رتبا بخشا — نمبر ۲۴ — ادنیٰ کے لیئے مقام اعلا بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایمان — اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے — نمبر ۲۵ — غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ — ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے — نمبر ۲۶ — دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل یہ خواب ہے وہ بیداری ہے

پیری سے بدن زار ہوا زاری کر — نمبر ۲۷ — دنیا سے انیسؔ اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبان حال سے موئے سپید — ہے صبح اجل کوچ کی تیاری کر

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے نمبر۲۸ دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

دنیا کو نہ جانو کہ دلِ آرام ہے یہ نمبر۲۹ اے پختہ مزاج جو طمع خام ہے یہ
ہاں سوچ کے پاؤں ہیں زمیں پر رکھو چھٹتا نہیں پھنس کے جس سے وہ دام ہے یہ

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے نمبر۳۰ جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی تھک جاتے ہیں جب پانوں تو سر پھرتا ہے

راحت کا مزہ عدو سے جانی نکلا نمبر۳۱ دل سے نہ کبھی غمِ نہانی نکلا
پیاسے رہے آ کے چاہِ دنیا پہ انیسؔ نکلا بھی کبھی تو کنوے شور پانی نکلا

رباعیاتِ مرزا دبیرؔ

میزانِ سخن سنج میں تلتا ہوں میں نمبر۱ فکرِ گہرِ نظم میں گھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفلِ ابجد کی طرح جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

جو روضہ میں باریاب ہو جاتا ہے نمبر۲ وہ اوج میں لاجواب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبرِ حیدرؑ پہ چراغ وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

حیدر نے دمِ بذل نہ کیا کیا بخشا نمبر۳ قطرے کے طلبگار کو دریا بخشا
قربان مروت علیؑ وقتِ اخیر قاتل کو بھی شربت گوارا بخشا

بن بن کے ہزار بار آئی دنیا نمبر۴ پر چشمِ علی میں نہ سمائی دنیا
جس طرح گرایا تھا درِ خیبر کو نظروں سے اسی طرح گرائی دنیا

جو مجلسِ ماتم میں یہاں روتا ہے نمبر۵ ہر فرد گنہ اس کے خدا دھوتا ہے

ثابت ہے حدیثوں سے کہ یہ قطرۂ اشک — ہر زخم حسینؑ کی دوا ہوتا ہے

نمبر ۶
ہر چند ہزار سال آدم روئے — یعقوبؑ بھی فرزند کو پیہم روئے
جس دم کیا حاسبان قدر نے حساب — سجادؑ کے رونے سے بہت کم روئے

نمبر ۷
اس بزم کو دعویٰ ہے کہ جنت میں ہوں — آنسو ہیں رواں کہ بحر رحمت میں ہوں
کہتا ہے یہ دل سے درہم داغ حسینؑ — گنجینۂ مغفرت کی قیمت میں ہوں

نمبر ۸
یارب خلاق ماہ و ماہی تو ہے — بخشندۂ تاج و تخت شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق — دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

نمبر ۹
زہراؑ کی ولا میں ہند صادق نکلی — کیا معتقد مخبر صادق نکلی
زنداں میں جو شب کو آئی تھا شام میں غل — کاذب کے محل سے صبح صادق نکلی

نمبر ۱۰
میداں میں جب آئے شہ عرش پناہ — بولا ابن سعد کیجیے بیعت یاشاہ
منہ پھیر کے حضرت نے یہ غصے سے کہا — لا حول ولا قوۃ الا باللہ

نمبر ۱۱
تکلیف دکھاتا ہے زمانہ ہم کو — دیتا ہے نہ دولت نہ خزانہ ہم کو
او گردش چرخ ہم سمجھتے ہیں تجھے — تو پیستا ہے جان کے دانہ ہم کو

نمبر ۱۲
ہے کشور دل کو فوج غم نے لوٹا — اور شیشۂ صبر سنگ غم سے ٹوٹا
یہ ماہ رجب وہ ہے کہ اس میں شہ سے — نانا کی لحد چھٹی مدینہ چھوٹا

مثنوی

یہ وہ صنف شاعری ہے کہ مقفا اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے واسطے اشعار کی تعداد معین نہیں ہے ممکن ہے۔ کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں۔ تب ہی تو حجیم اور ضخیم کتابیں شاہنامہ۔ سکندر نامہ

یوسف زلیخا وغیرہ کی سی اس میں لکھی جاسکتی ہیں، لاریب یہ وہ صنف شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلا سکتا ہے، چنانچہ اس صنف شاعری میں دنیا کی بڑی بڑی منظوم تصنیفیں انجام کو پہنچی گئی ہیں عروضی ترکیبوں کو نظر انداز کرکے دیکھئے تو ہر زبان میں شاعری کا کمال اسی صنف میں آشکارا ہے، ہومر. ورجل ملٹن. فردوسی. بالمکی اور بیاس نے اسی صنف میں اظہار کمال کیا ہے، ناں میر انیس صاحب اس صنعت کے پابند نہیں رہے ہیں، اگر مرثیہ نگاری کے لئے یہ صنعت مروّج شعراء رہتی تو حضرت بھی کوئی نہ کوئی تصنیف ایلیڈ اینیڈ پیریڈ ایز لاسٹ، شاہنامہ، رامائن اور مہابھارت کے رنگ کی چھوڑ جاتے، حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کے کمال نے مسدس نگاری کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے جس تک شعرائے بالا کی بدولت مثنوی نگاری پہنچ گئی ہے اس پر بھی نہایت قرین خوش مذاقی ہوتا اگر کوئی تصنیف منظوم بہ شکل مثنوی کتب بالا کے رنگ کی یادگار حضرت رہتی، ایسی تصنیف میر صاحب کے لئے کچھ مشکل نہ تھی مگر اس جانب تقاضائے ملکی سے اُن کو توجہ فرمائی کا موقع نہ ملا۔

جاننا چاہیئے کہ مثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسب مراد انجام پا سکتی ہے جس کو امور ذہنی اور معاملات خارجی کو بھی موزون کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہے وہ شاعر جو صرف امور ذہنی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالۂ قلم کرسکتا ہے مثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا، آئندہ معلوم ہوگا کہ بہت سے ایسے شعراء گذرے ہیں کہ اُنھوں نے مثنوی نگاری کی ہے مگر اُن سے یہ کام پورے طور پر انجام نہیں ہوسکا ہے، ہر زبان میں انھیں شعراء نے حسب مراد مثنویاں

لکھی ہیں۔ جو داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین کی بندش پر پوری قدرت رکھتے تھے، مثنوی نگاری کے لئے شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے اُسے معاملات عالم سے بہ حدِ طاقت بشریہ پورے طور پر باخبر ہونا چاہیئے اس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا در کار ہے، اگر بندش مضامین میں اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے، تو اس کی مثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکے گی :

مثنوی میں کیسے کیسے مضامین کی گنجائش ہے، مدات ذیل سے اس کی حقیقت ظاہر ہوگی :

نمبر ۱۔ رزمی مضامین :۔

اس کی مثال فارسی میں "شاہنامہ"، انگریزی میں "پیریڈائز لاسٹ" یونانی میں "ایلیڈ" اور "اڈیسی" لاطینی میں "اینیڈ" اور سنسکرت میں "رامائن" اور "مہابھارت" ہیں، اردو میں کوئی مثنوی ان کتابوں کے رنگ کی نہیں ہے، واضح ہو کہ رزمی مثنوی کے لئے ضرور ہے کہ جو قصہ منظوم کیا جائے وہ ایسا ہو کہ اخلاقی، تمدنی اور مذہبی اعتبارات سے کسی خاص قوم یا اقوام دنیا کے عام اغراض سے متعلق ہو، یہ سب کتابیں اسی اہم تشکل کی ہیں، اب کوئی واقعہ بزرگ جو بوضع کتب بالا رزمی شاعری کے برتنے کے قابل نظر آتا ہے، واقعہ کربلا ہے، اگر فارسی یا اردو کا کوئی شاعر گرامی اس واقعہ کے متعلق کوئی رزمی مثنوی لکھے تو اس کی تصنیف "شاہنامہ" "ایلیڈ" "اینیڈ" "پیریڈائز لاسٹ" "مہابھارت" اور "رامائن" کا جواب نکلے گی، اگر وہ حضرات جو مرثیہ نگاری کا شغل رکھتے

ہیں اِس کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو کامیابی کی حالت میں اُن کی تصنیف خالی ندرت سے نہ ہوگی۔ فقیر کی دانست میں اس وقت وہ حضرات جو شہرت شاعری کی غرض سے مرثیہ نگاری میں انہماک رکھتے ہیں کسی طرح کا نفع شاعری کو نہیں پہنچاتے ہیں اب تک اِس عاجز کی نظر سے کسی متتبع میر انیسؔ کا ایسا مرثیہ گزرا جو میر صاحب کے باندھے ہوئے مضامین سے علیحدہ ہو کر کسی قسم کا لطف خاص رکھتا ہو۔ اکثر تو یہی دیکھا کہ جن صاحب نے کچھ اپیچ کی لی لیے تالے بے سرے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب نے مسدس نگاری کی شکل میں اشارہ کے شعرا کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ رکھا ہے اب جو کسی کا مرثیہ چمکیلا نظر آئے تو سمجھنا چاہیئے کہ اِس کے لکھنے والے نے میر صاحب کے مراثی سے ضرور اقتباس نور کیا ہے اور اگر اِس کی تحقیق کی جائے گی تو یہ بات روشن ہو جائے گی کہ حضرت ہی کے کلاموں کی شعاع اُس میں ہر طرف جلوہ گر ہے ظاہر ہے کہ ایسی مرثیہ نگاری شاعری نہیں ہے' نقالی ہے پس ایسی نقالی سے کوئی نقال میر صاحب کا ہمسر نہیں ہو جائے گا۔ حضرت پر فوق لے جانا تو محالات سے ہے المختصر جب مسدس نگاری کی شکل میں میر صاحب نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا تو اب ضرور ہے کہ جو حضرات رزمی شاعری کی طرف توجہ فرمائیں اِس عروضی صنف کو چھوڑ کر اور کسی عروضی صنعت کو رزمی شاعری کے برتنے کے واسطے اختیار فرمائیں' ظاہر ہے

کہ مثنوی کے سوا کوئی اور عروضی صنف نہیں ہے جس میں رزمی شاعری برتی جا سکتی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اِس صنف میں دنیا کے تمام بڑے بڑے رزمی معاملے حوالۂ قلم ہوتے گئے ہیں ؛

نمبر ۲۔ بزمی مضامین :۔

اِس کی مثال فارسی میں یُوسف زلیخاؔ، لیلیٰ مجنوں و دیگر عشقیہ مثنویاں ہیں، ساقی نامے اور شکار نامے بھی اِسی مد میں داخل ہیں، کوئی شک نہیں کہ بزمی مثنویاں شعرائے فارس نے خوب لکھی ہیں جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا، اُن کی شاعری کے نقصانات بھی حوالۂ قلم کئے جائیں گے اس مد کی مثنویاں ہر زبان میں موجود ہیں انگریزی میں لارڈ بائرن سر والٹر اسکاٹ۔ الگزینڈر پوپ۔ مُور اور بھی دیگر شعراء نے خوب خوب مثنویاں لکھی ہیں ان شعرائے فرنگ کا کمال یہی ہے کہ بندش مضامین تبعیت فطرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ خوبی فارسی اور اُردو کے مثنوی نگاروں میں کمتر پائی جاتی ہے ؛

نمبر ۳۔ حکمت آموز مضامین :۔

اِس کی مثال بوستان ہے اِس مد کی مثنویاں اور زبانوں میں بھی ہیں جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا ؛

نمبر ۴ : تصوّف آموز مضامین :۔

اِس کی مثال مثنوی ملائے روم ہے اِس مد کی مثنویاں یورپین زبانوں میں کم ہیں لیکن اگر تصوف علم اخلاق کا مترادف سمجھا جائے اور

جیساکہ اس کو مترادف سمجھنا چاہیئے تو ایسی حالت میں ایسی مثنویوں کی قلت یورپین زبانوں میں نہیں پائی جاتی ہے ۔

نمبر ۵ - متفرق مضامین :- اس کی مثالیں آئندہ حوالہ قلم ہوں گی ؎

واضح ہو کہ رزمی اور بزمی مثنویوں کا کمال یہ ہے کہ ان کی بندش مضامین اس درجہ کی سلجھی ہو کہ قریب قریب ڈراما کا لطف پیدا کر سکے لاریب وہی مثنوی ڈراما کا رنگ پیدا کر سکتی ہے جو فطری مضامین اور فطری ترکیبوں پر مشتمل ہوگی ہومر کی اِلیڈ کا یہی طور ہے کہ قریب قریب ڈراما کی خوبیوں کو پہنچ گئی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ یونان میں ڈراما کا ایجاد اسی کتاب کی بنیاد پر ظہور میں آیا ۔ راقم قبل میں ایجاد ڈراما کے اسباب حوالۂ قلم کر چکا ہے ۔ مختصر بزمی اور رزمی مثنویوں کو اس قدر نیچرل ہونا چاہیئے کہ اگر ان کے مضامین ڈراما کی شکل میں بندش پائیں تو صنف شاعری میں آسانی اور لطافت کے ساتھ در آسکیں ۔ حکمت آموز اور تصوف آموز مثنویوں کے لئے یہ امر درکار ہے کہ مسلم اور منقح مسائل حکمت و تصوف سے ان کا کوئی مضمون خلاف نہ ہو اور دلیل و استدلال میں جھول واقع نہ ہو ۔ ان قسموں کی مثنویوں میں بحد امکان شاعر کو مبالغہ پردازی سے تمامتر احتیاط لازم ہے علاوہ اس کے طریقۂ بیان ایسا ہو کہ سامع کے دل پر حسب مراد اثر پیدا کر سکے متفرق مضامین کی مثنویوں کو بھی فطرتی بیانات سے خالی ہونا نہیں چاہیئے ۔ علاوہ اس کے ان کے مضامین کو مفید عام ہونا ضروری ہے فحش گوئی اور ہذیان سرائی کو مثنوی نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے ؎

فارسی کی مثنویاں

رزمی مثنویاں۔ فارسی میں رزمی مثنویاں بکثرت موجود ہیں۔ جیسا کہ قبل میں بہت سی ایسی مثنویاں نام بنام مذکور ہوچکی ہیں لیکن اِن سبھوں میں ممتاز ترین "مثنوی شاہنامہ" ہے پس اغراض کتاب ہٰذا کے لئے راقم اِس کتاب مبسوط کی نسبت اپنے خیالات ذیل میں گزارش کرتا ہے۔

شاہنامہ فردوسی

حکیم ابوالقاسم فردوسی بہ حیثیت مثنوی نگار۔ فردوسی کی شہرت اس کے شاہنامہ کی بدولت ہے جس کا مذکور ہومر کی ایلیڈ ورجل کی اینیڈ ملٹن کی پیریڈ ایز لاسٹ والمکی کی رامائن بیاس کی مہابھارت اور میر انیس کے مراثی کے ساتھ زبان اہل اطلاع پر آتا ہے شاہنامہ اہل عجم کی ایک قومی رزمی کتاب ہے شاہنامہ کی ساخت ایلیڈ اینیڈ پیریڈ ایز لاسٹ مہابھارت اور مراثی میر انیس سے اس طور پر علیحدہ ہے کہ یہ سب رزمی تصنیفات علیحدہ علیحدہ خاص خاص واقعات سے تعلق رکھتی ہیں اور شاہنامہ ایک منظوم تاریخ کا رنگ رکھتا ہے یعنی اس میں کسی واقعہ خاص کا ذکر نہیں ہے۔ یہ کتاب ملک ایران کی ایک فسانہ نما تاریخ ہے اس کتاب میں کیومرث سے لے کر عربوں کے ایران کو فتح کرنے تک کے حالات درج ہیں لاریب پوری تاریخی حیثیت اس کتاب کو حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اس میں غیر فطری امور بے حد داخل ہیں۔ مثلاً چند بادشاہوں اور پہلوانوں کی عمریں عمر بنی آدم سے دہ چند زیادہ درج پائی جاتی ہیں۔

ی طرح دیو وغیرہ کے افسانے حوالۂ قلم دیکھے جاتے ہیں کوئی شک نہیں رستم ایک
بلوان تھا مگر شاہنامہ کا رستم جو ہے بقول فردوسی وہ فردوسی کا رستم ہے

نش کردہ ام رستم داستان — دگرنہ یلے بود در سیستان

مختصر یہ ہے کہ یہ کتاب اگرچہ نہ اس کو تاریخی پایہ حاصل ہے اور نہ اس کا انداز رزمی
تصنیفات بالا کا ہے۔ اسی کتاب میں بہت سے رزمی معاملات اس طور پر جگہ پاتے
ئے ہیں کہ خاص خاص واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ رزمی شاعری
ے برائے خود نمونے ہیں مثلاً نخستین جنگ رستم با افراسیاب جنگ رستم با سہراب جنگ
تم با برزو جنگ رستم با اسفندیار وغیرہ وغیرہ مگر یہ خود معاملات فرداً فرداً ایسے واقعات
رگ نہیں ہیں کہ جو ایلیڈ اینیڈ پیریڈائز لاسٹ رامائن مہابھارت اور مراثی انیس
ے معاملات سے اہم ہوں یہ افتاد خود ایک ایسی ہے کہ جو فردوسی کی رزم نگاری
دبلند پائگی کا سرمایہ پورے طور پر نہیں بخش سکتی ہے ایسی حالت میں بمقابلہ ہومر
رجل ملٹن والمکی بیاس اور میر انیس کے ان شعرائے فردوسی کا سبقت کا لے جانا
ان کا مقابل ہونا دشوار نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ جس قدر کسی رزمی تصنیف کا
سرمایہ عمدہ ہوگا وہ تصنیف بھی اسی قدر عمدہ ہوگی بشرطیکہ شاعر بھی عمدگی سرمایہ سے
کام لینے کی عمدہ صلاحیت رکھتا ہو۔ واقعہ کربلا کا معاملہ ایک عمدہ سرمایہ ہے۔
اریب رزمی تصنیف کے لئے اس سرمایہ سے بہتر دوسرا سرمایہ نصیب نہیں ہوسکتا
گر اس سرمایہ سے کام لینے کے لئے میر انیس ہی شاعر بھی درکار ہے بالمختصر فردوسی
و سرمایہ حسب مراد کے نہیں حاصل رہتے سے شعرائے بالا سے مقابلہ کا اچھا
وقع نظر نہیں آتا ہے یہ تو حالت موجودگی سرمایہ کی ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے

لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ سرمایہ کلام فردوسی کا شعرائے بالا کے سرمایہ کلام کے برابر ہے تو بھی فردوسی کو شاعری کی حیثیت سے شعرائے بالا کے ساتھ ہمپائیگی نہیں حاصل ہے اور شعرائے بالا سے ہومر کو انتخاب کر کے اگر ہومر کے ساتھ فردوسی کا موازنہ اختیار کیا جائے تو ہومر کا پلہ گراں ثابت ہوگا۔ یہ صرف اس بنیاد پر کہ ہومر میں کیرکٹر نگاری کی طاقت فردوسی سے بہت زیادہ دیکھی جاتی ہے شاعر کیرکٹر نگار نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ جزئیات کے بیانات پر اس کو پوری قدرت نہ ہو۔ ہومر کو یہی قدرت فردوسی کے مقابل میں زیادہ تھی، میں اپنے بیان کی توضیح تحریر ذیل سے کرتا ہوں۔

ہومر کی شاعری کی بحث جلد اوّل میں آچکی ہے اور اس جلد میں اس کی تصنیف جس کا نام ایلیڈ ہے ذکر پا چکی ہے اس ایلیڈ میں بہت سے مرد و زن کے بیانات داخل ہو گئے ہیں اسی طرح پر شاہنامہ میں بھی بہت سے مرد و زن کے مذکور آتے گئے۔ مثلاً ایلیڈ میں ذکور طبقہ میں پیرام پیرس ہکٹر اکلیز وغیرہ وغیرہ اور اناث میں ہیکوبا ہلن انڈرومیکی وغیرہا وغیرہا۔ اسی طرح شاہنامہ میں سام نریمان زال رستم گودرز گیو بیژن طوس گستہم وغیرہ وغیرہ طبقہ ذکور میں اور رودابہ سودابہ تہمینہ فرنگیش منیژہ وغیرہا وغیرہا طبقہ اناث میں۔ ہومر نے اپنے بیانات مرد و زن میں ہر فرد کے کیرکٹر یعنی امور خاصہ کو اس خوبصورتی سے حوالہ قلم کیا ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے سے اُس کے مختصات کی وجہ سے صاف صاف علیحدہ معلوم ہوتا ہے یعنی خوبی بیان یہ ہے کہ ذکور طبقہ کا ہر شخص مثلاً پرام پیرس ہکٹر اکلیز وغیرہ وغیرہ اپنے امور خاصہ کے باعث ایک دوسرے سے ممتاز طور پر تمیز ہوتا ہے اور اسی طرح اناث میں سے ہر عورت مثلاً ہیکوبا ہلن انڈرومیکی وغیرہا وغیرہا اپنے کیرکٹروں کی بدولت ایک دوسرے

سے علیحدہ نظر آتی ہے یہی چیز ہے جس کی کمی فردوسی کو ہومر کے برابر ہونے نہیں دیتی ہے اور یہی چیز ہے کہ جو میر انیسؔ کو ہومر سے مرجح کیئے دیتی ہے۔ میر انیسؔ کی کیرکٹر نگاری اُس مرحوم کی رزمی شاعری کے بیان میں ذکر پائے گی۔ بالمختصر حسن وضاحت امتیازی کے ساتھ ہومر نے اپنے فسانہ کے افراد کا بیان حوالۂ قلم کیا ہے فردوسی اپنی تصنیف کے افراد کو اس قدرت کے ساتھ احاطۂ تحریر میں نہیں لا سکتے ہیں۔ شاہنامہ کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سام کی شجاعت سے نریمان کی شجاعت کس طور پر علیحدہ رنگ رکھتی ہے امور خاصہ طوس اور گستہم کے کیا تھے، گودرز اور سام میں کیا فرق تھا، پیل سُم اور کیو کس کس رنگ کے شجاع تھے، بہمن اور پشوتن میں کیا امتیازی بات تھی۔ فرامرز اور گیو کے امتیازی کیرکٹر کیا تھے خود رستم کے اُمور خاصہ بہت وضاحت کے ساتھ نہیں بیان ہو سکے ہیں روئین تنی کے مضمون سے علیحدہ ہو کر رستم اسفندیار سے کیونکر ممیز ہوتا ہے۔ سہراب اور برزو کے کیرکٹر کا فرق مطلق نہیں دکھلایا گیا ہے اسی طرح عورتوں کے امور خاصہ ممتاز طور پر حوالۂ قلم نہیں کیئے گئے ہیں رودابہ اور تہمینہ یا منیژہ اور فرنگیس کیونکر ایک دوسری سے کیرکٹر کے اعتبار سے پورے طور پر ممیز کی جا سکتی ہیں، شاہنامہ سے کچھ پتا نہیں لگتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کو امور عامہ کے بیان کی بڑی قدرت تھی مگر امور خاصہ کے بیان میں اُسے حسب مراد دستگاہ نہ تھی جو شاعر امور خاصہ کے بیان پر قدرت رکھتا ہے وہی کیرکٹر نگار ہوتا ہے کیرکٹر نگاری رزمی شاعری کی جان ہوتی ہے۔ اس قدرت کی بدولت شاعر کی رزمی تصنیف ڈراما کا عالم پیدا کرتی ہے چنانچہ ہومر کی تصنیف ڈراما کے ایجاد کا وسیلہ ہوئی، جو شاعر کیرکٹر نگار نہیں ہے

ڈراما نگار نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کو امور عامہ کے بیان میں پوری صلاحیت دیکھی جاتی ہے مثلاً جب یہ شاعر گرامی مضمون شجاعت کو حوالہ قلم کرتا ہے تو شجاعت کو پوری قابلیت کے ساتھ احاطۂ تحریر میں در لاتا ہے۔ مگر ہر شجاع کے انداز شجاعت کو علیحدہ علیحدہ نہیں دکھلا سکتا ہے یہی حال اور مضامین کا بھی ہے مثلاً اس شاعر کے حسن کا بیان بھی امر عام کی حیثیت سے لاجواب ہوتا ہے مگر افراد کے حسن کے مخصوصات کی تحریر کا انجام اس سے حسب مراد رنگ پر عمل میں نہیں آتا ہے۔ صاحب شاہنامہ تہمینہ کے حسن بیان میں یوں فرماتے ہیں ؎

بقامت بکردار سرو بلند دو ابرو کمان و دو گیسو کمند

یہ ایسی عام تعریفیں حسن کی ہیں کہ ہر محبوب دلکش کی شان میں کہی جا سکتی ہیں یہ تعریف تہمینہ کو فرنگیش یا منیزہ سے ممیز نہیں کر سکتی ہے، لاریب فردوسی کو کیرکٹر نگاری کی بہت صلاحیت حاصل نہ تھی اسی لئے اس کے رزمی معاملات سب کے سب ایک ہی انداز کے نظر آتے ہیں اور اس عدم جدت کے باعث ہومر کے رزمی معاملات کے . . . . . اعتبار سے کمتر دل آویزی رکھتے ہیں فردوسی کا ایک بیان جنگ پڑھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ دوسرا بیان جنگ چونکہ اول بیان جنگ کے طور کا ہوتا ہے۔ دوسرے کے پڑھنے سے کوئی لطف تازہ نہیں اٹھتا ہے اگر فردوسی کا شاہنامہ کیرکٹر نگاری کی خوبیاں رکھتا تو ایران میں ڈراما نگاری رواج پا جاتی۔ جاننا چاہیئے کہ فردوسی کا شاہنامہ وہ کتاب ہے جو فارسی کے اصناف شاعری کی جڑ ہے۔ جیسا کہ راقم الحروف سابق میں عرض کر چکا ہے لیکن ڈراما نے جو اس کتاب کے ذریعہ سے رواج نہیں پایا

اس کا سبب یہی ہے کہ یہ کتاب کیریکٹر نگاری کی خوبیوں سے بہت کچھ محروم ہے برخلاف اس کے ایپیڈ کا معاملہ ہے کہ اس کیریکٹر نگاری کی بدولت ڈراما نگاری بھی دیگر اصناف شاعری کی طرح یونان میں وجود میں آئی ؎

نخستین جنگ رستم با افراسیاب

انتخاب از شاہنامہ فردوسی

چو رستم بدید آنکہ قارن چہ کرد — چہ گونہ بود ساز جنگ و نبرد
چہ پوشد کجا بر فراز درفش — کہ پیدا است تابان درفش بنفش
نشاں دہ کہ پیکار سازم بدو — میان یلان سر فرازم بدو
بپیش پدر شد بپرسید از وے — کہ با من جہاں پہلوانا بگوے
کہ افراسیاب آں بد اندیش مرد — کجا جائے گیرد بدشت نبرد
اگر یار باشد مرا ہور و ماہ — کشانش بیارم بہ نزدیک شاہ
مرا جز بدو نیست امروز جنگ — من دگر ز میدان و پور پشنگ
من امروز بیند کمرگاہ او — بگیرم کشانش بیارم بره
بفرمان جاں آفریں یک خدائے — اگر کوہ باشد برآرم ز جائے
بہ بندم بیارم بر کیقباد — مراں بد کنش مرد بیراہ و داد
بدو گفت زال اے پسر گوش دار — یک امروز با خویشتن ہوش دار
کہ آں ترک در جنگ نر اژدہا ست — دم آہنج و در کینہ ابر بلا ست

درفشش سیاه است و خفتاں سیاه — ز آہنش ساعد ز آہن کلاه
ہمه روئے آہن گرفته بزر — درفشش سیه بسته بر خود سر
به پیکار که گرد دلاور بود — به رزم اندرش ده برابر بود
به یکجائے ساکن نباشد بجنگ — چنیں است آئین پور پشنگ
نهنگ او ز دریا بر آرد بدم — نه ہمتا درش نیست بالاش کم
ازو خویشتن را نگهدار سخت — که مرد دلیر است پیروز بخت
شود کوه آہن چو دریائے آب — اگر بشنود نام افراسیاب
بدو گفت رستم که اے پہلواں — تو از من مدارا ہیچ رنجه رواں
جہاں آفرینندہ یار من است — دل و تیغ و بازو حصار من است
اگر اژدہا باشد و دیو نر — بیارمش بگرفته بند کمر
به بینی کنوں در صف کارزار — کزاں شاہ جنگی بر آرم دمار
بدانگونه بادے بر آیم بجنگ — که بر روئے بگرید سیاہ پشنگ
برانگیخت آں رخش روئینه سُم — بر آمد خروشیدن گاو دم
دماں رفت تا سوئے توراں سپاه — یکے نعره زد شیر لشکر پناه
چو افراسیابش به ہاموں بدید — شگفتید زاں کودک نارسید
ز گردان بپرسید کیں اژدہا — بدیں گونه از بند گشته رہا
کدام است کیں را ندانم بنام — یکے گفت ایں پور دستان سام
بود رستمش نام و بس سرکش است — گه جنگ چوں آب چوں آتش است
نه بینی که با گرز سام آمد است — جوان است و جویائے نام است
به پیش سپه آمد افراسیاب — چو کشتی که موجش بر آرد در آب

چو رستم ورا دید بفشرد ران   بگردن بر آورد گرز گران

چو تنگ اندر آورد با او زمین   فرو گرد گرز گران را بہ زین

چو افراسیابش بد انگونہ دید   بزد چنگ و تیغ از میاں بر کشید

زمانے بکوشید با پور زال   تہمتن برافراختہ چنگ و بال

بہ بند کمرش اندر آویخت چنگ   جدا کردش از پشت زین پلنگ

ہمی خواست بردن بپیش قباد   دہد جنگ روز نخستینش یاد

ز ہنگ سپہدار و چنگ سوار   نیامد دوال کمر پایدار

گسست و بخاک اندر آمد سرش   سواران گرفتند گرد اندرش

تہمتن فرو برد چنگ دراز   ربود از سرش تاج آں سرفراز

بیکدست رستم کمر ماندہ بود   بدست دگر تاج از سر ربود

سپہبد چو از چنگ رستم بجست   بخائید رستم ہمی پشت دست

چرا گفت نہ گرفتمش زیر کش   ہمی بر کمر ساختم پنجہ بش

چو گردان ایران ہمہ تن بہ تن   برفتند نزدیک آں پیلتن

چو قارن چو کشواد و گردان ہمہ   برستم شدند آفرین خواں ہمہ

تہمتن یکے را برخویش خواند   ہمہ کار رفتہ بدو باز راند

بگفتا گرفتم کمر بند شاہ   بداں تا بیارم بہ ایران سپاہ

گسستہ شد از ہم کمر بند وے   بیفتاد از دست پیوند وے

چو بر خاست از خاک آں بیگہش   چو خورشید رخشندہ تاج سرش

ربودم بہ توفیق جان آفرین   بندوی برش نزد شاہ گزین

که تا برکشم تیغ تیز از میان — کنم رستخیزے بہ تورانیان
چو آواز زنگ آمد از پشت پیل — خروشیدن کوس از چند میل
یکے مژده بردند نزدیک شاه — که رستم بدرید قلب سپاه
ببند سپهدار ترکان رسید — درفش سپهدار شد ناپدید
گرفتش کمر بند و افگند خوار — خروشے بر آمد ز ترکان هزار
گرفتند گردش دلاورسران — پیاده ببردندش آن سروران
سپهدار ترکان چو شد زیردست — یکے بارۀ تیز تک برنشست
پس آنگاه راه بیابان گرفت — سپه را رها کرد و خود جان گرفت
چو این مژده بشنید از و کیقباد — بفرمود تا لشکرش همچو باد
بیک باره برخیل توران زنند — برو بیخ ایشان ز بن بر کنند
ز جاے اندر آمد چو آتش قباد — بجنبید لشکر چو دریا ز باد
ز دست دگر زال و مهراب شیر — برفتند بر جاش جو و دلیر
بر آمد خروشیدن دار و گیر — درخشیدن خنجر و زخم تیر
بر آن ترک زرین و زرین سپر — غمین شد سر از چاک چاک تبر
تو گفتی که ابرے بر آمد ز گنج — ز شنجرف نیرنگ زد بر ترنج
دو لشکر بیک بار آویختند — تو گفتی بهم اندر آمیختند
غریویدن مرد و غرنده کوس — همی کرد بر رعد غران فسوس
ز آسیب شیران پولاد چنگ — دریده دل شیر و چرم پلنگ
زمین کرده بد سرخ رستم بجنگ — یکے گرزه گاو پیکر بچنگ

بہر سو کہ مرکب بر انگیختے	چو برگ خزاں سر فرو ریختے
بہ شمشیر بران چو بگذاشت دست	سر سر فرازاں ہمیکرد پست
اگر بر زدے بر سر آں سر فراز	بدو نیمہ کردیش با اسپ و ساز
چو شمشیر بر گردن افراختے	چو گواز سواران سر انداختے
ز خون دلیراں بدشت اندرون	چو دریا زمین موج زن شد ز خون
ہمہ روئے صحرا سر و دست و پا	بزیر سم اسپ جنگ آزما
ز سم ستوراں و راں ہین دشت	زمین شد شش و آسماں گشت ہشت
فرو رفت بر رفت روز نبرد	بماہی نم خوں و بر ماہ گرد
بزد در نبرد آں یل ارجمند	بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست	یلان را سر و سینہ و پا و دست

بزمی مثنویاں: اس قسم کی مثنویاں فارسی میں بہت ہیں۔ نظامی، امیر خسرو، خواجہ کرمانی، جامی، ہاتفی، مکتبی، ہلالی عرفی، فیضی وغیرہ وغیرہ نے بہت سی بزمی مثنویاں لکھی ہیں ان سب شعراء کی مثنویاں پر ریویو کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے راقم الحروف مولانا نظامی کی اس مثنوی سے جس کا نام خسرو شیرین ہے اور بھی جامی کی زلیخا سے کچھ ذیل میں درج کرتا ہے :

در بزم خسرو پرویز با شیرین وصف بہاری فرماید

چو پیر سبز پوش آسمانی	ز سبزہ بر کشد صبح جوانی
جوانان را و پیران را دگر بار	بسر سبزی در آید سرخ گلنار

گل از گل تخت کاوسی بر آرد — بنفشه پر طاؤسی بر آرد
بسا مرغا که عشق آوازه گردد — بسا عشق کهن کان تازه گردد
چو خرم شد به شیرین جان خسرو — جهاں می کرد عهد خرمی نو
چو می خرم نهاد و خرمی دوست — ز گلها بر درید از خرمی پوست
گل از شادی علم در باغ میزد — سیاه فاخته بر زاغ میزد
سمن ساقی و نرگس جام در دست — بنفشه در خمار و سرخ گل مست
صبا بر قمع کشاده ساده گان را — صلا در داده کار افتادگان را
شمال انگیخته هر سو خروشے — زده بر گاؤ چشمے پیل گوشے
زمین نطع شقائق پوش گشته — شقائق مهد مرزن گوش گشته
سهی سرو از چمن قامت کشیده — ز عشقش لاله پیراهن دریده
بنفشه تاب زلف افگنده بر دوش — کشاده باد نسرین را بنا گوش
عروسان ریاحین دست بر روئے — شکرزانان شگوفه شانه در موئے
نموده ناف خاک آبستنیها — ز ناف آورده بیرون رستنیها
هوا بر سبزه گوهر باگسسته — زمرد را به مروارید بسته
غزال شیر مست از دلنوازی — به گرد سبزه با مادر به بازی
تذرو اق بر ریاحین پر فشانده — ریاحین بر تذروان سر فشانده
ز هر شاخے شگفته نوبهارے — گرفته هر گلے بر کف نثارے
صبا از سبزه در هر باغ وراغے — ز گل افروخته هر دم چراغے
گل از هر منظر نظاره کرده — قبائے سرخ را صد پاره کرده

درم ریزہ شدہ ہر شاخسارے | زسر ہر یک جدا کردہ نثارے
بطرف ہر چمن بر روئے چمانہ | بہر جوئے شدہ آبے روانہ
صنوبر بر در سنبل نشستہ | چو مستان در میان گل نشستہ
چنیں فصلے بدیں عاشق نوازی | خطا باشد خطا بے عشق بازی
خراماں خسرو و شیریں شب و روز | بہر نزہت گہے شاد و دل افروز
گہے خوردند مے در مرغزارے | گہے چیدند گل در کوہسارے

واضح ہو کہ مولانا نظامی ایک معروف مثنوی نگار ہیں اور بحیثیت مجموعی فارسی کے ایک مستند شاعر ہیں اس پر بھی بہت بڑے فطرت نگار شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ اشعار بالا میں بہار کے وصف منظوم فرماتے ہیں نظم کا اسلوب کیا شک ہے کہ بہت اچھا ہے مگر عمدہ بیان کسی بہاری سینری کا حوالہ قلم نظر نہیں آتا ہے وہی گل و صبا و سنبل کی بندش غیر فطری انداز کے ساتھ بالا میں پائی جاتی ہے، جیسا کہ اکثر فارسی کی مثنویوں میں دیکھی جاتی ہے۔ خارجی مضامین کی بندش بھی فطری ترکیب کے ساتھ جیسا کہ سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک میں دیکھتے ہیں کسی فارسی کی مثنوی میں نہیں دیکھتے۔ راقم الحروف کی دانست میں خارجی مضامین جس قدر فطری انداز کے ساتھ میر حسن کی مثنوی میں بندش پاتے گئے ہیں فارسی کی کوئی مثنوی یہ ترکیب بندش کی نہیں رکھتی فارسی کی تمام بزمی مثنویوں کے مقابل میں یہ اردو کی مثنوی بہت زیادہ نیچرل پیرایہ بیان رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے مثنوی نگار شعرا عموماً فطرت نگاری کا کم مذاق رکھتے ہیں ان کی ساری تصنیفیں نیچرل معاملات سے کم و بیش طور پر علیحدگی دکھلاتی ہیں جہاں دیکھو مبالغوں کی بھرمار ہے یا اسی طرح کے مصنوعی اندازوں سے ان کے کلام بھرے ہوئے ہیں فارسی کی شاعریاں عام طور پر اس

نامطبوع پیرایہ سے بدنما ہو رہی ہیں صرف مثنوی نگاری ہی کا یہ طور نہیں ہے اب کے شعرار اگر مصلاح مذاق کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو فارسی کی شاعری ان کی اس توجہ فرمائی سے بہت کچھ فائدے اٹھا سکے گی ذیل میں کچھ اشعار مولانا جامی کی زلیخا سے نذر ناظرین ہوتے ہیں ؟

خواب دیدن یوسف سجدہ آفتاب و ماہتاب یازدہ ستارہ و استماع اخوان و ازدیاد حسد ایشاں

خوش آں کہ مند صورت باز رستہ | زسحر چشم بنداں چشم بستہ
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب | ندیدہ کس چنیں بیدار و در خواب
بپوشیدہ ز ناپائندہ دیدہ | ولے پوشیدہ آئندہ دیدہ
شبے یوسف بہ پیش چشم یعقوب | کہ پیش او ز چشمش بود محبوب
بخواب خوش نہادہ سر ببالیں | بخندہ لعل نوشین کرد شیریں
ز شیریں خندہ آں لعل شکر خند | بدل یعقوب را شورے در افگند
چو یوسف نرگس سیراب بکشاد | چو بخت خویش چشم از خواب بکشاد
پدر گفت اے شکر شرمندہ تو | چہ موجب داشت شکر خندۂ تو
بگفتا خواب دیدم مہر و مہ را | درخشندہ کواکب یازدہ را
کہ یکسر داد تعظیم بدادند | بسجدہ پیش رویم سر نہادند
پدر گفتا کہ بس کن ایں سخن بس | مگو ایں خواب را زنہار با کس

مباد این خواب را اخوان بدانند
به بیداری صد آزارت رسانند

ز تو در دل هزاران غصّه دارند
درین غصه کجت فارغ گذارند

نیارند از حسد این خواب را تاب
که بس روشن بود تعبیر این خواب

پدر کرد این وصیت لیک تقدیر
بپائے یکسله زنجیر تدبیر

بهر یک کس گفت یوسف آن فسانه
نهاد آن را باخوان در میانه

شنیدستی که هر سر کز دو بگذشت
باندک وقت در هر زبان گشت

چه خوش گفت آن نکوگوئے نکوکار
که سر خواهی سلامت سر نگهدار

چو وحشی مرغ از قید قفس جست
دگر نتوان بدستان پائے او بست

چو اخوان قصه یوسف شنیدند
ز غصه پیرهن برخود دریدند

که یارب چیست در خاطر پدر را
که نشناسد ز نفع خود ضرر را

نمی داند که از طفلے چه آید
که طفلی جز طفیلے را نشاید

بهر یک چند به با قدر دره نغے
دهد زاں گوهر خود را فروغے

خورد آں پیر مسکین زاں فریبے
شود از صحبت آں ناشکیبے

کند قطع نکو پیوندی ما
برد مهر پدر فرزندی ما

پدر کرد ست زینساں سربلندش
ببخشد این قدر حشمت پسندش

هوس دارد که ما از تیرگی پاک
بسجده پیش او افتیم برخاک

نه تنها ما که مادر با پدر هم
نباید جاه جوئی این قدر هم

پدر را ما خریداریم نے او
پدر را ما هوا داریم نے او

اگر روز است در صحرا نشانیم
وگر شب خانه اش را پاسبانیم

براعدا قوت بازو لیش از ما است | براحباب آبروئے پوشش از ما است
بجز حیلت گری اندر چہ وبد است | گر نمیاں بر سر ما برگزیدا است
بیا تا کار خود را چارہ سازیم | سر راہش تواں آوارہ سازیم
چو با ما بر سر غمخوارگی نیست | دوائے او بجز آوارگی نیست
بباید چارہ سازی امیال لبست | زرفتہ اختیار چارہ از دست
چو خارے برد بدانش سبختے | بباید کند ناگشتہ درختے
بقصد چارہ سازی عہد بستند | بعزم مشورت یکجا نشستند

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کا تورات میں اور بھی قرآن شریف میں مندرج ہے لاریب مولانا جامی نے اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ منظوم فرمایا ہے۔ یہ مثنوی جامی کی ایک دلکش پیرایہ رکھتی ہے فردوسی کی یوسف زلیخا ہرگز اس کو نہیں پہنچتی ہے فردوسی نے اپنی مثنوی کے لئے وہی رزمی بحر اختیار کی ہے جو شاہنامہ کی ہے۔ اور خلاف تقاضائے قصہ یوسف و زلیخا بیانات کا انداز بھی رزمی رکھا ہے فردوسی کے انداز بیان کی بدولت حضرت یوسف رستم نما معلوم ہوتے ہیں ؛

حکمت آموز مثنویاں۔ یہ مثنویاں ایک بکار آمد قسم شاعری کی ہیں اس میں مسائل علم الاخلاق، تدبیر المنزل اور سیاستہ المدن کے منظوم پیرایہ میں جوا کہ قلم ہوتے ہیں مثال اس قسم کی مثنوی کی سعدی علیہ الرحمہ کی بوستان اور حضرت فریدالدین عطار کا پندنامہ ہے۔ انہیں دونوں کتابوں سے بہ سبیل انتخاب کچھ اشعار درج ہذا ہوتے ہیں واضح ہو کہ بوستان سعدی میں ہر قسم کے حکمت آموز مضامین دیکھے جاتے

ہیں ہزارہا مسائل جو حکمت عملی سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب لاجواب میں حضرت مصنف نے داخل کیئے ہیں، تدوین مضامین کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دس بابوں میں کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب حضرت شیخ ممدوح کی بڑی پایہ رکھتی ہے دو چار حکایتوں کے سوا جتنی حکایتیں اس میں دیکھی جاتی ہیں نہ صرف حضرت کے وفور اطلاع سے خبر دیتی ہیں بلکہ ہر طرح پر ایسی حکمت آموز ہیں کہ اس کتاب گرامی میں تمامتر درج ہونے کا پورا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ سب حکایتیں ایک ہی بحر میں منظوم ہوئی ہیں اور حضرت مصنف کی حیرت انگیز قوت شاعری کا جلوہ دکھلاتی ہیں، جاننا چاہیئے کہ حکمت آموز مثنویاں اس قسم شاعری سے تعلق رکھتی ہیں جس کو انگریزی میں ڈائیڈیکٹک شاعری کہتے ہیں ؛

حکایت اتابک مرحوم تکلہ بن سعد زنگی

سعدی بہ حیثیت مثنوی نگار

در اخبار شاہاں پیشین ہست — کہ چوں تکلہ بر تخت زنگی نشست
بدورانش از کس نیازرد کس — سبق برد گر خود ہمیں بود و بس
چنیں گفت یکرہ بصاحبدلے — کہ عمرم بسر رفت بیجا حلے
چو می بگذرد ملک و جاہ و سریر — نبرد از جہاں دولت الا فقیر
بخواہم بہ کنج عبادت نشست — کہ دریابم ایں پنج روزے کہ ہست
چو بشنید دانائے روشن نفس — بہ تندی بر آشفت کامے تکلہ بس
طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

تو بر تخت سلطانی خویش باش
به اخلاق پاکیزہ درویش باش
تصدق وار دات کمر بستہ دار
زطامات و دعویٰ زباں بستہ دار
قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصلے ندارد دم بے قدم
بزرگان کہ نقد صفا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمتہ کا پند نامہ بھی نہایت توجہ طلب کتاب ہے کچھ کلام حضرت کا مندرج ذیل ہوتا ہے؛

در بیان عمل خالص

ہر کہ باشد اہل ایمان اے عزیز
پاک دارد چار چیز از چار چیز
از حسد اول تو دل را پاک دار
خویشتن را بعد ازاں مومن شمار
پاک دار از کذب و از غیبت زباں
تاکہ ایمانت نیفتد در زیاں
پاک گرداری عمل را از ریا
شمع ایمان ترا باشد ضیا
چوں شکم را پاک داری از حرام
مرد ایماں دار باشی والسلام
ہر کہ دارد ایں صفت باشد شریف
ورنہ دارو دارد ایمان ضعیف
ہر کہ باطن از حرامش پاک نیست
روح او را رہ سوئے افلاک نیست
چوں نباشد پاک اعمال از ریا
ہست بے حاصل چو نقش بوریا
ہر کہ اندر عمل اخلاص نیست
در جہاں از بندگان خاص نیست
ہر کہ کارش از برائے حق بود
کار او پیوستہ با رونق بود

ہر چند حضرت عطار کا پند نامہ حضرت سعدی کی شوخی تحریر سے معرا ہے۔ اور

قریب قریب صرف نظم ہی نظم کا انداز رکھتا ہے تاہم بیکار آمد مضامین سے مملو ہے اور اس لیئے بہت کچھ قابل تعریف ہے۔

تصوّف آموز مثنویاں: جاننا چاہئیے کہ تصوّف سے مُراد علم روحانیت ہے یہ علم اہل ہند میں درجہ کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب بھی ہندوستان میں بیشتر ہندو فقرا اس سے باخبر ہیں اس زمانہ میں وہ ہندوستانی حضرات جنھوں نے یورپین تعلیم پائی ہے اس علم کو تھیاسوفی کہتے ہیں یہ علم فی زمانہ جو مرکوز اہل ہند ہے امریکہ وغیرہ سے ہندوستان میں بشکل جدید آیا ہے گو ماخذ اس کا وہی ہندوستان کا تصوّف قدیم ہے۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ علم پہلے زردشتیوں کے میل جول سے داخل مذہب ہوا پھر جب مسلمان ہندوستان میں آئے ہندی تصوّف نے اُن کے دماغ میں اچھے طور پر گھر کر لیا یہاں تک کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک زیادہ حصّہ کا مذہب تصوف ہی دکھائی دیتا ہے۔ فقیر کا قول یہ ہے کہ اگر تصوف سے کلام خدا و رسولؐ مراد ہے تو مجھے تصوف سے انکار نہیں ہے لیکن اگر تصوف سے مُراد کوئی اور شئے ہے تو تصوف کو سات سلام۔ بہر حال فارسی تصوف آموز مثنویاں بہت ہیں مثلاً نان و حلوا تصنیف حضرت بہائی آملی کی، اور من و سلوی جناب شمس العلماء مفتی سید محمدؐ عباس صاحب کی مگر سب سے زیادہ قابل لحاظ تصنیف اس فن کی مثنوی مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کی ہے۔

مولانائے روم بہ حیثیت مثنوی نگار: مولانائے روم علیہ الرحمہ کی شہرت حضرت کے علم و فضل کے علاوہ مثنوی نگاری کی بنیاد پر ہے اہل اسلام میں خاص کر اہل سنت حضرت کی اس تصنیف منظوم کو جو مثنوی مولانائے روم کے نام سے

مشہور ہے بعد کتاب اللہ کے قابل قدر جانتے ہیں چنانچہ یہ شعر

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

فقیر کے قول کی صحت پر دال ہے اسی طرح اس تصنیف گرامی کی وجہ سے حضرت مولانا ایک بہت اعلیٰ درجہ کے بزرگ مانے جاتے ہیں حتیٰ کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

من چہ گویم وصف آں عالیجناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

لاریب مولانائے روم بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں فرقہ امامیہ میں بھی حضرت بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اہل اسلام کی ایک پابند شریعت جماعت نے اس مثنوی کے چند اشعار کو تعلیم قرآنی اور اسلامی توحید کے مخالف قرار دیا ہے ان اعتراضات کے جوابات مولانا کے معتقدین نے مثنوی کی شرح وغیرہ میں قلم کئے ہیں جنھیں حضرات معترضین محض تاویلات دور از کار کہتے ہیں بہر حال بحث سے اگر درگذر کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ مولانا ایسے ہی بزرگ تھے کہ اسلام کے ہر فرقہ میں حضرت کی توقیر کی جائے حضرت کی مثنوی بہت سے قرآنی آیات کی تفسیر ہے، بہت سے احادیث نبوی کی شرح ہے اور بہت سے مسائل فلسفہ و حکمت کی توضیح ہے، تصوف کہ عبارت ہے صفائی خیالات سے اس کتاب لاجواب میں عجب خوش جمالی کے ساتھ جلوہ گر ہے واردات قلبیہ اور جذبات روحیہ کے بیانات حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں تعلیمات روحانیہ پیرایہ تمام بے نظیر نظر آتا ہے، تزکیہ روحی اور تصفیہ قلبی کے اعتبار سے کم کوئی کتاب مولانا کی اس مثنوی مبسوط کے برابر نکلے گی، نفس شاعری اس مثنوی کی بہت

ہے یہ مثنوی اپنے تعلیمات کے اعتبار سے انگریزی کی اُس صنف شاعری میں
ب ہوتی ہے جس کو ڈائی ڈیکٹک کہتے ہیں ذیل میں کچھ اشعار نمونہ کلام کے طور
ج کیئے جاتے ہیں ۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند ‌ ‌ ‌ ز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ‌ ‌ ‌ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ‌ ‌ ‌ تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش ‌ ‌ ‌ باز جوید روزگار وصل خویش
من بہر جمعیتی نالاں شدم ‌ ‌ ‌ جفت بدحالاں و خوشحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من ‌ ‌ ‌ از درون من نجست اسرار من
سر من از نالہ من دور نیست ‌ ‌ ‌ لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جان ز تن مستور نیست ‌ ‌ ‌ لیک کس را دید جان دستور نیست
آتش ہست ایں بانگ نائی نیست باد ‌ ‌ ‌ ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
آتش عشق ہست کاندر نے فتاد ‌ ‌ ‌ جوشش عشق ہست کاندر مے فتاد
نے حریف ہر کہ از یارے برید ‌ ‌ ‌ پردہایش پردہاے ما درید
ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید ‌ ‌ ‌ ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید
نے حدیث راہ پرخون می کند ‌ ‌ ‌ قصہائے عشق مجنوں می کند
محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست ‌ ‌ ‌ مر زباں را مشتری جز گوش نیست
گر نبودے نالۂ نے را ثمر ‌ ‌ ‌ نے جہاں را پر نکردی از شکر
در غم ما روزہا بے گاہ شد ‌ ‌ ‌ روزہا با سوزہا ہمراہ شد

روزہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست
ہر کہ جز ماہی ز آبش سیر شد — وانکہ بے روزیست روزش دیر شد
در نیابد حال پختہ ہیچ خام — پس سخن کوتاہ باید والسلام
بند بگسل باش آزاد اے پسر — چند باشی بند سیم و بند زر
گر بریزی بحر را در کوزۂ — چند گنجد قسمت یک روزہ
کاسۂ چشم حریصاں پُر نشد — تا صدف قانع نشد پُر دُر نشد
ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد — او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما!
اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا — طور مست و خر موسیٰ صاعقا

متفرق مضامین کی مثنویاں: واضح ہو کہ مثنوی چار شعر کی بھی ہوتی ہے اور شعر سے زیادہ کی بھی، جیسا کہ بالا میں حوالۂ قلم ہو چکا ہے۔ مثنوی ہر بحر میں نہیں جاتی ہے اس کے واسطے چند بحریں مخصوص کر دی گئی ہیں چونکہ کسی عروضی تذکرہ سے اس کتاب کو بحث نہیں ہے اس لئے ذکر مثنوی کی بحروں کا بیان نہیں جاتا ہے بہرحال جاننا چاہیئے کہ متفرق مضامین کی مثنویاں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ کو رزمی کوئی بزمی کوئی حکمت آموز اور کوئی تصوف آمیز اور اُن کا کبھی مرکب ا ہوتا ہے مگر بہرحال ہیں اُن کے مضامین بدیع اور منقح ہوتے ہیں ذیل میں حضرت سعد کی کچھ متفرق مثنویاں درج ہذا ہوتی ہیں۔

این حکایت شنو که در بغداد / رایت و پرده را خلاف افتاد
رایت از گرد راه و رنج و رکاب / گفت با پرده از طریق عتاب
من و تو هر دو خواجه تاشانیم / بندهٔ بارگاه سلطانیم
من ز خدمت دمے نیاسودم / گاه و بیگاه در سفر بودم
تو نه رنج آزمودهٔ نه حصار / نه بیابان و باد گرد و غبار
قدم من به سعی پیشتر است / پس چرا عزت تو بیشتر است
تو بر بندگان مهروئی / با کنیزان یاسمن بوئی
من فتاده بدست شاگردان / به سفر پائے بند و سرگردان
گفت من سر بر آستان دارم / نه چو تو سر بر آسمان دارم
هر که بیهوده گردن افرازد / خویشتن را به گردن اندازد

دیدم گل تازه چند دسته / ایضاً له / بر گنبدے از گیاه بسته
گفتم چه بود گیاه ناچیز / تا در صف گل نشیند او نیز
بگریست گیاه و گفت خاموش / صحبت نه کند کرم فراموش
گر نیست جمال و رنگ و بویم / آخر نه گیاه باغ اویم
من بندهٔ حضرت کریمم / پروردهٔ نعمت قدیمم
گر بے هنرم و گر هنرمند / لطف است امیدم از خداوند
با آنکه بضاعتے ندارم / سرمایهٔ طاعتے ندارم
او چارهٔ کار بنده داند / چون هیچ وسیلتش نماند
رسم است که مالکان تحریر / آزاد کنند بندهٔ پیر

اے بار خدائے عالم آرائے | بر سعدیِ پیر خود ببخشائے
سعدی رہِ کعبۂ رضا گیر | اے مرد خدا رہ خدا گیر
بد بخت کسے کہ سر بتابد | زین در کہ درِ دگر نیابد

ایضاً وله

درختے کہ اکنوں گرفتست پائے | بہ نیروئے مردے برآید ز جائے
ورش ہمچناں روزگارے ہلی | بگردونش از بیخ بر نگسلی
سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل | چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اُردو کی مثنویاں

رزمی مثنویاں: اُردو میں کوئی رزمی مثنوی فردوسی کے شاہنامہ یا نظامی کے سکندر نامہ کے مدارج کی نظر نہیں آتی ہے جو رزمی مثنویاں ہیں وہ انھیں کتابوں کے مختصر ترجمے ہیں ابھی تک اُردو کے کسی شاعر نے اپنی فکر سے کوئی اصلی مثنوی جو کسی واقعہ بزرگ پر مشتمل ہو نہیں لکھی ہے ظاہراً اُردو میں میرؔ انیس یا مرزا دبیرؔ کے سوا کوئی شاعر بھی فردوسی یا نظامی کی فکر و قابلیت کا نہیں گزرا ہے مگر ان بزرگوار نے مثنوی نگاری کی طرف کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں فرمائی، اب بھی اگر شعرائے وقت سے کچھ حضرات اس قسم کی مثنوی نگاری کی جانب میلان فرمائیں تو اُردو سے رزمی مثنویوں کی ناداری کا داغ مٹ جائے بہ اسباب ظاہر واقعہ کربلا ایک ایسا معاملہ رزمی ہے کہ اگر اعلیٰ درجہ کی طباعی و قابلیت کے ساتھ لبشکل مثنوی منظوم کیا جائے تو ہومرؔ. فردوسی. ورجلؔ. ملٹنؔ. بالمکیؔ اور بیاسؔ کی تصانیف سے کم تماشائے سخن نہیں دکھلا سکتا ہے،

بزمی مثنویاں: فارسی کی بعض عشقیہ مثنویوں کے ترجموں کے علاوہ شعرائے

اُردو نے برائے خود بہت عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزمی مثنویوں کی طرف اکثر شعرا متوجہ ہوئے ہیں۔ ذیل میں بعض ان شعرائے نامی کی قابلیت تصنیف پر اظہار رائے کیا جاتا ہے جنھوں نے عشقیہ مثنویاں تحریر فرمائی ہیں ؎

میر تقی بہ حیثیت مثنوی نگار: میر تقی میرؔ میر ارباب سلطان المتغزلین تھے۔ مگر حضرت کی مثنوی نگاری سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جو درجہ غزل سرائی میں حاصل ہے وہ مثنوی نگاری میں نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صرف مضامین داخلی کی بندش کی بڑی قابلیت حاصل تھی۔ لیکن مثنوی نگاری کی وہی شاعر داد دے سکتا ہے جو مضامین خارجی کی بندش پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے، یہ قدرت آپ کو بہت حاصل نہ تھی۔ اس لئے آپ کی مثنویاں تمامتر داخلی پہلو کی شاعری سے خبر دیتی ہیں در حقیقت آپ کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں کہیں آپ صحرا، جنگل، جبال، بحر، خزاں، بہار، برق، باراں، سرما، گرما، طیور، وحوش، آب، سراب وغیرہ وغیرہ کے خوش آئند مضامین کو بیان نہیں فرماتے ہیں اس پر بھی جس قدر آپ کی مثنویاں ہیں قابل توجہ ہیں کس واسطے کہ روحانی اور قلبی معاملات کے بیانات سے مملو ہیں جتنی عاشقانہ کیفیتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں اکثر بے حیائی کی ذلتوں سے بری دکھائی دیتی ہیں کمتر کوئی جزو تصنیف ایسا ہے کہ تہذیب کی آنکھیں اُسے دیکھ کر شرم اٹھائیں ذیل میں آپ کی عشقیہ مثنویوں کے اشعار نمونے کے طور پر درج کیئے جاتے ہیں:۔

انتخاب اشعار از مثنویات میرؔ

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اِس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اُس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا

ایضاً وله

ناگہ اک کوچے سے گزر ہوا — آفت تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اُس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اِس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کچھ ادائی کی — تاب و طاقت نے بیوفائی کی
مُنہ جو اِس کا طرف سے اُس کی پھرا — مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا
وہ تو تھی نہ تھی خیال اُس کا — بے طرح ہووے گو کہ حال اُس کا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ
وہ گئی اُس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز — رنگ چہرہ سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریبان تک — چاک کے پہنچے پانو داماں تک

دیگر

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی — محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ — محبت نے کیا کیا دکھلائے ہیں داغ
محبت اگر کار پرواز ہو — دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبت ہے آب رخ کار دل — محبت ہے گرمی بازار دل
محبت عجب خواب خونریز ہے — محبت بلائے دل آویز ہے
محبت کی ہیں کار پردازیاں — کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل — محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل
محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ — کلی کے دل تنگ میں ہے یہ چاہ
محبت ہی سے دل کو رد بیٹھیے — محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ — محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے ہے انتظام جہاں — محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت سے روتے گئے یار خوں — محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو — محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو
محبت سے پروانہ آتش بجاں — محبت سے بلبل ہے گرم فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز

اشعار از ساقی نامہ

ہے قابل سجدہ سر انداز — جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرواز
اُس کو مے حسن نے چکھایا — ہستی کا نشہ اسی سے پایا
پی اس نے شراب خود پرستی — طاری ہوئی اس پہ زور مستی
وہ مست شراب ناز ہے فرد — خورشید ہے اس کا جام پر درد
ہے گردش چشم اس سے افسوں — پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول — آخر ہے وہی، وہی ہے اوّل
عالم ہے قرابۂ مئے خام — ہے دور سپہر گردش جام
مشہور جہاں جو کیف و کم ہے — بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مست نیاز ہے حرم میں — وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
ہے آب رخ زمانہ اُس سے — روشن ہے تمام خانہ اُس سے
مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے — صہبا میں جو دلکشی ہے وُہ ہے
شمشاد ہے سرفراز اُس سے — گل دیدہ نیم باز اُس سے
خوگر اسے ناز پیشگی ہے — وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے
جو عکس پڑا ہے جام مے میں — آتی ہے صدا اُسی کی نے میں

ہرچند میر صاحب نے اچھا لطف سخن دکھلایا ہے مگر ظہوری کے ساقی نامہ کو نہیں پہنچتے ہیں، حق یہ ہے کہ اگر میر حسن کی مثنوی اُردو میں نہ ہوتی تو فارسی کے مقابل میں اُردو کی کوئی مثنوی قابل ذکر نہ ہوتی ؛

واضح ہو کہ منجملہ بزمی مثنویات کے میر صاحب نے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں نواب آصف الدولہ کی شکار افگنی کے حالات رقم فرماتے ہیں یہ مثنوی اُن حضرات کو جو فن صید افگنی کے ماہر ہیں کسی طرح لذت بخش نہیں ہو سکتی صبا نے بھی ایک ایسی ہی مثنوی لکھی ہے وہ بھی مذاق صحیح نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ میر نہ صبا دو میں کوئی صاحب بھی علم صید سے واقف نہ تھے بس اُن کی اس قسم کی مثنویاں کیا لطف سخن پیدا کر سکتی ہیں ان دونوں اُستادوں کی شکاری مثنویاں غایت صید افگنی سے مطلق خبر نہیں دیتی ہیں اور نہ اُن سے کسی علمی مسئلہ کی تحقیق ظہور میں آتی ہے اگر صید افگنی سے مجرد شیر و شغال کی جان لینی مراد ہے تو یہ مثنویاں خوب ہیں مگر اربابِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شکار علمائے بامذاق کا کام ہے اس کام کے کرنے والے سر سموئیل بیکر سنڈرسن اسٹرنڈیل بالڈون کیمبل رالیس گوگس وغیرہ وغیرہ گذرے ہیں یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے صاحبِ علم اور صاحبِ تحقیق تھے بلاشبہ ان کی تصنیفات حضرات اہلِ علم کے ملاحظہ کے قابل ہیں اور وفور فوائد سے معمور ہیں جس نے ان مصنفوں کی تصنیفوں کو بغور پڑھا ہوگا اور ان کی ہدایتوں کے مطابق شغل صیدِ افگنی کو ملحوظ رکھا ہوگا اُسے میر اور صبا کی شکاری مثنویوں سے کیا حظ حاصل ہو سکتا ہے ان مثنویوں میں علم ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات وغیرہ وغیرہ کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا۔ جتنے بیانات ہیں فطرت خداوندی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، کوئی بات تعلیم تعلم کی کہیں دکھائی نہیں دیتی، البتہ بدمذاقی کے ساتھ جگہ جگہ نواب اودھ کی تعریفیں پائی جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں مجرد مدحت سرائی کی غرض سے لکھی گئی ہیں، ان کو تحقیق و تدقیق مسائل علمیہ سے کیا علاقہ۔ یہ بھی امر قابل لحاظ ہے کہ چونکہ یہ مثنویاں

درباری رنگ رکھتی ہیں ان میں وہ لطف کلام زنہار نہیں پایا جاتا ہے جو امرأ القیس کے قصیدہ لامیہ کے ان معدودہ اشعار سے اٹھتا ہے جن میں اپنی صحبت گلگنی کے حالات کو حوالہ قلم کرتا ہے حضرات ناظرین راقم کی تحریرات سابق کو ملاحظہ فرمائیں ان کے اعادہ کی یہاں حاجت نہیں ہے۔

مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار: اُستاد مومن کی کلیات میں چھ مکمل مثنویاں پائی جاتی ہیں یہ سب کی سب مثنویاں تمام تر داخلی شاعری کا رنگ رکھتی ہیں اس اعتبار سے ان مثنویوں کو میر تقی صاحب کی مثنویوں کی قسم کے ساتھ اتحاد حاصل ہے مگر انداز کلام کا جو فرق ہے وہ وہی ہے جو اُن دونوں استادوں کی غزل سرائیوں میں محسوس ہوتا ہے مومن خاں کی مثنویاں دقّت انگیز پیرایہ رکھتی ہیں اس نامطبوع انداز سے میر صاحب کی مثنویاں تمام تر بری ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں بالقصد مضامین داخلی کو ایسی دشوار بندش دیتے ہیں کہ فہم کو ایذا لاحق ہوتی ہے برخلاف اس کے میر صاحب اپنی اپنی کیفیت سوز و گداز و خستگی کے ساتھ ادائے مضامین میں ایسی آسانی کی راہ اختیار کرتے ہیں کہ اُن کے کلام کی پُر تاثیری میں کسی قسم کا نقصان لاحق نہیں ہوتا ہے، بخیر جب حضرات ناظرین مومن خاں کی مثنویوں کو بلا مبالغہ احد سے موازنہ فرمائیں، فقیر کی دست میں اُستاد مومن کی مثنویاں ہر چند زور طبیعت اور سخن آفرینی سے خبر دیتی ہیں مگر ان میں اخلاقی یا تمدنی یا مذہبی مضمون کا نشان نہیں پایا جاتا ہے اُن کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو خس برابر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ عملی مترتب ہو۔ اکثر مضامین عشقیہ ہیں مگر وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ جن سے آوارہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوا نوجوانان غیر مقید کے اُن کا گزار کسی اور

کسے دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا۔ المختصر فقیر کی دانست میں مومن خاں کی کوئی مثنوی مفید بنی آدم نظر نہیں آتی ہے ذیل میں اُستاد مومن کی دو مثنویوں کی نسبت راقم اظہار خیالات کرتا ہے

مثنوی نمبرا۔ جس کا سر نامہ یہ شعر ہے

این نامہ شکایت ستم نام　　　　بامن خود گفت سال اتمام

واضح ہو کہ اس مثنوی میں اوّل مومن خاں اپنی عاشق مزاجی کو بیان کرتے ہیں، پھر ایک نوجوان عورت پر اپنے عاشق ہو جانے کو تحریر فرماتے ہیں پھر اپنے عشق کی بدحالیوں کا مرقع کھینچتے ہیں اس کے بعد اپنی محبوب سے اپنے ہی گھر میں ملاقات ہو جانے کی صورت دکھاتے ہیں اور وہ اس طور پر کہ اس کا آنا ان کے گھر ایک شادی کی تقریب سے ہوا، تو ساری مثنوی غیر فطری اور بے سر پا ہے مگر اس مقام پر بہت کچھ خلاف قرائن ہے شادی کی تقریب میں کسی ناکتخدا عورت سے تنہائی میں ملاقات کا نصیب ہونا اس ملک ہندوستان میں خلاف قیاس ہے، اس ملک میں ناکتخدا شریف زادیاں اس طور پر مطلق العنان نہیں رہتی ہیں کہ اُن سے کوئی شخص نامحرم شادی وغیرہ کی تقریب میں بحالت تنہائی عشق بازی کی باتیں کرے یہ بالکل رسم ملکی کے خلاف ہے اوّل تو اس ملک کی ناکتخدا لڑکی کیوں تقریب شادی میں عاشقانہ گفتگو کا محل ڈھونڈنے لگی دوم یہ کہ اگر وہ ناہمواری سے ڈھونڈے بھی تو اس کی رشتہ مندبی بیاں کب اُس کو ایسا موقع ہاتھ لگنے دیں گی۔ یہ قصہ عجب نامربوط سا معلوم ہوتا ہے صاف ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس عورت کا مومن خاں تذکرہ کر رہے ہیں ہندوستان کی شریف زادی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو شریف زادیوں کے اس کے انداز نہ تھے، اس جگہ آپ فرماتے ہیں :-

ہوئی شادی ہمارے ہاں اک بار — آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکت محفل سراپا زیب — اس کے آنے کی ہوگئی تقریب
ایک خالی مکان میں آکر — مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر
کیا ملاقات رشک تنہائی — دمبدم تازہ حسرت افزائی

اس ملاقات کی گفتگو کو طول دے کر آپ اس کی رخصت کو بیان فرماتے ہیں، پھر اس کے مرجانے کا حال حوالۂ قلم پایا جاتا ہے اس سے صدمہ کا منتج ہونا امر طبعی ہے مگر آخر کار معشوق کے غم کا زائل ہوجانا چہ معنی دارد یہ وہ غم نہیں ہے جو کبھی زائل ہو معشوق کا بدل معشوق کے ساتھ ہو نہیں سکتا، انسان کو عشق دوبارہ نہیں ہوتا ہے معشوق کے مرنے کے بعد یا معشوق سے مفارقت کے بعد پھر عشق نہیں پیدا ہو سکتا ہے ایک دل میں دو دلبر کی جگہ نہیں ہوتی خواہ آن واحد میں اور خواہ آن مختلف میں مومن خان کو معشوق اول کے مرنے کے بعد معشوق دوم ہاتھ لگ گیا پھر معشوق اول کو ایسا بھول بیٹھے کہ گویا کوئی ایسا شخص کبھی وجود ہی میں نہ تھا، اس نئے معشوق کے ساتھ جو معاشرت کا طور بیان کیا جاتا ہے وہ ویسا نظر آتا ہے جیسا کہ عیش مزاج نوجوان کا ہوا کرتا ہے مختصر یہ ہے کہ یہ مثنوی ابتدا تا انتہا اخلاقی پایہ سے بہت گری ہوئی ہے اس کو میر تقی صاحب کی ان مثنویوں کی روحانیت سے کیا علاقہ جن کے کچھ اشعار داخل کتاب ہذا کیے گئے ہیں۔

واضح ہو کہ مثنوی نگاری کے لئے داخلی شاعری کے ساتھ خارجی شاعری کی بھی بڑی حاجت ہے مومن خان خارجی شاعری سے کوئی بہرہ نہیں رکھتے تھے، اس لئے ان کی مثنویاں امور خارجیہ سے تمامتر معرا ہیں، ان کی مثنویوں میں کہیں بھی کوئی سینری

کا بیان نہیں دیکھا ہے کوئی بیان ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے صبح شام سرما گرما برق
باراں جبال بحور صحرا دشت وغیرہ وغیرہ کی کچھ بھی کیفیت ظاہر ہوتی ہو میر حسن نے جس
قدر امور خارجیہ کو اپنی مثنوی میں حوالۂ قلم کیا ہے اس کا بیسواں حصہ بھی مومن خاں کی کسی
مثنوی میں نہیں پایا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ مجرد داخلی شاعری کا برتنے والا شاعر حسب مراد
مثنوی لکھ نہیں سکتا ہے ایسا شاعر اچھا غزل سرا ہو سکتا ہے چنانچہ مومن خاں ایک
اچھے غزل سرا ہیں، مگر اچھے مثنوی نگار نہیں ہیں ان کی مثنویاں صرف انھیں اشخاص کو
اچھی معلوم ہوں گی جو تقاضائے مثنوی نگاری سے واقفیت نہیں رکھتے ظاہرا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں نے مضامین غزل اپنی مثنویوں میں بھر دیئے ہیں ایسے
مضامین غزل سرائی میں جو کچھ بھلے دکھائی دیں مثنوی نگاری میں تو یقیناً بے محل نظر
آتے ہیں کلام کے لئے موقع و محل کا لحاظ واجبات سے ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوسی
کی یوسف و زلیخا جامی کی یوسف زلیخا سے بہتر ہوتی، لاریب فردوسی طوسی ایک
بڑے رزمی شاعر تھے مگر یوسف و زلیخا سی عشقیہ مثنوی لکھنے کے واسطے وہ مخلوق نہیں
ہوئے تھے۔ المختصر مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار بڑے شاعر نہ تھے۔ ان کی
مثنویاں صرف داخلی مضامین سے بھری ہوئی ہیں جو نقصان مثنوی نگاری پر دال ہے
علاوہ اس کے جتنے داخلی مضامین ان کی مثنویوں میں پائے جاتے ہیں ان کو حکمت
آموزی سے کوئی علاقہ نہیں آتا ہے، دس شعر بھی ان کی ساری مثنوی میں ایسے دکھائی
نہیں دیتے ہیں۔ جن میں کسی اعلیٰ قسم کے مذہبی مسائل حوالۂ قلم ہوئے ہوں، عموماً جتنے داخلی
مضامین منظوم کئے گئے ہیں وہ ایسے ہی ہیں کہ غیر مہذب اور ناتعلیم یافتہ نوجوانوں کی پسندیدگی
کے قابل ہیں کوئی مضمون ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتا ہے، ایسے

مضامین کسی حکیم کو کیا مطبوع ہو سکتے ہیں معمولی درجہ کے ارباب فہم و فراست بھی اُن کی طرف رغبت نہیں کر سکتے، واقعی ایسی شاعری کہ جس سے تخریب اخلاق کا خوف ہو جس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہیں نکل سکے نہ صرف ایک بیکار بلکہ قابل احتراز امر ہے' ابراقم مومن خان کی مثنوی نمبر ۲ کی نسبت ذیل میں اظہار خیالات کرتا ہے اِس کے سرنامہ کا شعر یہ ہے

نام ایں چند نالۂ بیہم ہمچو تاریخ گشت قصۂ غم

واضح ہو کر اِس مثنوی کی نسبت بھی خیالات راقم وہی ہیں جو بالا میں عرض کئے گئے لیکن اِس اجزا کی نسبت مختصر طور پر کچھ اور بھی رائے زنی کی جاتی ہے' حضرات ناظرین سے توجہ فرمائی کی امید ہے:

اِس مثنوی میں مومن خاں پہلے ساقی کی طرف مخاطب ہو کر طالب بادہ ہوتے ہیں اور فصل کی خوبیوں کو ارشاد فرما کے ساقی کو خبر دیتے ہیں کہ پھر ولولہ عشق پیدا ہوا ہے بعد ازاں معشوقوں کی بیوفائی کا ذکر کر کے ایک عشقیہ داستان بیان فرماتے ہیں یہ مضامین بہت طول و بسط کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں مگر فطری خوبیوں سے تمامتر معرا ہیں اِس مثنوی میں فصل بہار کا بیان فطرت سے سروکار نہیں رکھتا، بقیہ مضامین جتنے ہیں اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، حکیمانہ مضمون کا ایک شعر بھی دکھائی نہیں دیتا، اخلاق آموز کلام کی جھلک بھی اتنے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتی کوئی جزو کلام روحانیت کی داد نہیں دیتا جتنے خیالات ہیں جو انانہ ہیں اور جو انانہ بھی ایسے کہ کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے دماغ میں گزر پا نہیں سکتے، اِن سب [illegible] کیفیتوں کے ساتھ بندش مضامین کی ترکیب کچھ ایسی دشوار ہے کہ دماغ کو اُن سے [illegible] ہوتی ہے بلکہ اس عدم سلاست سے اور بھی زیادہ طبیعت متاذی ہوتی ہے جب مضامین مفید

کی معدومی ہر شعر میں پائی جاتی ہے یہ سب اشعار کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا حکم رکھتے ہیں خیر اب راقم مضمون داستان عرض کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک نوجوان مومن نام عاشق مزاج تھا ہمیشہ حسینوں کی صحبت میں لطف عیش اٹھایا کرتا تھا۔ مومن خان لکھتے ہیں کہ ہم کو اس سے بہت محبت تھی، اتفاقاً وہ کسی عورت پر مائل ہوا اس عورت نے بھی اس کی طرف میلان دکھایا۔ ایک ماہ تک دونوں مشغول عیش و عشرت رہے وہ نوجوان اس عورت کا ایسا شیفتہ ہو گیا کہ اس نے ہم سے بھی ملاقات ترک کی اور باوجود بڑی تلاش و تجسس کے کئی برس تک اس کا نشان ہمیں نہ ملا۔ ایک روز جی چاہا کہ سیر صحرا کیجیے مگر وہاں کے سبزہ و لالہ و گل سے دل بستگی نہ ہوئی، وحشت ہمیں کشاں کشاں دشت کی طرف لے گئی، وہاں ایک شخص بدحال نظر آیا جو حالت غم میں اپنے عشق کی سرگذشت بک رہا تھا دیکھا تو یہ وہی شخص مومن ہے جو ہمارا دوست تھا اور جس کی ہم کو تلاش تھی، قصہ اس مثنوی کا اسی قدر ہے مگر اس کا شاعرانہ بیان طولانی ہے اور بلاشبہ مومن خان کے زور طبیعت اور خلاقی سخن سے خبر دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ لطف تناسب سے سارا بیان معرا ہے اور زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس عدم تناسب کے ساتھ عدم تہذیب کی قباحت بھی اس میں لاحق ہے مثلاً راقم ذیل میں کچھ اشعار درج کرتا ہے جس سے عدم تناسب اور عدم تہذیب دونوں ظاہر ہوتے ہیں۔

وہ منہ میں زباں کی لذتیں ہائے
ظاہر حرکت سے غبتیں ہائے

اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ
جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ

پھر کیا ہی ادا سے کج ادائی
کس ناز سے کرتی ہاتھا پائی

وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار
واکرنے نہ دینا بند شلوار

وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا — وہ تکیہ پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگاتی آہ لاتیں — حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی — آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ نیچے پڑے رہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکلے جانا
وہ جی سے بتنگ ہونے لگنا — کچھ بس نہ چلا تو رونے لگنا
وہ چین بہ جبیں ہو کے کہنا — کس بیکسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو تو یہ ہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس — کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس
اتنا تو نہ چاہیے ستانا — ہر شام سے صبح تک جگانا
اس ظلم کا کچھ ٹھکانا بھی ہے — آخر کسی اور کے بھی جی ہے
یہ ظلم اٹھائے کوئی کب تک — آ پہنچی ہے اب تو جان لب تک
کیا جان ہی لینے کی ہے جی میں — ہے فائدہ کچھ تمہیں اسی میں
منظور یہی ہے گر تو کہدو — گر جان ہی لینی ہے تو لے لو
ہاں ہاں تری بات اب میں سمجھی — ہے بات یہی قسم خدا کی
چاہے ہے تو یہ کہ اس کو موت آئے — مر جائے یہ اور مری بلا جائے
پھر اور کسی سے دل لگاؤں — آنکھ اور ہی شوخ سے لڑاؤں
ہیں کیا ہی سلوک عاشقانہ — یہ رہ گئی الفت زمانہ
بے رحم تو اب تو مجھ کو دے چھوڑ — بس چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ

اتنا نہ ستا کہ جی ہی جائے　　فرصت دے کہ جاں میں جان آئے

بیزاری میں اس کا لطف کیا ہے　　آسودہ ہیں وقت خواب کا ہے

حضرات ناظرین با تمکین راقم کو معاف فرمائیں اشعار بالا کے اعادہ کی مجبوری لاحق تھی لہٰذا اوقات صلاح مذاق عوام کے خیال سے نامطبوع کلاموں کے اعادہ کی حاجت لاحق ہو جاتی ہے تجربہ تو اخلاقی حالت ان اشعار کی ہے "عیاں را چہ بیان" اب اُن کے عدم تناسب پر غور فرمائیے افسوس ہے کہ اس مرض میں زیادہ تر الشیبائی مصنفین مبتلا دیکھے جاتے ہیں جائے لحاظ ہے کہ اِس مثنوی میں مومن خاں تحریر فرماتے ہیں کہ اُن کا دوست مومن جو عرصہ سے بے نشان ہو رہا تھا انھیں ایک دشت میں ملا اور انھوں نے اُسے آہ و نالہ کرتے پایا. جب کان دھر کر سُنا تو بدشواری معلوم ہوا کہ ایام گزشتہ کا بیان کر رہا ہے یہ ایام گزشتہ کا بیان سلسلہ اری کے ساتھ طولانی ہے. زینہار ایسے بیان پر ایک ایسا شخص جو از خود رفتہ ہو اور غایت وحشت عشق سے دشت گزیں ہو گیا ہو، قادر نہیں ہو سکتا اس پر طرہ یہ ہے کہ اس کی زبان سے ایسی باتیں کہلائی گئی ہیں جو اشعار بالا میں منظوم ہیں ممکن نہیں ایسا شخص جو مبتلائے مصائب عشق ہو کر دشت میں جا بیٹھے، وہ بند شلوار کو یاد کرے اور ایسے خیالات کو دل میں جگہ دے :۔

میر حسن دہلوی بہ حیثیت مثنوی نگار :۔ اس شاعر گرامی کی شہرت اُس کی مثنوی کی بدولت ہے گو اس کی غزل سرائی بھی پر از مذاق اور قابل لحاظ ہے، میر حسن سادات کرام سے تھے، اور فصاحت و بلاغت میں جو ائمہ ہدیٰ کی خاص شان ہے اپنی قوم کے نمونہ تھے. اُن کی مثنوی ایک بہت حیرت انگیز تصنیف ہے، اِس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے، اردو میں تو یقیناً ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے، فارسی میں بھی اس کی

مجموعی خوبیوں کی کوئی مثنوی نظر نہیں آتی ہے۔ فقیر کی دانست میں فارسی اور اردو کے کسی مثنوی نگار نے میر حسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اِس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اُس نے گویا شاعری کا لطف ہی نہیں اٹھایا۔ اِس مثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص سب کتابیں پڑھ ڈالے اور شکسپیر الف لیلہ اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے محروم رہ جائے کوئی صاحب مذاق آدمی ایسا نہیں ہے جو اِس مثنوی سے لطف کثیر نہ اٹھائے اور زبان اُردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے۔ یہ مثنوی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی پہلوؤں سے پُر از فوائد ہے اِس مثنوی کی قدر ذاتی سوا حکیم کے کسی سے نہیں ہوسکتی اِس کی خوبیاں قابل ذکر ہیں **اوّل** یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے **دوم** یہ کہ جو قصہ منظوم کیا گیا ہے اِس کے اجزا تناسب کے اعتبار سے خوب ہیں، **سوم** یہ کہ تشبیہات و استعارات فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ **چہارم** یہ کہ مبالغے ناپسند نہیں ہیں ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے **پنجم** یہ کہ رسم و رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں **ششم** یہ کہ جو سین یعنی معاملہ خارجی بیان ہوا ہے تصویر کا حکم رکھتا ہے **ہفتم** یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پیرایہ شاعری میں بڑی راستی اور پر تاثیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں **ہشتم** یہ کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے **نہم** یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں جس کے باعث بے اختیار دل اُن کی جانب کھنچتا ہے المختصر یہ مثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم شاعری کا پورا لطف دکھاتی ہے اور اپنے مصنف کی قابلیت عام کی بڑی ثبت ہے ہر چند یہ ممکن

نہیں کہ اس کتاب میں اس مثنوی کے تمام اشعار کی خوبیاں بیان کی جائیں تاہم اس مثنوی کی عمدگی کے دکھانے کے لئے ضرور ہے کہ اس کے بعض اجزا پر ریویو لکھا جائے، واضح ہو کہ دنیا میں کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے۔ جو نقصان سے تمامتر پاک ہو آدمی ناقص پیدا ہوا ہی ہے پس اس ریویو میں اس مثنوی کے جو عیب ہوں گے وہ بھی ظاہر کئے جائیں گے، گو اس مثنوی کے عیوب داغہائے آفتاب کی طرح نہ بہت ہیں اور نہ بدنما ہیں ؛

میر حسن کی مثنوی پر ریویو: میر حسن اپنی مثنوی کو حسب دستور مصنفین اہل اسلام حمد کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ یہ حمد ایسی لکھی گئی ہے کہ عالم سے عالم موحد کو بھی اس کی پسندیدگی سے چارہ نہیں، اسلامی حکمائے متالہین اس کی جو قدر فرمائیں بجا ہے اس حمد کو دیکھ کر دل کو صاف اس امر کا اعتراف ہوتا ہے کہ سچا شاعر صاحب الہام ہوتا ہے واقعی یہ حمد ایسی ہے کہ عبادت کا پورا حکم رکھتی ہے اور ورد و وظیفہ کے کام کی ہے کون شخص مقرِ ذاتِ باری ایسا ہے جو اس کو پڑھ کر روحانی لطف نہیں اٹھا سکتا ہے کون مذہبی آدمی ایسا ہے جو اس حمد کو پڑھ کر ولولۂ شوق کبریائی میں بیتاب نہیں ہو سکتا ہے اس حمد کا کوئی شعر ایسا نہیں ہے جو منتخب نہ ہو وقت انتخاب قوت انتخاب جواب دینے لگتی ہے نہیں معلوم ہوتا کہ کس شعر کو انتخاب کیجئے اور کس کو ترک کیجئے سلسلۂ سخن ایسا خوب ہے کہ اس کی درہمی طبیعت گوارا نہیں کرتی ناچار چند شعر بلا قصد انتخاب ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں ؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جس کے سجدے کو اول قلم
قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا — ہوا حرف زن یوں کہ ربّ العلا
نہیں تیرا کوئی نہ ہوگا شریک — تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک

پرستش کے قابل ہے تو اے کریم
کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

رہ حمد میں تیری عزوجل
تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل

وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے
قلم جو لکھے اس سے افزود ہے

سبھوں کا وہی دین و ایمان ہے
یہ ہیں دل تمام اور وہی جان ہے

وہ ظاہر ہیں ہر چند ظاہر نہیں
یہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں

نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے
وہ کچھ شے نہیں پہ ہر اک شے میں ہے

نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں
ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

ذیل میں کچھ اشعار نعت عرض کئے جاتے ہیں میر حسن نے نعت ایسی لکھی ہے کہ قوت انتخاب کو اُس میں دخل نہیں ہے؎

نبی کون یعنی رسول کریم
نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم

ہُوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب
یہ علم لدنی کھلا دل پہ سب

بغیر از لکھے اور کئے بے رقم
چلے حکم پر اُس کے لوح و قلم

ہُوا علم دین اُس کا جو آشکار
گزشتہ ہوئے حکم تقویم پار

اُٹھا کفر اسلام ظاہر کیا
بتوں کو خدائی سے باہر کیا

محمد کے مانند جگ میں نہیں
ہُوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

یہ تھی رمز جو اس کے سایا نہ تھا
کہ رنگ دوئی واں تک آیا نہ تھا

اس کے بعد میر حسن سایہ کے نہ ہونے کی اور وجہیں بھی لکھتے ہیں، سبحان اللہ کیا قادرالکلامی ہے اہل شوق بقیہ اشعار کو اُن کی مثنوی میں ملاحظہ فرمالیں حمد و نعت کے بعد منقبت امیرالمومنین علیہ السلام کے اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

نہیں ہمسر اُس کا کوئی جز علیؓ ۔ کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی
ہوئی جو نبوت نبی پر تمام ۔ ہوئی نعمت اس کی وصی پہ تمام
جہاں فیض سے اس کے ہے کامیاب ۔ نبیؐ آفتاب و علی ماہتاب
علیؓ دین و دنیا کا سردار ہے ۔ کہ مختار کے گھر کا مختار ہے
دیار امامت کے گلشن کا گل ۔ بہار ولایت کا باغ سنبل
علی راز دار خدا و نبیؐ ۔ خبر دار سر خفی و جلی
علیؓ بندہ خاص درگاہ حق ۔ علیؓ سالک و رہبر راہ حق
علیؓ ولی ابن عم رسول ۔ لقب شاہ مردان و زوج بتولؓ
کسے یوں حق چاہے کوئی پیر سے ۔ یہ نسبت علی کو نہیں غیر سے
خدا نفس پیغمبرش خواندہ است ۔ دگر را فضیلت کجا ماندہ است
یہاں بات کی اب سمائی نہیں ۔ نبیؐ و علیؓ میں جدائی نہیں
نبیؐ و علیؓ ہر دو نسبت بہم ۔ دوتا و یکے چوں زبان قلم
علی کا عدو دوزخی دوزخی ۔ علیؓ کا محب جنتی جنتی
نبیؐ و علیؓ فاطمہؓ اور حسنؓ ۔ حسین ابن حیدر یہ ہیں پنجتن
ہوئی ان پہ دو جگ کی خوبی تمام ۔ انھوں پر درود اور انھوں پر سلام
علیؓ سے لگا تا بہ مہدی دین ۔ یہ ہیں ایک نور خدائے بریں
انھوں سے ہے قائم امامت کا گھر ۔ کہ بارہ ستوں ہیں یہ اثنا عشر
صغیرہ کبیرہ سے یہ پاک ہیں ۔ حساب عمل سے یہ بیباک ہیں
ہویداں سے ظاہر کمال رسولؐ ۔ کہ بہتر ہوئی سب سے آل رسولؐ

واضح ہو کہ اشعار بالا کس قدر مبالغہ سے پاک ہیں دوستدار خاندان محمد صلعم کا جیسا عقیدہ ہونا چاہئے اس سے کوئی شعر ایک حرف برابر بھی کم و بیش نہیں ہے سبحان اللہ کیا شاعری ہے کہ مبالغہ سے تمامتر پاک ہے در حقیقت میر حسن کی حمد و نعت و منقبت میں مبالغہ کی جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے اس کے ساتھ شاعری کا جلوہ وہی ہے جیسا کہ ہونا چاہئے اس سے معلوم ہوا کہ سچی شاعری مطلق مبالغہ پردازی کی محتاج نہیں ہے ؂

میر حسن نے اصحاب پاک رضوان اللہ علیہم کی تعریف بھی ایسی لکھی ہے کہ کیا کہنا اس سے زیادہ کیا سچی تعریف ہو سکتی ہے آپ فرماتے ہیں :-

سلام اُن پہ جو اس کے اصحاب ہیں ۔۔۔ وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
خدا نے انھوں کو کہا مومنین ۔۔۔ وہ ہیں زینت آسمان و زمین
خدا اُن سے راضی رسول اُن سے خوش ۔۔۔ علیؓ ان سے راضی بتولؑ اُن سے خوش
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی ۔۔۔ کہ ہیں دل سے وہ جان نثار نبیؐ

مناجات کے اشعار ورد رکھنے کے قابل ہیں اس سے بہتر مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات کیا ہو سکتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن جس شئے کو لکھتے ہیں اس کے مغز کو پہنچ جاتے ہیں پوست و استخوان و لغو و حشو سے تمامتر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں ؂

اشعارِ مناجات

الٰہی بحق رسولِؐ امیں ۔۔۔ بحق علیؑ و باصحاب دیں
بحق بتولؑ و بہ آل رسولؐ ۔۔۔ کروں عرض جو میں سو ہووے قبول
الٰہی میں بندہ گنہگار ہوں ۔۔۔ گناہوں میں اپنے گرانبار ہوں
مجھے بخشیو میرے پروردگار ۔۔۔ کہ تو ہے کریم اور آمرزگار

مری عرض ہے یہ کہ جبتک جیوں — شراب محبت کو تیری پیوں
سوا تیری الفت کے اور سب ہے ہیچ — یہی ہو۔ نہ ہو اور کچھ ایچ پیچ
جو غم ہو تو ہو آل احمدؐ کا غم — سوا اس الم کے نہ ہو کچھ الم
رہے سب طرف سے مرے دل کو چین — بحق حسنؑ اور بحق حسینؑ
کسی سے نہ کرنی پڑے التجا — تو کر خود بخود میری حاجت روا
صحیح اور سالم سدا مجھ کو رکھ — خوشی سے ہمیشہ خدا مجھ کو رکھ
مری آل و اولاد کو شاد رکھ — مرے دوستوں کو تو آباد رکھ
میں کھاتا ہوں جس کا نمک اے کریم — سدا رحم کر اُن پہ تو اے رحیم
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ — رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ
بر آویں مرے دین و دنیا کے کام — بحق محمدؐ علیہ السلام

واضح ہو کہ اس مناجات میں میر حسن نے اپنے آقا کو فراموش نہیں کیا بحضور خداوند دو جہاں بھی ادائے حق نمک میں پہلو تہی جائز نہ رکھی اس انداز کلام سے کس قدر اخلاقی تعلیم مترشح ہے پاس نمک کیا عظیم شے ہے آدمی کو ناسپاس نہیں ہونا چاہیئے ناسپاس دشمن خدا اور بدخواہ نبی آدم ہوتا ہے اسی لئے اسلام شکر گزاری کا موکد ہے ؛

حمد و نعت و منقبت و تعریف صحابہ و مناجات کے بعد میر حسن سخن کی تعریف زیب رقم فرماتے ہیں، بلا قصد انتخاب دو شعر ان کی تعریف سخن سے ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں ؛

سخن کا سدا گرم بازار ہے — سخن سنج اس کا خریدار ہے
رہے جب تلک داستان سخن — الٰہی رہیں قدر دان سخن

اس کے بعد حضرت مصنف شاہ عالم بادشاہ کی مدح صرف چار شعروں میں ختم کر کے نواب

آصف الدولہ کی مدح میں بہت اشعار حوالہ قلم فرماتے ہیں مگر اس مختصر مدح میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاہ عالم اور آصف الدولہ کے فرق مراتب کو دکھلا دیتے ہیں

وہ مہر منور یہ ماہِ منیر — اور اس کا یہ نجم سعادت وزیر

آصف الدولہ کی مدح ویسی ہے جیسی کہ ایشیائی شعراء لکھا کرتے ہیں مگر دو مقام اس میں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ ممدوح کی سخاوت کے بیان میں میر حسن یوں لکھتے ہیں۔

سوا اس کے ہے اور یہ داستان — کہ ہو جس پہ قربان حاتم کی جان
ہوئی کم جو اک بار کچھ برشگال — گرانی سی ہونے لگی ایک سال
غریبوں کا دم سا نکلنے لگا — توکل کا بھی پانوں چلنے لگا
وزیر الممالک نے تدبیر کر — خدا کی دیا راہ میں مال و زر
محلہ محلہ کیا حکم یہ — کہ باڑی سے اس غم کے کھولیں گرہ
یہ چاہا کہ خلقت کسی ڈھب جیئے — کئی لاکھ لاکھ ایک دن میں دیئے
یہ لغزش پڑی ملک میں جو تمام — لیا ہاتھ نے اس کے گرتوں کو تھام

ان اشعار کی حکمت آموزی میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس کی تمدنی خوبیاں محتاج بیان نہیں ہیں اس صدی کے شائستہ حکمران بھی اگر کریں گے تو اتنا ہی کریں گے ہوشیار سے ہوشیار گورنمنٹ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی ہے سخاوت کی تعریف میں کم تر کسی شاعر نے ایسا بکار آمد مضمون حوالہ قلم کیا ہے دوسرا مقام قابل لحاظ یہ ہے کہ سخاوت کے بیان میں حضرت مصنف ممدوح کے مذاق شکار کا ذکر فرماتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مذاق شکار بڑی سپاہی مزاجی سے خبر دیتا ہے افسوس ہے کہ ہم مسلمانان ہند خاص کر مسلمانان بہار سے اس کا مذاق بالکل جاتا رہا ہے۔ اگر یہ مذاق ہمارے ہم وطنوں کو باقی رہتا تو یہاں کے نوجوانوں کو ایسی مہمل چیزوں کی طرف میلان نہ ہوتا۔ جن سے

قویٰ غارت ہو جاتے ہیں خیالات پست ہو جاتے ہیں چستی اور چالاکی جاتی رہتی ہے اور ہر طرح کی کاہلیاں لاحق ہو جانے سے وہ نہ دنیا اور دین کے رہتے ہیں اللہم احفظنا من شرور انفسنا و سیئات اعمالنا وارحمنا یا ارحم الراحمین ؂

مدح نواب کے بعد میر حسن اپنی مثنوی کو عجز و انکسار کے ساتھ پیشکش ممدوح فرماتے ہیں اور عذر تقصیر بایک خوش اسلوب پیرایۂ شاعری میں بجا لاتے ہیں مصنف کا عجز و انکسار و عذر سب کا سب فطری سلاست سے معمور ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے نیچرل شاعر تھے، جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوتا جائے گا۔

اب راقم اس مثنوی کی ہر داستان پر علیحدہ علیحدہ ریویو تحریر کرتا ہے حضرات ناظرین باتمکین سے امید توجہ فرمائی ہے۔

آغازِ داستان

اس مثنوی کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی شہنشاہ تھا جس کے ماتحت کئی خراج گزار بادشاہ تھے اس کا ملک نہایت آباد تھا اور اس کی رعایا نہایت مرفہ حال تھی اسے لاولدی کے سوا کوئی غم نہ تھا اس غم سے وہ ایسا شکستہ ہو رہا تھا کہ آخر اس نے سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے کا قصد کیا وزیروں نے بہت سمجھایا اور یوں عرض کی کہ

فقیری جو کیجے تو دنیا کے ساتھ — نہیں خوب جانا ادھر خالی ہاتھ

پھر اولاد کے غم کو دور کرنے کی نظر سے اس طرح عرض پرداز ہوئے

مگر ہاں یہ اولاد کا ہے جو غم — سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف — کرو تم نہ اوقات اپنی تلف
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو — کہ قرآں میں آیا ہے لاتقنطوا

بلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو — نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

اس طرح بادشاہ کو تسلی دے کر وزراء نے نجومی، رمال اور برہمن بلائے اِن سبھوں نے اپنے اپنے علم کی رو سے بادشاہ کو اولاد کی خوشخبری دی ان طالع شناسوں میں سے برہمن نے یوں گذارش کی

مقرر ترے چاہیئے ہو پسر — کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر
ولیکن مقدر ہے کچھ اور بھی — کہ ہیں اِس بھلے میں بُرے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں — خطر ہے اسے بارھویں سال میں
نہ آوے یہ خورشید بالائے بام — بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ — رہے برج میں یہ مہ چار دہ

بادشاہ نے یہ کیفیت دریافت کر کے نہایت فطری انداز سے پوچھا کہ اس کی جان کا خطرہ تو نہیں ہے تسپر برہمن نے

کہا جان کی سب طرح خیر ہے — مگر دشتِ غربت کی کچھ سیر ہے

اِس کے سننے سے

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ الم — کہ دنیا میں توام ہیں شادی و غم

اِس سب گفتگو کے بعد اہلِ تنجیم رخصت ہوئے، بادشاہ نے بڑے اعتقاد کے ساتھ خدا سے اولاد کی دعا مانگنی شروع کی جو دعا دل سے کی جاتی ہے وہ قبول بھی ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ خدا نے بادشاہ کو ایک صاحب جمال جیتا جاگتا بیٹا مرحمت فرمایا اس داستان کا خلاصہ اسی قدر ہے مگر میر حسن نے طول و بسط کے ساتھ مضامین بالا کو منظوم کیا ہے، لیکن بندشِ مضامین میں تناسب کلام کا بڑا لحاظ رکھا ہے اِس داستان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے تمام مضامین ایک ایشیائی بلکہ ایک ہندوستانی مسلمان بادشاہ کے معاملات

ذاتی سے تعلق رکھتے ہیں لاولدی کے غم میں ترک سلطنت کا خیال کم تر کسی یوروپین بادشاہ کے دماغ میں جگہ کر سکتا ہے اس کے علاوہ وزرا کا اہل تنجیم کو بلوانا اور اُن سے طالع بادشاہ کی کیفیت کو دریافت کرانا بھی ہندوستانی ریاستوں کے معمولات سے خبر دیتا ہے واضح ہو کہ شاہان دہلی اور دیگر فرمانروایان ہندوستان کے درباروں سے ہمیشہ اہل تنجیم متعلق رہتے تھے اور اکثر امور اہم انھیں طالع شناسوں کی ہدایتوں کے مطابق تعمیل پاتے تھے، اسلام کی رو سے علم نجوم ورمل وغیرہ لاشئے متصور ہیں بلکہ ان پر کسی قسم کا اعتقاد رکھنا ممنوعات سے ہے مگر چونکہ یہ سب علوم کہ درحقیقت علم کا حکم نہیں رکھتے ہیں ایک عرصہ دراز سے شاہان ہنود کے زمانہ میں مروج تھے، اسلامی بادشاہوں نے بھی انھیں جاری رہنے دیا، یہاں میر حسن نجومیوں کی طالع شناسی کے حالات کو لکھ کر بادشاہ کے اسلامی عقیدہ کی طرف فوراً رجوع کرتے ہیں اگر کسی ہندو بادشاہ کا معاملہ بیان کرتے تو برہمن کی پوتھی کے خلاف میں یہ نہ کہتے

کہا شہ نے ہیں یہ نہیں اعتبار جو چاہے کرے میرا پروردگار

سبحان اللہ حضرت مصنف چونکہ عجب شاعر واقعہ نگار ہیں ہر قدم پر تناسب کلام کو کس قدر ملحوظ رکھتے ہیں اسی طرح حضرت کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی چند بیبیاں تھیں ان میں سے ایک حاملہ ہوئیں یہ کثرت ازدواج برائے خود ایک ایشیائی معاملہ سے خبر دیتی ہے المختصر اس داستان میں میر حسن نے ایک حسب مراد ایشیائی بادشاہ کی پوری تصویر کھینچی ہے اجزائے داستان پر از تناسب ہیں اور حضرت مصنف کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتے ہیں وہ جزو داستان جس میں نجومی رمال اور برہمن کے معاملات حوالہ قلم ہیں، بہت قابل لحاظ ہے یہ ایک پورا فوٹو ہندوستان کے مختلف طالع شناسوں کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصنف کو ایسے فن والوں کے حالات سے کافی اطلاع تھی +

داستان تولّد ہونے شاہزادہ بے نظیر کی

اِس داستان میں بادشاہ کے بیٹا ہونے کا بیان ہُوا ہے، ایسی خوشی کی تقریب میں ہندوستانی سلاطین کے محلوں میں کیونکر خوشی رچائی جاتی ہے اِس کی پوری تصویر میر حسن نے کھینچی ہے ساقی نامہ کے رنگ کے دو شعر لکھ کر حضرت مصنف لکھتے ہیں کہ جب نو مہینے گزرے تو ایک فرزند صاحب جمال پیدا ہُوا۔ خواصوں اور خواجہ سراؤں نے بحضور بادشاہ حاضر ہو کر نذریں گزرانیں اور وارث تاج و تخت پیدا ہونے کی مبارک بادیں دیں جب بادشاہ کو یہ مژدہ پہنچا، بادشاہ نے جانماز بچھا کر بہت کچھ سجدۂ شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

اِس کے بعد خواصوں اور خوجوں کی نذریں قبول فرما کر انھیں خلعت و زر بخشا، بعد ازاں جشن کا حکم دیا ہر طرح کے ارباب نشاط حاضر ہوتے گئے اس جگہ حضرت مصنف تفصیل وار ہر قسم کے باجوں کا ذکر کرتے ہیں اور معاملات موسیقی سے پوری اطلاع دکھلاتے ہیں کوئی سامان طرب و نشاط اٹھا نہیں رکھا ہے، پھر خوشی کی تقریبوں میں جو سلاطین انعامات تقسیم کرتے ہیں اس کا مشرح بیان بڑی اسلوبی سے حوالۂ قلم کیا ہے آپ فرماتے ہیں:

دیئے شاہ نے شاہزادے کے نانوں   مشائخ کو اور پیرزادوں کو گانوں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر   وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو خوجوں کو جوڑے دیئے   پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیئے
خوشی میں کیا یاں تلک زر نثار   جسے ایک دینا تھا بخشے ہزار

المختصر اس داستان میں یہ خوشی کی تقریب ایسی قابلیت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئی ہے کہ کیا لکھنا واقعی لطف بیان سے حضرت مصنف نے اس خوشی کا ایک نادر فوٹو کھینچا ہے کمال

شاعری یہ ہے کہ سارے بیانات مصوری کا حکم رکھتے ہیں واقعی میرحسن کی فطرت نگاری بڑے غضب کی ہے ایسی تقریبوں میں جو راگ رنگ اور دھوم دھام کی کیفیتیں ہندستان میں ہوا کرتی ہیں، سبحان اللہ کس خوبصورتی کے ساتھ پیرایۂ نظم میں در آئی ہیں کہ اُن کے پڑھنے سے غیر ملک کے آدمی کو ہر قسم کے رواج ملکی سے بڑی صحت کے ساتھ اطلاع پیدا ہو جا سکتی ہے یہی کیفیت "الف لیلہ" کی بھی ہے کہ ملک شام و مصر وغیرہ کے رسم و رواج اُس میں بڑی عمدگی کے ساتھ ذکر پاتے ہیں۔ پیدائش مولود کی کیفیت لکھ کر میرحسن اُس کی چھٹی کا ذکر کرتے ہیں پھر اُس کے دودھ بڑھانے کا حال رقم کرتے ہیں پھر جب اُس نے اور زیادہ سن پایا، تب اُس کے واسطے جو ایک باغ اس کے باپ نے تیار کیا اس کا بیان بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ داستان ذیل میں جو آگے قلم فرماتے ہیں سبحان اللہ کیا حسن کلام اور تناسب بیان ہے؀

داستان تیاری باغ کے بیان میں

حضرت مصنف اس داستان میں باغ و مکان کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جس سے ایشیائی مذاق کے باغ و مکان کی پوری کیفیت نمایاں ہوتی ہے ایشیائی سلاطین و امراء کے باغات و مکانات ایسے ہی ہوتے ہیں اب البتہ ہندوستان میں ترتیب باغات و مکانات میں یورپین مذاق کو بڑا دخل ہو گیا ہے ورنہ پہلے عمائد کے باغات و مکانات اسی ڈھب سے آراستہ کئے جاتے تھے جس طرح پر اس مثنوی میں زیب رقم ہوئے ہیں یہ بیانات میرحسن کی بڑی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں واقعی خارجی شاعری میں اس شاعر گرامی کو بڑی قوت حاصل تھی یہ وہ قوت ہے کہ میر صاحب اور مومن خان کو فطرت نے نہیں بخشی تھی جیسا کہ اُن شاعران نامی کی مثنویوں سے ہویدا ہے۔ جاننا چاہئے

کہ مثنوی نگاری کے لئے خارجی شاعری پر بھی بڑی قوت کا حامل رہنا واجبات سے ہے۔ اس قوت کی عدم موجودگی سے مثنوی نگاری کے پورے حقوق ادا نہیں ہو سکتے، حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اشعار ذیل میں حضرت مصنف نے کس قدر اپنی اس قوت کا اظہار فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایشیائی سلطان یا امیر کا مکان اور باغ پیش نظر ہو رہا ہے

دریا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر — کہ مہ کا بندھا جس میں تار نظر
چھتوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گزر نا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گلکاریاں
دئیے ہر طرف آئینے جو لگا — گیا چوگنا لطف اُس میں سما
وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں سنگھچے اُس میں روشن مدام — معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں — چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں
زمیں پر تھی اِس طور اس کی چھمک — ستاروں کی جیسے فلک پہ چمک
زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں — کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر — گئی چار سو اس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرد اُس کے سروِ سہی — ذرا دور دور اُس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیت دار بست | لگائے رہیں تاک واں مے پرست
ہوائے بہاری سے کچھ لہلہے | چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے
زمرد کے مانند سبزے کا رنگ | روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار | گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے بھرا باغ گل سے چمن | کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا | کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں | مدن بان کی اور رہی آن بان
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار | جدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں | سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار | ہر اک گل سفیدی سے مہتاب وار
کھڑے سرو کی طرح چنپا کے جھاڑ | کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن | عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑا آب جو ہر طرف کو بہے | کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پہ | نشے کا سا عالم گلستان پر
لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں | چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے
کہیں تخم پاشی کریں گود کر | پنیری جما دیں کہیں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال | رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد | اکڑتا کھڑے سرو کا جد نہ تد

خراماں صبا صحن میں چار سو — دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہُوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہُوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں — لگی جائیں آنکھیں بیٹھیں کا ناؤں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں — تعشق کی آپس میں باتیں کریں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق — کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق
سماں قمریاں دیکھ اس آن کا — پڑھیں باب پنجم گلستان کا

یہاں تک باغ و مکان کا حال بیان کر کے میر حسن دوادائیاں مغلانیاں خواص وغیرہ کا ذکر جو اس باغ میں خدمت بے نظیر کے واسطے مقرر تھیں کرتے ہیں یہ بیان بھی تمام تر ایشیائی سلاطین و امرا کے محلوں کی تصویر ہے اس کے بعد بے نظیر کی تعلیم و تربیت کا مذکور ہے یہ بھی ایک ایشیائی شاہزادے یا امیرزادے کے طریقہ تعلیم کی تصویر ہے غرض ایّامِ اسلام کے وقت میں جو اہلِ ثروت کی تعلیم کا طور تھا اس کا پورا فوٹو حضرت مصنف نے کھینچا ہے یہ بیان بھی خالی از نفع نہیں ہے میر حسن مختلف علوم و فنون کا ذکر کر کے بے نظیر کے نتیجہ اخلاقی تعلیم کے مضمون کو بھی نہیں فراموش کرتے ہیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال — مروت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے ہے نفروں سے نفرت اُسے — سدا قابلوں سے ہی صحبت اُسے
گیا نام پر اپنے وہ دلپذیر — ہر اک فن میں سچ مچ ہوا بے نظیر

داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

اس داستان میں بادشاہ کا یہ حکم صادر فرمانا مذکور ہے کہ کل شاہزادہ سیر باغ کو جائے گا اس سیر سے مطلب بادشاہ کا یہ تھا کہ شاہزادہ جب شہر سے ہو کر گزرے گا تو شہر کی رعایا کو وارث تاج و تخت کے دیکھنے کا موقع ملے گا اس کی پولیٹیکل مصلحت محتاج بیان نہیں ہے بادشاہ کو سیر کی اجازت دینے کی یہ وجہ ہوئی کہ جو روز شاہزادہ سیر کو نکلنے کو تھا وہ شاہزادہ کی عمر کے بارھویں سال آخر دن کے بعد کا قیاس کیا گیا تھا یعنی اہل تنجیم کے قول کے مطابق وہ دن قرار دیا گیا تھا جس کے ایک دن پہلے خطرہ کی گرہ کٹ جا چکی تھی مگر آئندہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کے حساب سے غلطی سرزد ہوئی تھی جس سے نتیجہ بد مترتب ہوا اور اہل تنجیم کا قول راست آیا واضح ہو کہ اہل تنجیم کو ہر قوم میں دخل رہا ہے البتہ اس وقت کی علم پرور قومیں نجومیوں کے اقوال پر نہ کچھ اعتبار رکھتی ہیں اور نہ ان کے فن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اقوام دنیا میں سب سے پہلے اہل اسلام نے نجومیوں کو جھوٹا سمجھا اور اس رو سے کہ ان کے پیشوا حضرت رسول اللہ صلعم نے اُن کی تکذیب فرمائی اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ فن تنجیم کو جسے اہل ہند جوتش کہتے ہیں علم ہیئت کا رتبہ حاصل نہیں ہے۔ عہد اسلام کے پہلے جتنی بت پرست قومیں تھیں اہل تنجیم کو قابل اعتبار جانتی تھیں اور اس وقت کی بت پرست قومیں بھی انھیں اسی عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی اہل تنجیم کا قول صادق بھی آجاتا ہے مگر ان کے اقوال ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن پر ہمیشہ تکیہ کیا جائے۔ جس طرح اس کہانی میں میر حسن اہل تنجیم کے قول کا صادق آنا لکھتے ہیں اسی طرح کی جولیس سیزر یعنی روم کے قیصر اول کی حکایت مندرج کتب تاریخ دیکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصر مذکور سے ایک

منجم نے کہا تھا کہ مارچ کی پندرھویں تاریخ سے ہوشیار رہنا، جب وہ تاریخ آئی قیصر کی اُس منجم سے راہ میں ملاقات ہوئی۔ قیصر نے منجم سے کہا کہ کہو آج پندرھویں تاریخ مارچ کی ہے۔ منجم نے کہا ہاں وہ تاریخ آئی ہے مگر ابھی تک گزر نہیں گئی ہے، اس سے تھوڑی ہی دیر کے بعد قیصر مارا گیا اور منجم کا قول راست نکلا بہر حال اس داستان میں میر حسن نے "ساقی نامہ" کے اشعار ذیل خوب لکھے ہیں:-

پلا ساقیا مجھ کو اک جام مُل — جوانی پہ آیا ہے ایام گل
غنیمت شمر صحبتِ دوستان — کہ گل پنج روز است در بوستان
ثمر سے بھلائی کا گر ہو سکے — شتابی سے بو لے جو کچھ بو سکے
کہ رنگِ چمن پہ نہیں اعتبار — یہاں چرخ میں ہے خزان و بہار

داستان حمام میں نہانے کی لطافت میں

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صبح ہوئی تو بادشاہ نے بیٹے سے فرمایا کہ بابا نہا دھو کر سیر کے لئے تیار ہو۔ جب حکم شاہ بے نظیر حمام میں گیا اِس کے بعد شاہی سواری بڑی تیاری سے نکلی جب سیر سے پھر کر بے نظیر واپس آیا تو اُس نے شب ماہ میں کوٹھے پر آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی بادشاہ نے اجازت دی مگر وہ رات عرصۂ دوازدہ سال کے اندر پڑتی تھی لیکن حساب کی غلطی کے باعث اس کی خبر بادشاہ کو نہ تھی جب بےنظیر نے کوٹھے پر آرام کیا، ہونے والی بات جو ہونے کو تھا ظہور میں آیا پہرا چوکی سے کوئی کام نہ نکلا۔ ومن المکتوب لامفر ولامہرب ؏

یوں تو میر حسن کا کوئی شعر لطف شاعری سے خالی نہیں ہوتا مگر اس داستان

کے دو جزو اس جگہ قابل داد ہیں اول بے نظیر کا حمام میں غسل کرنا، دوم سواری کی تیاری یہ دونوں جزو خارجی شاعری کے بڑے کمال سے خبر دیتے ہیں آفرین صد آفرین حقیقت یہ ہے کہ جب تک خارجی شاعری پر اتنی قدرت نہ ہو شاعر کو مثنوی نگاری کا قصد نہیں کرنا چاہیئے، واقعی میر حسن ہمارے ہندوستان کے شکسپیر ہیں جو خارجی اور داخلی دونوں شاعریوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اگر اردو میں ڈراما نگاری ہوتی تو ہندوستان میں میر حسن ہی کالیداس کے ہم پلہ اس صنف شاعری کے اعتبار سے نکلتے، بہر حال اب حضرات ناظرین پہلے کیفیت حمام کے بیان پر توجہ فرمائیں، حضرت مصنف فرماتے ہیں :-

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں	عرق آگیا اُس کے اندام میں
تن نازنیں نم ہوا اُس کا کل	کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
پرستار باندھے ہوئے لنگیاں	مہ و مہر سے طاس لے کر وہاں
لگے ملنے اُس گلبدن کا بدن	ہوا اڈ ناڑا آب سے وہ چمن
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک	برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
لبوں پر جو پانی پڑا سربسر	نظر آئے جیسے دو گلبرگ تر
ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس	کہے تو پڑی جیسے نرگس پہ اوس
لگا ہونے ظاہر یہ اعجاز حسن	ٹپکنے لگا اس سے انداز حسن
گیا حوض میں جب شہ بے نظیر	پڑا آب میں عکس ماہ منیر
وہ گورا بدن اور بال اس کے تر	کہے تو کہ ساون کی شام و سحر
نمی سے تھا بالوں کا عالم عجب	نہ دیکھی کوئی خوب تر اس سے شب
کہوں اس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات	کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات

زمیں پر تھا اک موجۂ نور خیز | ہوا جب وہ فوارہ ساں آب ریز
زمرد کے لے ہاتھ میں سنگ پا | کیا خادموں نے وہ آہنگ پا
ہنسا کھلکھلا وہ گل نو بہار | لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں کا ہوا | اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے | ہوئے جی سے قرباں چھوٹے بڑے
دعائیں لگے دینے بے اختیار | کہا خوش رکھے تجھ کو پروردگار
کہ تیری خوشی سے ہے سب کی خوشی | مبارک تجھے روز و شب کی خوشی
نہ آوے کبھی تیری خاطر پہ میل | چمکتا رہے یہ فلک کا سہیل
کیا غسل جب اس لطافت کے ساتھ | اڑھا کھیس لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
تہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح | کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

اہل انصاف جو کچھ اس فطری شاعری کی داد دیں بجا ہے بعد غسل کرنے کے بینظیر نے جو پوشاک پہنی اور جس طرح زیورات سے آراستہ کیا گیا اس کا بیان بھی ایک ایشیائی شاہزادہ کے تمامتر حسب حال ہے خوف طوالت سے راقم حضرت مصنف کے ان اشعار کو یہاں درج نہیں کرتا ہے دوسرا فوٹو جو حضرات ناظرین کے قابل توجہ ہے یہ ہے کہ میر حسن بڑی خوبی کے ساتھ بادشاہ اور بادشاہزادے کی سواری کی تیاری اور روانگی کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان ایسا ہے جس میں خس بھر بھی مبالغہ یا جھوٹ کو لگاؤ نہیں ہے لاریب میر حسن کے بیانات رسم و رواج ملکی سے نہایت صحت کے ساتھ خبر دیتے ہیں جس داستان میں دیکھیے کچھ نہ کچھ ملکی بیانات ایسے ہیں کہ تمامتر اہل مذاق کی پسندیدگی کے قابل ہیں یہی کیفیت کتاب "الف لیلہ" کی ہے کہ اس میں چند اسلامی

ملکوں کے مراسم وغیرہ نہایت عمدگی کے ساتھ اندراج پائے ہیں اہل واقفیت "الف لیلہ" کی نسبت لکھتے ہیں کہ بہت سے مضامین رسم و رواج اس کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ درج پائے ہیں کہ سیاحوں کو بھی اُن سے ایسی صحت کے ساتھ مطلع ہونے کا موقع نہیں ملا ہے اسی طرح اس مثنوی میں بھی بہت ملکی معاملات ایسی عمدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے بہتر بیان صورت امکان نہیں رکھتا ہے بڑے بڑے شاہانِ دہلی کی سواریاں جس طور پر نکلتی تھیں اُس کی پوری تصویر اشعار ذیل میں نظر آتی ہے، فقیر کی دانست میں یہ بیان ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے سین کو پیش نظر کرتا ہے جس سے اکبر جہانگیر شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں :-

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار — کئے خوانِ گوہر کے اُس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم — ہوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار — ہزاروں ہی تھی ہاتھیوں کی قطار

سواری شاہزادۂ بے نظیر جانب باغ

سنہری روپہلی وہ عماریاں — شب و روز کی سی طرح داریاں
چمکتے ہوئے بادلے کے نشان — سواروں کے غٹ اور بالوں کی شان
ہزاروں ہی اطراف میں پالکی — جھلا بور کی جگمگی نالکی
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں — اور ان کے ڈبلے پانوں کی پھرتیاں
بندھیں پگڑیاں طاس کی سر اوپر — چکا چوند میں جس سے آوے نظر
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے — جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے

وہ ماہی مراتب وہ سرو رواں — وہ نوبت کا دولھا کی جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما — سہانی وہ نوبت کی آوے صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی — قدم با قدم بالباسِ زری
بجاتے ہوئے شادیانے تمام — چلے آگے آگے سے شاد کام
سوار اور پیادے صغیر و کبیر — جلو میں تمامی امیر اور وزیر
وہ نذریں کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں — شہ و شاہزادے کو گذرانیاں
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار — چلے سب قرینے سے باندھے قطار
بجے اور سجائے سبھی خاص و عام — لباسِ زری میں ملبس تمام
طرق کے طرق اور پرے کے پرے — کچھ ایدھر اُدھر کچھ ورے کچھ پرے
مرصع کے سازوں سے کوتل سمند — کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند
وہ فیلوں کی اور میگ ڈمبر کی شان — جھلکتے وہ مقیش کے سائباں
چلے پایۂ تخت کے ہو قریب — بدستورِ شاہانہ نیتی جریب
سواری کے آگے پئے اہتمام — لئے سونے روپے کے عاصے تمام
نقیب اور جلودار اور چوب دار — بہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
اُسی اپنے معمول و دستور سے — ادب سے تفاوت سے اور دور سے
بڑھو نوجوانو بڑھے جائیو — دو جانب سے باگیں لیے آئیو
بڑھے جائیے آگے سے چلتا قدم — بڑھے عمر و دولت قدم با قدم
غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
تماشائیوں کا جدا تھا ہجوم — کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم

لگا قلعے سے شہر کی حد تلک — دکانوں پہ تھی بادلے کی جھلک

منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در — تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر

کیا تھا زبس شہر آئینہ بند — ہوا چوک کا لطف واں چار چند

رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ — گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ

ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن — ہر اک سطح تھی جوں زمین چمن

یہ خالق کی سن قدرت کاملہ — تماشے کو نکلی زن حاملہ

لگا کنج سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف

وحوش و طیور اس گھڑی بر محل — پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

نہ نکلا جو اک مرغ قبلہ نما — سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

حضرت مصنف بادشاہ اور شاہزادے کی سیر سے واپس آنے اور شاہزادہ کے کوٹھے پر سونے کے حالات رقم کرنے کے بعد دنیا کی اعتباری میں جو اشعار لکھتے ہیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں واقعی یہ اشعار آب زر سے لکھے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں

قضارا وہ دن تھا اسی سال کا — غلط وہم ماضی میں تھا حال کا

سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم — کہ آگے قضا کے ہوا حمق حکیم

پڑے اپنے اپنے یہ سب عیش بیچ — نہ سمجھے زمانے کی کچھ اونچ نیچ

یہ جانا کہ یوں ہی رہے گا یہ دور — نہ معلوم تھے اس زمانے کے طور

کہ اس بیوفا کی نئی ہے ترنگ — یہ گرگٹ بدلتا ہے ہر دم میں رنگ

کرا بادہ عیش در جام ریخت — کہ بر فرق صبحش نہ صد شام بیخت

نداری تعجب ز نیرنگ دہر — کہ آرد ز یک حقہ تریاک و زہر

داستان شاہزادہ کے کوٹھے پر سونے کی اور پری کے اُڑا لے جانے کی

اس داستان میں اسی قدر بیان ہے کہ بے نظیر کوٹھے پر سوتا تھا کہ ایک پری اس کی مفتون ہو کر اُسے پرستان میں اُڑا لے گئی مگر اس داستان میں بھی حضرت مصنف نے شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے پہلے تو "ساقی نامہ" کے اشعار آبدار لکھے ہیں اُن میں سے یہ شعر بہت قابل لحاظ ہے ؎

جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ سن — مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن

بعد ازاں شاہزادہ کے پلنگ کا بیان صفتِ راستی کے باعث نہایت مطبوع معلوم ہوتا ہے ایشیائی سلاطین و امرا کے پلنگ اسی ساز و سامان کے ہوتے ہیں ان اشعار میں سے پلنگ کی چادر کی تعریف کا یہ شعر نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔

کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف — کہ ہو چاندنی جس صفا کی غلاف

خوف طوالت سے راقم اختصار پر اکتفا کرتا ہے ورنہ اور بھی اشعار اس جگہ درج کرنے کے قابل تھے واقعی حضرت مصنف کی شاعری کے کمالات کچھ نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ہر شعر پر ریویو لکھئے بہرحال منجملہ بہت سے کمالات کے حضرت مصنف کے چند کمالات بہت کچھ قابلِ توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ جہاں صنعتِ تشبیہ کو دخل فرماتے ہیں وہاں تشبیہ کا ایسا انداز دیکھا جاتا ہے کہ دل کو تشبیہوں سے نفرت پیدا ہونے کے عوض ان کی طرف رغبت ہوتی ہے تشبیہوں کا استعمال خوش مذاقی کے ساتھ ہر شاعر کا کام نہیں ہے نہایت جائے تعجب ہے کہ میر حسن کثرت سے استعمال تشبیہات فرماتے ہیں اور ان کی سب تشبیہات

خوش آئند معلوم ہوتی ہیں بلکہ اکثر تشبیہات تو ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی جدت خوش مذاقی لطافت اور صفائی کی تاثیر سے روح کو ایک حیرت انگیز تلذذ نصیب ہوتا ہے اُن کی تشبیہات کے اس قدر مطبوع ہونے کا ظاہر اسبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہات میں بھی وہ فطرت کی راہ سے انحراف نہیں فرماتے ہیں یہ ایک خاص بات ہے جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ اُن کے استعارات ان کی تشبیہات کی طرح فطری انداز کے ہوتے ہیں اور کبھی احاطۂ فطرت سے باہر نہیں جاتے سوم یہ کہ اُن کی مبالغہ پردازی جادۂ فطرت سے دور نہیں پڑتی ہے اس لیئے اُن کے مبالغے مبالغہ کی طرح نفرت انگیز نہیں ہوتے چہارم یہ کہ سلسلۂ بیان ایسا فطری ہوتا ہے کہ نفس ذہن کو اُس سے آسائش نصیب ہوتی ہے پنجم یہ کہ کلام میں ہر جگہ تناسب موجود رہتا ہے یہ وہ صفت ہے کہ جس صفت کے بغیر نہ حسن ظاہری اور نہ حسن باطنی کا وجود ممکن ہے ششم یہ کہ ان کا کوئی بیان بغیر کسی مارل یعنی نتیجہ اخلاقی کے نہیں ہوتا چنانچہ اس داستان کا آخر شعر بھی مارل سے خالی نہیں ہے جیسا کہ فرماتے ہیں

کبھی خوش ہے دل اور کبھی دردمند ۔۔۔ زمانے کا جیسے ہے پست و بلند

داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہزادے کے غائب ہونے سے

یہ داستان داخلی اور خارجی دونوں صنف شاعری پر مشتمل معلوم ہوتی ہے حضرت مصنف نے شاہزادے کے غائب ہونے سے جو کیفیت محل والوں کی ہوئی خوب معلوم فرمائی ہے لاریب ان کی خوبی بیان سے تحیر و غم کی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے اس بیان میں غم کرنے والوں کے ظاہری اور باطنی دونوں انداز بڑی تبعیت فطرت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئے ہیں بلاشبہ یہ بیان داخلی اور خارجی دونوں شاعریوں کا ایک عمدہ مجموعہ ہے اشعار

ذیل محل سرا کی حیرت زدہ اور غم زدہ عورتوں ایک پورا فوٹو دکھا رہے ہیں سبحان اللہ، کیا قادر الکلامی ہے! آفریں صد آفریں ؂

کروں حال ہجراں زدوں کا رقم | کہ گزرا جدائی سے کیا ان پہ غم
کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں | تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو | نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ گل کی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار | کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی | کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی | کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو | گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی | رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب | کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دُپٹے کھول سنبل سے بال | طمانچوں سے جوں گل کئے سرخ گال

اس کے بعد جب بادشاہ کو شاہزادہ کے گم ہونے کی خبر پہنچی تو بادشاہ اور بادشاہ بیگم کا کیا حال ہوا اس کی فطری تصویر حضرت مصنف یوں کھینچتے ہیں:-

سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر | گرا خاک پر کہہ کے ہائے پسر
کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی | کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

اس جگہ پہ باپ اور ماں کے غم کا فرق کس خوبصورتی کے ساتھ دکھلایا ہے سبحان اللہ! کیا فطرت نگاری ہے، حضرت مصنف اس کے بعد بادشاہ بیگم کا کوئی ذکر نہیں فرماتے ہیں ظاہر ہے کہ عورت میں اتنی قدرت کہاں کہ ایسی آفت میں کیفیت حالات کہہ سکے۔

بیٹے کے صدمہ سے اُسے عموماً چپ لگ جاتی ہے یہ کام مرد کا ہے چنانچہ بادشاہ نے
دریافت حقیقت کی طرف توجہ کی جیسا کہ اشعار ذیل سے نمایاں ہے الحق یہی چیزیں ہیں کہ
سچے شاعر کے سوا کسی کو نہیں آتیں :-

ہُوا گم وہ یوسف پڑی یہ جو دھوم — کیا خاوہاں محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا — عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر — دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا — کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
مرے نوجواں میں کدھر جاؤں پیر — نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحر غم میں ڈبویا مجھے — غرض جاں سے تو نے کھویا مجھے
کروں اس قیامت کا کیا میں بیاں — ترقی میں ہر دم تھا شور و فغاں

اس کے بعد اس خبر کے شہر میں مشہور ہونے کا بیان ہے۔ پھر جس باغ میں بے نظیر رہا کرتا تھا اس کے بے رونق ہو جانے کی کیفیت نہایت شاعرانہ مذاق کے ساتھ تحریر ہے ہرچند حضرت مصنف نے ویرانی باغ کے مضمون کو شاعرانہ پیرایہ میں طول دیا ہے مگر کہیں پہ فطرت کی باگ ہاتھ سے نہیں چھوڑی ہے تشبیہات استعارات اور مبالغہ پردازیوں میں تمامتر فطرت کا رنگ عیاں ہے، لاریب بے رونقی باغ کا مضمون نہایت فطری انداز رکھتا ہے حالت غم میں مکان و باغ کی صورت ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے منضبط تحریر فرمایا ہے مولانا حالی سلمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

اُن کے جانے سے ہوئی اور ہی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

حضرت ازل اعلی اللہ مقامہ فی الجنہ کا یہ مطلع بھی مطلع بالا کا فطری رنگ رکھتا ہے۔

بغیر یار ہر اک گل ہے خار آنکھوں میں — کھٹک رہی ہے چمن کی بہار آنکھوں میں

اس داستان کے آخر میں وزرا کا بادشاہ کو سمجھانا مذکور ہے اس فہمائش میں حضرت مصنف نے حسب معمول کچھ مارل اشعار حوالہ قلم فرمائے ہیں اور یہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ دکھا دیا ہے کہ کسی حال میں دنیا کے کام بند نہیں ہوتے ہزار آفت کیوں نہ آئے دنیا جس طور پر چلا کی ہے چلا کرے گی **مولفہ**

خدا کی خدائی ہمیشہ رہے گی — جو ہوتا رہا ہے وہ ہوتا رہے گا

ذیل میں حضرت مصنف کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ — کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
کہا گو جدائی گوارا نہیں — ولیکن خدائی سے چارا نہیں
نہیں خوب اتنا تمھیں اضطراب — نصیبوں سے شاید ملے وہ خشتاب
خدا جانے اب اس میں کیا بھید ہے — یہ کہتے ہیں جیتوں کو امید ہے
خدا کی خدائی تو معمور ہے — غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے
نہیں ایک صورت پہ کوئی مدام — اُسی کی غرض ذات کو ہے قیام
بہ کہ اور شہ کو بٹھا تخت پر — بہر نوع رہنے لگے یک دگر
لٹا یا بہت باپ نے مال و زر — ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر

داستان پرستان میں لے جانے کی

واضح ہو کہ میر حسن اب ایک ایسا قصہ لکھتے ہیں جو ہمارے علم محسوسات سے باہر ہے یعنی اس داستان میں حضرت مصنف پری اور پرستان کا ذکر فرماتے ہیں یہ ظاہر ہے

کہ واقعات کے رو سے کوئی معاملہ کسی بنی آدم کو پیش نہیں آیا ہے تاریخ و سیر آثار و اخبار وغیرہ میں کہیں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ کسی نے کبھی پری دیکھی ہو یا کوئی پری کبھی آدمی کو پرستان میں اڑا لے گئی ہو۔ اس طور کے غیر معمولی بیانات صرف فسانہ اور شاعری کی تصانیف میں دیکھے جاتے ہیں لیکن ایسے بیانات کو غایت شائستگی کی بنیاد پر مذموم نہیں سمجھنا چاہیئے یہ بیانات اس غرض سے حوالہ قلم نہیں کیئے جاتے ہیں کہ لوگ انھیں قرین واقعات سمجھیں اُن سے مجرد فسانہ گوئی اور شاعری کی غرضیں متعلق رہتی ہیں ہر خواندہ آدمی جانتا ہے کہ ایسے بیانات فسانہ نگاروں اور شعرا کی قوت تخئیل کے نتائج ہوتے ہیں، کون آدمی ہے جو شکسپیر کے اس پلے کو پڑھ کر جس کا نام مڈسمر نائٹس ڈریم (MIDE SUMMER-NIGHT'S DREAM) ہے یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس میں پریوں کا جو ذکر ہے وہ مجرد اس شاعر عدیم المثال کی قوت تخئیل کا نتیجہ نہیں ہے یا ہملٹ (HAMLET) میں جو بھوت کا ذکر مذکور ہے وہ شاعرانہ بیان نہیں ہے یا ایلیڈ انیڈ وغیرہ میں جو کثرت کے ساتھ دیوتاؤں کی کاروائیاں اور دیگر عجائبات مندرج ہیں وہ سب کے سب ایسے ایجادات شاعرانہ نہیں ہیں کہ جن کو اس وقت میں کوئی شخص امور واقعی مانتا ہے اسی طرح "الف لیلہ" میں جو پریوں کی حکایات ہیں وہ تخئیلی بیانات نہیں ہیں۔ یا مور (MOORE) شاعر انگریزی نے جو ایک پری کا فسانہ منظوم کیا ہے وہ فسانہ نہیں ہے پس مجرد اس بنیاد پر کہ ایسے قصے قرین واقعات نہیں ہیں اہل مذاق ان سے نفرت نہیں کر سکتے، ایسے قصے قابل گرفت تب ہی سمجھے جاتے ہیں جب ان کے بیانات میں تناسب کی خوبی ندارد ہوتی ہے یہ وہ خوبی ہے کہ جس کی عدم موجودگی سے ہر کلام ذلیل اور بے لطف معلوم ہوتا ہے پری دیو جنات بھوت وغیرہ کے وہی قصے قابل تنفر

ہیں جن کے بیانات میں تناسب نہیں پایا جاتا ہے، شکسپیئر، ہومر، درجل، مور، فردوسی بالمکی، کالیداس صاحب "الف لیلہ" ایسے مصنفین ہیں کہ پہلے بھی اُن کی توقیر ہوا کی ہے، اور آئندہ بھی ہوا کرے گی۔ یہ محض تنگ چشمی کی بات ہے کہ کوئی شخص شکسپیئر یا ہومر یا صاحب "الف لیلہ" کو نیچی نظر سے دیکھے، حال کی شائستگی نہ اس کی اس کی مقتضی ہے نہ آئندہ کی شائستگی اس کی مقتضی ہوگی۔ ایسی تنگ چشمی کا عارضہ صرف انھیں حضرات کو لاحق دیکھا جاتا ہے جن کی وسعت نظر بہت کم ہے اور اس کمی وسعت نظر کے ساتھ اپنے کو بلند نگاہ بالا بیں اور حقیقت آگاہ سمجھتے ہیں نعوذ باللہ، اس زمانہ میں شائستگی کا مرض ایسا پھیلا کہ خدایا تیری پناہ ایسے حضرات جہاں کچھ ادھوری یورپین وضع کے پابند ہو گئے اپنے کو شائستہ سمجھنے لگے اگر ظاہری وضع نہ بھی بدلی تو اپنے نکمے خیالات کو عین حکما و علمائے یورپ کے خیالات جاننے لگے یہ مرض طاعون چیچک ہیضہ سیاہ بخار وغیرہ سے زیادہ مضر قوم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ایسے لوگ زبان و علوم یورپ سے بے بہرہ رہ کر فضل و کمالات یورپ کی راہ کے خضر اپنے کو بتاتے ہیں۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیہدیہم طریق الہالکین

المختصر ایسے قصے جن میں دیو پری وغیرہ کے بیانات مندرج پائے جاتے ہیں۔ تب ہی مذموم سمجھے جا سکتے ہیں جب ان میں تناسب کی خوبی نہیں پائی جاتی ہے، اب حضرات ناظرین میر حسن کے حُسن بیاں کی طرف توجہ فرمائیں اس شاعر لاجواب کا انداز سخن زینہار ایسا نہیں ہے کہ اس سے چشم پوشی کی جائے۔ سبحان اللہ تناسب کلام ایسا ہے کہ اہل مذاق سے طلب داد میں کبھی ناکام نہیں رہا۔ حضرت مصنف اس داستان میں اشعار ساقی نامہ کے بعد پہلے بے نظیر کو پرستان میں اُڑا لے جانے کے مضمون کو یوں رقم فرماتے ہیں۔

اُڑی جو پری واں سے لے کر اُسے — اُتارا پرستاں کے اندر اُسے

اس کے بعد پرستان کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پرستان کو نہ میر حسن نے دیکھا تھا اور نہ آج تک کسی بنی آدم نے دیکھا ہے اس سے پرستان کا بیان سوا خیالی ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے مگر حضرت مصنف کا یہ بیان بھی قابلیت شاعرانہ سے خالی نہیں ہے ہر شعر اچھی فکر پر دال ہے اور حسب مراد قوت تخیل سے خبر دیتا ہے کچھ شعر ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں۔

وہاں ایک تھا سیر کا اُس کے باغ — کہ جس کے گلوں سے ہو تازہ دماغ
ریاحین و گل اس میں انواع کے — طلسمات کل اس میں انواع کے
طلسمات کے سائے سے دیوار و در — نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے در
نہ آتش کا خطرہ نہ بارش کا ڈر — نہ سردی نہ گرمی کا اس میں خطر
کسی کو ہو جس چیز کا اشتیاق — نظر آئے وہ چیز بالائے طاق
جواہر کے ذی روح وحش و طیور — خراماں پھریں صحن میں دور دور
پھریں دن کو سائے وہ حیوان ہو — کریں رات کو کام انسان ہو

اس خیالی بیان باغ کے بعد بےنظیر کے پلنگ کا اُس باغ کے بنگلہ میں لایا جانا مذکور ہے وہ تو عالم خواب میں تھا جب بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے اور کیا اُس پر گزرتی ہے اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا ؎

قضارا کھلی آنکھ اُس گل کی جو — نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو
نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا — تعجب سے اک ایک کو تک رہا
اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں — لگا کہنے یارب میں آیا کہاں
زبس تھا نہ لڑکا تو سہما بھی کچھ — ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

اس نظرتی بیان کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں

سرہانے جو دیکھی مہ چار دہ — کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشکِ ماہ
کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر — لے آیا مجھے کون گھر سے ادھر
پھر اس منہ کو لے اور ادھر سے نقاب — دیا اس پری نے یہ ہنس کر جواب
خدا جانے تو کون ہیں کون ہوں — مجھے بھی تعجب ہے، میں کیا کہوں
پر اب تو تو مہمان ہے میرے گھر — لے آئے ہیں تجھ کو قضا و قدر
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں — پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اس کے بعد اخفا کو بے ضرورت سمجھ کر پری بے نظیر کو حقیقت حال سے یوں آگاہ کر دیتی ہے

تیرے عشق نے مجھ کو شیدا کیا — ترا غم مرے دل میں پیدا کیا
چھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار — یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار
پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے — یہاں سب یہ قومِ بنی جان ہے

اس کے بعد حضرت مصنف صحبت نا جنس کی کیفیت یوں رقم فرماتے ہیں ۔

کہاں صورت جن کہاں شکل انس — غرض قہر ہے صحبت غیر جنس
پری کو ہوئی شادی ہم مہ کو غم — یہ ناچار کیا کر سکے وہ صنم
کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار — کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار
غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں — کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں
ولیکن نہ عقل رہ نہ ہوش و حواس — رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس
کبھی اشک آنکھوں میں بھر لائے وہ — کبھی سانس لے کر کہے ہائے وہ
وہ محلوں کی چہلیں وہ گھر کا سماں — رہے رو برو دھیان میں ہر زماں

وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے — تو دالوں کو رو رو کے دریا بہائے
کبھی اپنی تنہائی کا غم کرے — کبھی اپنے اوپر دعا دم کرے
کرے یاد جب اپنے ناز و نعم — فغاں زیر لب وہ کرے دمبدم
بہانے سے دن رات سویا کرے — نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے
غرض اضطراب اس کو ہر حال میں — کہ جوں مرغ تڑپے نیا جال میں

اشعار بالا کی فطری خوبیاں محتاج بیان نہیں ہیں۔ واقعی حضرت مصنف نے اس جگہ شاعری کی اچھی داد دی ہے۔ اے حضرات ناظرین اس جگہ پر کیا موقوف ہے انصاف یہی ہے کہ ہر جگہ پر جہاں جس صنف شاعری کا موقع آیا ہے وہاں اپنے کمال شاعری کا جلوہ دکھلا جاتے ہیں۔ داخلی اور بھی خارجی شاعری پر اس قسم کی قدرت صرف چند شاعران دنیا کے سوا کسی میں نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اتنے بیانات کے بعد اس پری کی زندگانی کا طور یوں حوالہ قلم پایا جاتا ہے کہ ماہ رخ نے بے نظیر سے پوشیدہ طور پر تعلق پیدا کیا تھا اس لیئے باپ کے پاس بھی حاضری دیے آیا کرتی تھی تا افشائے راز نہ ہو جائے اس حاضری سے جو وقت بچتا تھا اسے بے نظیر کی صحبت میں بسر کرتی تھی مگر بے نظیر روز بروز یاد وطن سے کاہیدہ ہوتا جاتا۔ ماہ رخ ہر طرح کی خاطر داری کرتی تھی اور اسباب آسائش کی فراہمی میں خس بھر کمی نہیں کرتی تھی لیکن ان سب کوششوں سے کوئی حسب مراد نتیجہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پری پریوں میں نہایت ہوشیار، شعور مند اور فہیم تھی۔ بے نظیر کو اس طور مبتلائے رنج والم دیکھ کر سوچی کہ اس کی دل بستگی کا سامان کیجئے، یہ سوچ کر کہ اہل غم کو سیر و ہوا خوری سے فائدہ عظیم مترتب ہوتا ہے ایک دن شاہزادہ سے یوں کہنے لگی

کہا ایک دن اس نے سن بے نظیر | مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
تو اک کام کر اک پہر بھر کہیں | کیا کر ٹک اک سیر روئے زمیں
تو دق رک کے دل کو نہ کر اپنے بند | نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
سر شام جاتی ہوں میں باپ پاس | اکیلا تو رہتا ہے اس جا اداس
یہ گھوڑا ابھی دیتی ہوں کل کا تجھے | ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں | دیا دل کسی سے لگا دے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہگار کا | وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول | مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول
کہا ماہ رخ نے کہ تیرے بخت | کہ بخشا تجھے میں سلیماں کا تخت
جو اترے تو کل اس کی یوں جوڑیو | جو برعکس جائے تو وہ کل موڑیو
زمیں سے لگا اور تا آسماں | جہاں چاہیو جائیو تو وہاں

اشعار بالا کہانی کی مزہ داری کے ساتھ کیسی فطرتی خوبیوں سے معمور نظر آتے ہیں۔ ماہ رخ شاہزادہ کو اوّل مضمون اسیری یاد دلاتی ہے تا وہ خود اختیار ہو کر اس سے آزادی کی نہ لے۔ بعد ازاں اسے ایک پہر کی سیر کی اجازت دیتی ہے اور یہ اس لئے کہ معشوق کی صحبت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور پھر سیر کا وقت بتاتی ہے کہ جب وہ مجبوراً باپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی ہے پھر گھوڑا دے کر اس سے مچلکا لیتی ہے پھر شاہزادہ اتنی فرصت کو بھی غنیمت سمجھ کر ماہ رخ کی تشفی کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ماہ رخ شاہزادہ پر احسان جتاتی ہے اور احسان جتانے کے بعد گھوڑے سے کام لینے کی ترکیب بتاتی ہے۔ سبحان اللہ کیا انداز بیان ہے۔ لاریب حضرت مصنف اردو کے شکسپیر ہیں اس جگہ

ایک امر کل کے گھوڑے کی نسبت عرض کر دینے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سابق پرستان کے بیان میں یہ مذکور آچکا ہے کہ وہاں طلسماتی چیزیں بہت تھیں پس طلسمی گھوڑے کا بھی ایسی جگہ میں موجود ہونا خلاف توقع نہیں ہے، حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ کوئی بات بے وجہ حوالۂ قلم نہیں فرماتے ہیں، اکثر مثنوی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات کسی جگہ پہلے فرما جاتے ہیں تو دس بیس سو پچاس شعر کے بعد اس بات کو کہنے کی وجہ ہویدا ہوتی ہے یہی کیفیت شکسپیئر اور صاحب "الف لیلہ" کی ہے کہ دور جاکر پہلے کی کہی ہوئی باتوں کا سبب کھلتا ہے "کل کے گھوڑے" کا مضمون کتاب "الف لیلہ" میں بھی دیکھا جاتا ہے، یہ عجب نہیں ہے کہ میر حسن نے اس خیال کو اس کتاب سے حاصل کیا ہو، مگر پرستان میں کل کے گھوڑے کا موجود ہونا زیادہ قرین بیانی نظر آتا ہے گو جس طور پر "الف لیلہ" میں کل کے گھوڑے کا بیان ہے بجائے خود عجب فطرتی خوشنمائی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوا ہے۔

داستان گھوڑے کی تعریف میں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت حیرت انگیز نظر آتی ہے اطلاع عام سے مراد راقم یہ ہے کہ اپنے ملک کے ہر قسم کے امور سے انھیں واقفیت تھی یہی کیفیت حضرت سودا کی بھی معلوم ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ بے اس طرح کی اطلاع عام کے کوئی شاعر نہ میر حسن کی سی مثنوی لکھ سکتا ہے اور نہ سودا کی طرح اصناف شاعری پر قادر ہو سکتا ہے شکسپیئر کی بھی یہی رنگ کی اطلاع دکھائی دیتی ہے میر حسن اور سودا کی اطلاع عام سے شکسپیئر کی اطلاع عام کا فرق یہ ہے کہ یہ دونوں

ہندوستانی شاعر صرف ہندوستان کے معاملات اخلاق و تمدن و معاشرت وغیرہ سے خبر رکھتے تھے اور شکسپیئر کو اس طرح کی اطلاع تمام معاملات یورپ سے حاصل تھی یہاں پر میر حسن گھوڑے کی تعریف میں ایسی باتیں رقم کرتے ہیں جو اہل ہند کے مذاق کے تمامتر موافق معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت مصنف کے اس جگہ کے اشعار جلد اوّل میں درج ہو چکے ہیں اس لئے یہاں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بہر کیف اس کل کے گھوڑے پر بے نظیر روز سیر کو نکلتا تھا جیسا کہ فرماتے ہیں :-

یہ گھوڑا جو اس کل کی تھا بخش کا — فلک سیر تھا نام اس رخش کا
سر شام وہ بے نظیر جہاں — اسی رخش پر ہو کے جلوہ کناں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ — وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
پھر جب کہ بجتا تو پھر شتاب — کہ پھر قہر تھا باہر ج کا عتاب

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے باغ میں بدر منیر کے

یہ داستان "الف لیلہ" کے اس قصہ سے مشابہت رکھتی ہے جس میں فارس کے بادشاہزادہ کے کل کے گھوڑے کا بیان دیکھا جاتا ہے اس قصہ میں فارس کے بادشاہزادہ بنگالہ کی بادشاہزادی کے پاس اسی کل کے گھوڑے کے ذریعہ سے پہنچا تھا جس طرح کہ بے نظیر کا بدر منیر کے باغ میں پہنچنا اس داستان میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ الف لیلہ کے قصہ میں شاہزادہ فارس اتفاقاً بنگال کی شاہزادی کے محل کی چھت پر جا اترا تھا۔ یہاں یہ کیفیت گذری کہ ہنگام سیر بے نظیر کو اتفاقاً ایک باغ نظر پڑا جس میں ایک عمارت بلند

اُس نے دیکھی اور بالقصد اُس کے کوٹھے پر اس نے اپنے گھوڑے کو اُتارا اس کے بعد بے نظیر کا بدر منیر سے ملنا بھی "الف لیلہ" کے قصہ سے مشابہت رکھتا ہے مگر دونوں کا فرق جو ہے وہ اخلاقی پہلو کے اعتبار سے بہت قابل لحاظ ہے الف لیلہ کا قصہ بڑی عمدگی اخلاقی سے خبر دیتا ہے برعکس اس کے اس مثنوی کی کہانی جو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات پر مشتمل ہے اخلاقی تنزل سے خبر دیتی ہے وہاں بنگال کی شاہزادی ایک شریف وضع مہمان نواز، خوش خلق، پاک خیال، پاک کردار ناکتخدا عورت کے پیرایہ میں دکھلائی گئی ہے برعکس اس کے یہاں بدر منیر کا ایسا فوٹو کھینچا گیا ہے کہ شرفا کی ناکتخدا لڑکیاں یا شرفا کی عورتیں خدا نخواستہ اس طرح کی ہو ہی نہیں سکتی ہیں ظاہرا یہ بڑے تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ میر حسن ایک ایسے عمدہ شاعر نے اپنی کہانی کی ہیروئن (HEROINE) کے بیان کو ایسی بد ترکیبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت مصنف نے اپنے اس طرح کے بیان کی رُو سے اُس اخلاقی تنزل کی تصویر کھینچی ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کی عیاشیوں کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے شاہی اخلاق کے تنزل کی مثالیں انگلستان کے بادشاہ جارج سوم و جارج چہارم کے زمانے میں بھی ہیں ان بادشاہوں کے زمانوں میں کیا کیا اخلاقی بے عنوانیاں ظہور میں نہیں آئی تھیں اور اب وہی دربار ہے کہ حضرت ملکہ معظمہ آنجہانی کی بدولت کس قدر دار التہذیب ہو رہا ہے المختصر میر حسن کے ایسے بیانات بے بنیاد نہیں ہیں جس طبقہ کے متعلق حضرت مصنف کا بیان ہے اس طبقہ کے اخلاقی معاملات اسی انداز کے ہوئے تھے لاریب ہندوستان کا ایک ناواقف ونیچر آدمی ایسے بیانات عیش و تعیش کو جو چند آئندہ کی داستانوں میں مندرج ہیں پڑھ کر منغص ہو

سکتا ہے اور واقعی بات بھی منغص ہونے کی ہے مگر جاننا چاہیئے کہ یہ بیانات ایک عہد کی اخلاقی حالتوں کو دکھاتے ہیں اور اس روسے ناقابل توجہ نہیں ہیں :

واضح ہو کہ ہر چند ان چند داستان کے بہت ہی جوانانہ پیرایہ ہیں، مگر جوانان صالح اُن سے فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں اس لیئے کہ حضرت مصنف بڑے نیچرل شاعر تھے اور اپنے بیانات کو مارل نتیجہ اخلاقی کے قرین کرنا خوب جانتے تھے اس داستان میں آپ باغ و محل کا بیان حوالۂ قلم کر کے بے نظیر کی نسبت ایک مضمون لکھتے ہیں جو تمدنی پہلو کے مد سے اس وقت کے ہونہار نوجوانوں کو بہت مفید نظر آتا ہے آپ فرماتے ہیں :-

ملی جنس کی اپنی جو اُس کو بو لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

اے حضرات نور دیدگان جوانی اگر آپ صاحبوں کی نظر سے اس مثنوی کا یہ جزو گزرے تو لبغور اس شعر کو ملاحظہ فرمایئے گا یہ عجب شعر ہے اس سے ایک بڑی تعلیم منتج ہوتی ہے آپ ملاحظہ فرمائیں کہ میر حسن پہلے بے نظیر کا پرستان میں گرفتار رہنا بیان کرتے ہیں پھر پرستان میں غیر جنسیت کے باعث بے نظیر کا دل برخاستہ رہنا تحریر کرتے ہیں پھر بے نظیر کا ایک ایسے باغ میں پہنچنا جو مسکن بنی آدم تھا۔ رقم کرتے ہیں جہاں پہنچ کر جو اُسے ہم جنسوں کی بو ملی اُسے ذکر کرتے ہیں یہ ذکر تمدنی جہت سے بہت قابل لحاظ ہے حضرت مصنف کے آئندہ کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ اس جنسیت کی بنیاد پر بے نظیر نے ایک ناجنس کے مقابلہ میں اپنی جنس اور اپنے رتبہ کی ایک معشوقہ کے ساتھ وصل و پیوند کرنا پسند کیا یعنی ہر چند ماہ رُخ جو اس کی عاشقہ تھی گو کسی طرح کی حسین ہوش مند فہیم اور سلیقہ مند تھی مگر اس نے اس سے دل نہ لگایا، جب اُس نے موقع پایا

اپنی ہی جنس سے اعلا۔ افسوس ہے اُن ہندی نوجوانوں پر جو غیر قوم کی عورتوں سے وصل و پیوند کرتے ہیں اور آخر کار اپنے کیئے کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہندی نوجوان تعلیم کی نظر سے بہ کثرت انگلستان جاتے ہیں وہ ملک ہندیوں کے لئے پرستان کا حکم رکھتا ہے پس وہاں ہزاروں ماہ رخوں سے اُن کو سامنا پڑتا ہے، تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بے نظیر کی روش اختیار کرتے ہیں ان کی بقیہ زندگی عافیت سے کٹ جاتی ہے لاریب غیر جنس کے ساتھ مواصلت کبھی صورت عافیت نہیں ہوتی ایسی مواصلت میں سوا نقصان کے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے بربنیاد تجربہ نہ فائدہ مواصلت کرنے والے کو ہوتا ہے اور نہ اس کے خاندان کو اور نہ اس کی قوم کو ایسی مواصلت کے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ مواصلت کرنے والے کو ایک ناجنس ساتھی کی بدولت تمام عزیز و اقربا سے علیحدہ رہنا پڑتا ہے یعنی اکثر وہ باپ ماں بہن بھائی سب سے چھوٹ جاتا ہے اور اس کی بقیہ زندگی خارج از خاندان کے طور پر بسر ہوتی ہے اس طرح کی مواصلت خرچ کثیر کا سبب بھی ہوا کرتی ہے جو بہت سی حالتوں میں مالی مصالح کے خلاف متصور ہے ذاتی نقصانات کے علاوہ خاندانی نقصانات بھی ایسی مواصلت میں بہت ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے خرابی نسل واقع ہوتی ہے مجنسوں کا پیدا ہونا کبھی خاندان کو مفید نہیں ہوسکتا یہ مجنس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وصل و پیوند اُن کے باپ اور ماں دونوں کی قوم سے دشوار ہوتا ہے ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ اہل ہند فاتح قوم سے مواصلت پیدا کریں اور اُن کی مجنس اولاد اپنی قوم یا فاتح سے بلاتکلف رشتہ و پیوند کر سکیں، خاندانی نقصانات کے علاوہ قومی نقصانات بھی کثیر ہیں سردست نقصان بیّن تو یہی ہے کہ جب ایک قابل آدمی غیر جنس عورت سے بیاہ کرتا ہے تو اُس کی

قوم اس کی ذات سے میل و پیوند کے اعتبار سے محروم رہ جاتی ہے یعنی اگر ایسا شخص اپنی قوم میں بیاہ کرتا تو اس کی قوم کی ایک لڑکی اس کی مواصلت سے ایک قابل شوہر پاتی برخلاف اس کے اس کے اچھے ہونے کا نفع ایک غیر جنس عورت اٹھاتی ہے علاوہ اس کے بسا اوقات ایسی مواصلت کے کرنے والے اطوار و عادات کے اعتبار سے اپنی قوم کے نفع و ضرر سے اس قدر علیحدہ ہو بیٹھتے ہیں کہ ان کا شمار قوم میں فضول ہی فضول ہوتا ہے میں نہایت ہی خواہی سے اپنے ملک کے نوجوان حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تعلیم ولایت کے بعد وہ جسٹس محمود صاحب کی روش اختیار فرمائیں محمود صاحب کو سب سے زیادہ موقع انگلستان میں مواصلت پیدا کر لینے کا تھا اور ہند میں بھی ان کو اس قسم کی مواصلت کا موقع حاصل تھا۔ جوانی خوبرُوئی تعلیم یافتگی بلند پایگی نجابت شرافت عالی خاندانی سب ہی باتیں حسب مراد تھیں مگر مجنسوں کے پیدا کرنے کی طرف مطلق مائل نہ ہوئے المختصر حضرت مصنف نے مضمون جنسیت کو پیش نظر رکھ کر ایک عمدہ ہدایت نامہ اس عہد کے نوجوانوں کے لیے چھوڑا ہے۔ فقیر کی دانست میں یہ جنسیت کا مضمون ایسا قابل توقیر ہے کہ ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ لڑکے کو ولایت بھیجنے کے پہلے میر حسن کی مثنوی خوب پڑھا دے واقعی یہ تصنیف ایک حکیمانہ رنگ رکھتی ہے جناب والد ماجد مرحوم نے راقم کو سترہ برس کی عمر میں درس کتاب کے طور پر اس مثنوی کو پڑھایا تھا بعنوان شباب کل الطباع بہت قوی ہوتا ہے اس کتاب سے راقم نے آئندہ دن بہت فائدے اٹھائے۔ فقیر نے بھی اپنے لڑکوں کو اس کتاب کے بہت اجزا پڑھ کر سنائے ہیں اور الحمد للہ کہ وہ سب انگلستان سے بامراد واپس آکر اور داخل خاندان رہ کر عافیت تمام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اِس داستان میں حضرت مصنف بدرِ منیر کے باغ و محل کا بیان اُسی فطرتی رنگ سے جواُن کی شاعری کا طور ہے زیبِ قلم فرماتے ہیں یہاں ان کی تحریر کا اعادہ خوفِ طوالت سے ترک کیا جاتا ہے مگر آخر کے کچھ اشعار جو تصوف کا رنگ رکھتے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

نظر جس طرف جائے نزدیک و دور — اُسی ایک مہ کا ہے ہر جا ظہور
نکل اپنی وحدت سے کثرت میں آ — وہی نور ہے جلوہ گر جا بجا
حقیقت کو لیکن بصارت بھی ہو — کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

داستان تعریف بدرِ منیر اور عاشق ہونا بے نظیر کا

اس داستان میں حضرت مصنف پہلے بدرِ منیر کے حسن و جمال سج دھج لباس پوشاک زیور آراستگی وغیرہ کو نہایت فطری اور خوش اسلوب رنگ سے بیان کرتے ہیں بعد ازاں بدرِ منیر کا سراپا رقم کرتے ہیں یہ سراپا فحش وغیرہ سے تمامتر پاک ہے لاریب یہ سب مضامین اعلیٰ درجہ کی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں اور حضرت مصنف کی اطلاع عام کے مثبت ہیں۔ سراپا نگاری کے بعد کے مضامین یہ ہیں کہ بے نظیر بدرِ منیر کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اسی حال میں اُسے کسی نے دیکھ لیا اور اُسے درختوں میں چھپا ہوا پاکر محل کی خواصیں وغیرہ کمال حیرت کے ساتھ آپس میں یہ گفت گو کرتے ہیں :-

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا — کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
لگی کہنے ما مغا کوئی اپنا کوٹ — ستارہ پڑا ہے فلک سے ٹوٹ

ہوئی صبح شب کا گیا اُٹھ حجاب | درختوں میں نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا دیکھو اے بوا | کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا
کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے | کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے

اس کے بعد بدر منیر کو اس واقعہ عجیب سے خبر ہوئی وہ خود بے نظیر کو دیکھنے گئی دیکھتے ہی مبتلائے عشق ہوگئی۔ واضح ہو کہ انسان کو عشق دو طور ہوتا ہے ایک تو معشوق سے رفتہ رفتہ اور دوسرا معشوق کو دیکھ کر فی الفور اسے انگریزی میں فرسٹ سائٹ لو کہتے ہیں دونوں طور کے عشق بشرطیکہ ان میں نفسانیت کو دخل نہ ہو حکم عشق رکھتے ہیں بہر حال جب بے نظیر اور بدر منیر نے ایک دوسرے کو دیکھا غایت فریفتگی سے انھوں نے عشق کیا مگر وہاں نجم النساء دخت وزیر نے جو بدر منیر کی ایک ہم عمر رفیقہ تھی ان دونوں پر گلاب چھڑکا جس سے انھیں ہوش آگیا۔ افاقہ کے بعد بے نظیر تو فرط حیرت سے وہاں ہی رہ گیا مگر بدر منیر شرم کھا کر اپنے محل کی طرف چلی گئی۔

واضح ہو کہ اس ملک میں رواج ملکی کے باعث کسی شریف مرد کو کسی شریف عورت کے دیکھنے کا اس طرح پر موقع نہیں مل سکتا ہے لیکن اہل یورپ کو ہمیشہ عورتوں سے ملنے کا موقع حاصل رہتا ہے وہ بغیر دیکھے کسی عورت سے دل دپیوند نہیں کرتے اس میں ظاہری مصلحتیں ہیں مگر تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دل و پیوند کے مبارک اور نامبارک ہونے میں دیکھ بھال کو دخل نہیں ہے خیر اس داستان کا جو سین ہے وہ اس ملک کی معاشرت شرفا کے مطابق نہیں ہے لیکن حضرت مصنف کے یہ سارے بیانات تناسب سے خالی نہیں ہیں اس لئے کہ جو سختی پردہ کی یہاں کے شرفاء کے درمیان ہے وہ دیگر بلاد اسلام میں پائی نہیں جاتی ہے علاوہ اس کے جس طبقہ کے افراد کا

ذکر اس داستان میں ہے نہ ان کے یہاں ایسا سخت پردہ ہے اور نہ ایسے پردہ کا التزام مناسب حال ہے اگر اس طرح کا سخت پردہ شاہان اسلام میں مروج ہوتا تو نور الدین جہانگیر بادشاہ دہلی کو نورجہاں کے دیکھ لینے کا کب موقع ملتا۔ یہ بیگم کتخدائی کے پہلے جلال الدین اکبر شاہ کے محل میں اپنی ماں کے ساتھ آیا جایا کرتی تھی ایام شاہزادگی میں جہانگیر کو اکثر اس کے دیکھنے کا موقع ملا کیا تھا اس واسطے وہ اس پر فریفتہ ہو رہا تھا اگر یہ موقع حاصل نہ رہتا تو نہ جہانگیر کو فریفتگی لاحق ہوتی اور نہ شیر افگن کی جان جاتی المختصر جس طبقہ کا ذکر حقیقت مصنف اس داستان میں کر رہے ہیں اس سے ملک کے عامہ شرفا کو ذاتی اطلاع نہیں ہے پس حضرت مصنف کے ان بیانات کو غیر فطری یا بعید از قیاس یا خلاف رسم ملک نہیں سمجھنا چاہیئے امر واقعی یہی ہے کہ حضرت مصنف نے کہیں بھی سلسلہ تناسب کلام کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے اور حق یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے واقعہ نگار شاعر ہیں اور ان کی واقعہ نگاری حضرات اہل مذاق کی توجہ فرمائی کی تمامتر مستحق ہے۔

داستان زلف اور چوٹی کی تعریف میں

حضرت مصنف زلف کی تعریف اس طرح پر حوالۂ قلم کرتے ہیں کہ جس کی تعریف میں خامہ سو سو پیچ و تاب کھاتا ہے سبحان اللہ تشبیہات میں کیا کیا جدتیں نمایاں ہیں لیکن ایک شعر ایسا ہے جو فردوسی کے اس شعر کا "چو بربست آں طرۂ مشکناب ۔ گرہ داد شب را ابر آفتاب ۔" قریب قریب ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور وہ شعر یہ ہے

موباف زری نے کیا ہے غضب ۔ دیا ہے گرہ دن کو دنبال شب

غرض زلف اور چوٹی کی تعریف کے بعد کہانی کا عنوان یہ ہے۔

غرض وہ مڑی جب دکھا اپنے بال ۔۔۔ تو گویا کہ مارا محبت کا جال
ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی ۔۔۔ چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پہ ظاہر دلے دل میں چاہ ۔۔۔ نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں ۔۔۔ میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں ۔۔۔ چھپی جا کے اپنے وہ دلان میں
دیا ہاتھ سے چھوڑ پردہ شتاب ۔۔۔ چھپا ابر تاریک میں آفتاب

ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اس ملک کی شریف عورتوں کی نہیں ہوتی، مگر ایک ایسی جوان عورت کی نسبت جو پوری آزادی اور مطلق العنانی کے ساتھ باپ اور ماں سے علیحدہ اور ایک پرتکلف باغ کے پرتکلف مکان میں ہم عمر رفقا اور خواصوں کے ساتھ قیام پذیر ہو کوئی ایسا بیان جیسا کہ اس داستان میں دیکھا جاتا ہے کبھی بے محل یا بے موقع نہیں قرار دیا جا سکتا ہے اس بیان میں حسن برابر بھی تناسب کلام میں نقصان لاحق نہیں ہے غرض جب بدر منیر اس طرح بے نظیر کو چھوڑ کر اپنے مکان میں جا چھپی تب نجم النساء اسکے پاس پہنچ کر یوں کہنے لگی۔

مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں ۔۔۔ ترے ناز بے جا تو بھاتے نہیں
مری سمت ٹک دیکھ تو ہائے ہائے ۔۔۔ مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے ۔۔۔ تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو ۔۔۔ مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو
مئے عیش کا جام اب نوش کر ۔۔۔ غم دین و دنیا فراموش کر
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش ۔۔۔ غفور است ایزد تو ساغر بنوش
کہاں یہ جوانی کہاں یہ بہار ۔۔۔ یہ جوبن کا عالم رہے یادگار

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار دلے حاصل عمر ہے وصل یار
خوشا وہ زمانہ کہ دو اک جگہ کریں یک دگر جلوۂ مہر و مہ

ظاہر ہے کہ ایسی فہمائش سوا ایک نوجوان ہم عمر رفیق کے کون کر سکتا ہے مگر اس سلسلۂ تقریر کے چند اشعار تو ایسے ہیں کہ ایک سن رسیدہ فلسفی بھی اُن کی خوبی سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ہے خیر اس تقریر کو سن کر بدر منیر نے جو کہا اور جو اس کا جواب نجم النساء نے دیا اس کا بیان کس قدر فطرتی رنگ رکھتا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں۔

یہ سن سن کے وہ نازنیں مسکرا لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے اُدھر بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش ہوئی تھی اُسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پہ گلاب بھلا میری خاطر بلا لو شتاب

اِس آپس کی رمزوں کی باتوں کے بعد نجم النساء بے نظیر کو بلا لائی پھر بدر منیر کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بے نظیر کے پاس بٹھلایا اِس جگہ پر حضرت مصنف نے ایک ہم عمر اور شفیق رفیق کی کارروائی کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے واقعی فطرت نگاری حضرت مصنف پر ختم ہے یہی شاعری فطرت کی بخشش کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور فطرت کی بخشش کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔

داستان ملاقات کرنا بدر منیر کا بے نظیر سے

جب نجم النساء نے بدر منیر کو بے نظیر کے پاس بٹھلایا تو بدر منیر کے اُس وقت کے انداز نشست کو حضرت مصنف یوں زیب رقم فرماتے ہیں:-

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ آفتاب — رہے شرم سے پا بہ بند حجاب

ظاہر ہے کہ یہ حجاب ایک فطری امر تھا اس کے دفع کرنے کے واسطے نجم النساء نے شیشہ و ساغر سامنے لاکر رکھا اور قسمیں دے کر بدر منیر سے کہا کہ بے نظیر کو مے پلا۔ جب بادہ نوشی کا شغل جاری ہوا تو سارا حجاب جاتا رہا، بے نظیر، بدر منیر با یک دگر تفتیش حال کرنے لگے، شراب کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے حجاب جاتا رہتا ہے اور راز پنہاں آشکارہ ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے

کھلا جب کہ بند در گفت گو — جواں نے حقیقت کہی مو بہ مو
کہی ابتدا سے جو گزری تھی سب — بتایا سب اپنا حسب اور نسب
پری کا بھی احوال ظاہر کیا — چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے — زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے

اس گفتگو کو سن کر بدر منیر نے تقاضائے فطرت کے مطابق یوں جواب دیا

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے — بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
ہیں اس طرح کا دل لگاتی نہیں — یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی — بھلے چنگے دل کو جلائے کوئی
بہے شمع ساں کیوں کوئی اشک سے — جلے کس لیئے آتش رشک سے

یہ جواب پاکر بے نظیر کو بدر منیر کے پاؤں پر گر پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، ذیل کا سین

نہایت فطری رنگ رکھتا ہے۔

یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر — کہا کیا کروں آہ بدر منیر
کوئی لاکھ جی سے ہو مجھ پر فدا — میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا
کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر — کسی کے مجھے دل کی ہے کیا خبر
یہ رمز و کنایہ جو ہونے لگے — تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے
رہی دل ہی میں آخرش دل کی بات — پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
خبر رات کی سن اُٹھا بے نظیر — کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا — تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا
یہ مت سمجھیو ہوں میں آرام میں — کروں کیا پھنسا ہوں عجب دام میں
دل اس جا سے اٹھنے کو کرتا نہیں — کوئی آپ سے جان مرتا نہیں
کرم مجھ پہ رکھیو ذرا میری جاں — میں دل چھوڑے جاتا ہوں اپنا یہاں

بے نظیر یہ کہہ کر روانہ ہوا اور جدائی کا قلق ساتھ لیتا گیا بقیہ رات اس نے پری کے ساتھ بے چینی میں بسر کی ادھر بدر منیر بھی عذاب فراق میں مبتلا رہی جب صبح ہوئی تو بدر منیر کی اندرونی حالت یہ تھی۔

کچھ امید دل میں کچھ اک جی کو یاس — لبوں پر ہنسی لیک چہرہ اُداس

نجم النساء نے جو بدر منیر کی یہ کیفیت دیکھی تو باتوں میں لگا کر اس سے کہنے لگی کہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ تو آج خوب اپنا سنگار کرے اور اپنے حسن کی بہار مجھے دکھلائے بدر منیر کو تو یہ منظور ہی تھا مگر اس نے نجم النساء کو اس طرح پر ایک ناز آمیز جواب دیا۔

کروں کس کی خاطر میں اپنا سنگار — وہ ہے کون جس کو دکھاؤں بہار

اس کے بعد اس داستان میں بدر منیر کے سنگار اور مکان کی آرائش کے بیانات ہیں یہ بیانات ایک ایشیائی شاہزادی اور ایک ایشیائی محل شاہی کی آرائش کی پوری تصویریں ہیں اور حضرت مصنف کی بڑی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی شاعر جب تک کلیات و جزئیات سے بامراد طور پر باخبر نہ ہوگا اپنے بیانات میں مصوری کا عالم نہیں پیدا کرسکتا ہے۔ مثنوی نگار کیلئے اطلاع عام بڑی حاجت ہے ایسے شاعر کو امور خارجیہ اور معاملات ذہنیہ سے کافی طور پر مطلع رہنا چاہیئے ورنہ ہزاروں غلطیاں اس سے سرزد ہوں گی یہ ممکن ہے کہ اُس سے زبان کی کوئی غلطی سرزد نہ ہو مگر مضامین کی غلطیوں کا سرزد ہونا ایک امر یقینی ہے اسی عدم اطلاع کی وجہ سے حضرت غالب اپنی مثنوی میں یہ مصرع "خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد" نظم فرما گئے ہیں اگر حضرت غفران مآب کو یہ معلوم ہوتا کہ خوک جانور سباعی نہیں ہے یعنی از قسم گربہ اور نہ از قسم سگ ہے، تو مرزا ناطق مکرانی کو موقع اعتراض کیا ملتا، اس واسطے کہ اس مصرع میں زبان کی گرفت کا کوئی موقع پایا نہیں جاتا ہے المختصر سچا مثنوی نگار وہی شاعر ہوسکتا ہے جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے کلیات و جزئیات سے حسب مراد واقفیت رکھتا ہے سعدی شکسپیر اور صاحب الف لیلہ کی حیرت انگیز کامیابیوں کا سبب سوا اطلاع کے دوسرا نہیں ہے۔

داستان بے نظیر کے آنے کی اور باہم صحبت کرنے کی

اس مثنوی کی داستانوں سے صرف نامطبوع داستان یہی ہے "کاش میر حسن اس داستان کو داخل مثنوی نہ کئے ہوتے یا اس داستان میں اس طرح کے بے باکانہ وصل کے پہلو کو رقم نہ کرتے" اس داستان کے مضامین کوئی روحانی جلوہ نہیں رکھتے، زنہار کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی صحبت کے بعد کوئی ناکتخدا عورت اپنے عاشق سے

اس طور پر ہم آغوش ہونا گوارا کر سکے یہ ایک اسلامی شاہزادہ اور شاہزادی کی کہانی ہے
وصل قبل از نکاح چہ معنی دارد، یہ طور زنان بازاری کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے کسی
شریف طبقہ کی ناکتخدا لڑکی تو اس طرح کا فوری وصل گوارا نہیں کر سکتی یہ داستان مثنوی
زہر عشق وغیرہ کا اخلاقی انداز رکھتی ہے فرق اسی قدر ہے کہ اس کے بیانات فطری
خوبیوں سے خالی نہیں ہیں۔ خوب ہوتا اگر میر حسن اس داستان میں انتظار وصل کو دکھاتے' اور
محبت کی پختگی کی تدریجی حالتوں کو بیان کرتے اس سے اس داستان کی وقعت بڑھ جاتی
اس فوری وصل نے تو بدر منیر و بے نظیر کو بے وقر کر دیا، لیکن اگر یہ دکھایا جاتا کہ بے نظیر
دور آیا کرتا تھا اور بدر منیر کی صحبت میں ایک پہر رہا کرتا تھا اور اس کا موقع ڈھونڈتا
تھا کہ کس طرح سے پری کی گرفتاری سے مخلصی حاصل کر کے بدر منیر سے دستور ملکی
کے مطابق مواصلت کی صورت پیدا کیجئے تو یہ واقعی داستان مطبوع صورت ہو جاتی
اگر اس کی روزانہ کی حاضری اس داستان میں بیان کی جاتی تو بے شک اس کی یہ آمد
شدہ رنگ پیدا کرتی جیسا کہ اہل فرنگ کا طور عقد کے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اسے
انگریزی زبان میں "کورٹ شپ" کہتے ہیں کورٹ شپ گو ملک ہندوستان کے رواج
کے خلاف ہے مگر اہل یورپ میں مذموم نہیں ہے بشرطیکہ کورٹ شپ کا زمانہ خیریت
سے گذر جائے۔ درحقیقت یہ زمانہ انتظار کشی کا زمانہ ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس
سے محبوب تر زمانہ اس رواج کے پابندوں کو میسر اُن کی تمام عمر میں نہیں آتا ہے

جو مزا انتظار میں دیکھا   نہ کبھی وصل یار میں دیکھا

خیر وصل کے بیان تک تو لاریب بڑی لغزش حضرت مصنف سے ظہور میں آئی ہے
لیکن اس کے بعد کے مضامین بھر وہی حسن لاجواب کہتے ہیں جو نیچرل شاعری سے

منفک نہیں ہو سکتا۔ اشعار ذیل قابل توجہ ہیں۔

بیہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم اِدھر ۔۔۔ کہ اتنے میں اُدھر سے باجا پھر
پھر کے وہ بجتے اٹھا بے نظیر ۔۔۔ ہوئی غم کی تصویر بدر منیر
نہ بولی نہ کی بات نہ کچھ کہا ۔۔۔ نہ دیکھا ادھر آنکھ اپنی اٹھا
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو ۔۔۔ پھر آؤں گا بولی کہ مختار ہو
خفا اس کے ہونے سے وہ نوجوان ۔۔۔ گیا تو وہ لے منہ پہ آنسو رواں

داستان خبر پانا ماہ رُخ کا زبانی دیو کے عشق بے نظیر و بدرِ مُنیر سے اور قید کرنا بے نظیر کو

یہ داستان داخلی شاعری کا خاتمہ نظر آتی ہے شکسپیئر بلا سخن داخلی شاعری کا مالک ہے، مگر قابلیت کے رو سے میر حسن بھی اُس یکتائے روزگار سے کم دکھائی نہیں دیتے اس داستان میں دو سین حوالہ قلم ہوئے ہیں ایک وہ جو بے نظیر سے متعلق اور دوسرا وہ جو بدر منیر سے تعلق رکھتا ہے دونوں سین نہایت اعلیٰ درجہ کے داخلی پہلو رکھتے ہیں ان کے مضامین کہے دیتے ہیں کہ میر حسن کو امور ذہنیہ کے بیان کی عجب حیرت انگیز قدرت حاصل تھی واقعی ان کے داخلی بیانات عالم دردنی کی تصویر ہیں حسب دستور پہلے حضرت مصنف ساقی نامہ کے چند آبدار اشعار رقم کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

پلا پھر کے ساقی مجھے بھر کے جام ۔۔۔ کہ ہے چرخ بھی در پئے انتقام

یہ وہ دل کو اک جا بٹھاتا نہیں — کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں
یہ ہے دشمن وصل و دلسوز ہجر — کرے ہے شب وصل کو روز ہجر
جدائی بھنوں کی خوش آئی اسے — پھر اتنی بھی صحبت نہ بھائی اسے

اس کے بعد ماہ رخ کے خبر پانے کے مضامین کو اس طرح پر حوالہ قلم کرتے ہیں:-

کسی دیو نے دی پری کو خبر — کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
یہ سن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی — لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی — ہوئی دشمن اب اس کے میں جان کی
کہا دیو سے تُو مجھے تو بتا — کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
کوئی نازنیں سی بھی اک اس کے ساتھ — کھڑی تھی دیئے ہاتھ میں اس کے ہاتھ
قضا را اڑا میں جو ہو کر ادھر — وہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
یہ اڑتی سی اس کی خبر سن پری — کہا دیکھنے پاؤں اس کو ذری
تو کھا جاؤں کچا اسے موت ہو — لگی ہے مری وہ تو اب سوت ہو
وہ آئے تو آگے مرے نابکار — گریباں کو اس کے کروں تار تار
یہی قول و اقرار تھا میرے ساتھ — بھلا اس کا دامن ہے اور میرا ہاتھ
ہمارے بزرگوں نے سچ ہے کہا — کہ ہیں آدمی زاد کل بے وفا

حضرات ناظرین اشعار بالا اس غضبناک عورت کی ایک پوری تصویر ہیں جس کو اپنے معشوق سے بے وفائی کے صدمہ کے اٹھانے کا اتفاق ہوا ہو. حضرت مصنف نے ایسی عورت کے معاملات درونی کی مختلف اور پے در پے کیفیتوں کو جس قابلیت کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے بہت کچھ قابل قدر و لحاظ ہے واہ واہ کیا فطری طریقۂ بیان

ہے معشوق کے اُوپر عاشق ہونے کی خبر پاتے ہی بلا دریافت حقیقت پری شعلہ بھبوکا ہوتی ہے پھر فرط حیرت و غضب سے جو بولتی ہے تو اسی قدر بولتی ہے کہ ایں یہ بلا کیا ہوئی پھر تحقیق حال کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے دفعتاً بے نظیر کی دشمن جاں ہونے کی قسم کھا بیٹھتی ہے یہ اضطراری فعل کس قدر فطری انداز رکھتا ہے پھر جب پہلی کیفیت شدت غضب کی کم ہوتی ہے تب مختصر طور سے دیو سے جویائے حال ہوتی ہے، اس کے پوچھنے پر دیو جس کو نہ بے نظیر اور نہ پری کے معاملات عشقیہ کے ساتھ کسی قسم کا تعلق تھا ایک بے لگاؤ شخص کی طرح بے نظیر اور بدر منیر کے دیکھنے کی سرگذشت بیان کر دیتا ہے اس کی کیفیت کو سُن کر پری کو بدر منیر کے ساتھ فی الفور سوتیا ڈاہ پیدا ہوتی ہے، اور بدر منیر کی نسبت ایسے الفاظ زبان پر لاتی ہے کہ ایک غضبناک سوتن کے سوا کسی کی زبان پر وہ آ نہیں سکتے اس اظہار عداوت کے ساتھ ہی پھر پری بے نظیر کو خیال میں لاتی ہے اور اس سے انتقام کا ارادہ مصمم کرتی ہے اور اس انتقام کی وجہ معقول سابق کے قول و اقرار کو ٹھہراتی ہے بالآخر ان سب پے در پے غضبناک کیفیتوں کے بعد اپنے عشقی تعلق پر اظہار ندامت کرتی ہے اور قول بزرگاں سے اپنی انحراف ورزی پر سخت پشیمان ہوتی ہے آفرین صد آفرین میر حسن آپ کی شاعری آئینہ علم دروں نظر آتی ہے اگر آپ بان اردو کے شاعر نہ ہوتے تو اردو میں شکسپیئر کی شاعری کا انداز کہاں دکھائی دیتا اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے معاملات خارجیہ کے بیانات تک شکسپیئر نہیں پہنچتے ہیں مگر آپ کے امور ذہنیہ کے بیانات بھی ایسے ہیں کہ قریب قریب شکسپیئر کا مزا دیتے جاتے ہیں اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ آپ شکسپیئر کی شاعری پابندی قوافی و ردیف کے ساتھ برتتے ہیں اور یہ وہ سخت پابندی ہے جس سے شکسپیئر کو تمام تر آزادی نصیب تھی

پری کی غضبناکی حالتوں کو بیان کر کے حضرت مصنف بے نظیر کا اس کی حالت غضبناکی ہیں سامنے آنا یوں ارشاد کرتے ہیں :-

غضبناک بیٹھی تھی یہ تو اِدھر
کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ قمر

اسے دیکھ غصّے میں وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے لگی
کہا سن تو اے موذی و مدعی

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
کہ اس بال زادی کو جوڑا دیا

الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا
یہ اُوپری اوپر مزے لوٹنا

مجھ کا دیا تھا نہ تو نے یہی
بھلا اس کا بدلا نہ لوں تو سہی

پھرا جیسے راتوں کو دل شاد تو
کرے گا دنوں کو بہت یاد تو

مزا چاہ کا دیکھ اپنے ذرا
جھکاتی رہوں کیسے کنویں رہ بھلا

تجھے جیسے ماروں تو کیا اسے غریب
ڈلے چاہتے ہیں یہ تیرے نصیب

کہ چاہ الم میں پھنساؤں تجھے
ہنسا ہے تو جیسا رلاؤں تجھے

اشعار بالا کی فطری خوبیاں حضرات اہل مذاق پر ہویدا ہیں قلم کہاں تک سمع خراشی کرے اس غضبناک اور انتقام طلب تقریر کے بعد پری ایک دیو کو بے نظیر کے کنویں میں بند کرنے کا حکم دیتی ہے بے نظیر کے کنویں میں بند ہونے کے مضامین بھی نہایت شاعرانہ خوبیاں رکھتے ہیں اور اس عاجز کی دانست میں ملّا جامی علیہ الرحمہ کے بیان قید چاہ سے جو ان کی مثنوی یوسف زلیخا میں پایا جاتا ہے زیادہ حسن شاعرانہ رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہاں تک کا سین بے نظیر سے متعلق ہے اب حضرات ناظرین سین ذیل پر توجہ فرمائیں جو بدر منیر کی دردنی کیفیتوں سے تعلق رکھتا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر — پڑی بیقراری میں بدر منیر
ہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ — تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
قلق واں جو گذرا تو یاں غم ہوا — رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا
کئی دن جو آیا نہ وہ رشک ماہ — نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ
لگی کہنے نجم النسا سے بوا — خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

واضح ہو کہ یہ امر فطری ہے کہ جب دو دل میں راہ ہوتی ہے تو ان میں سے اگر ایک مبتلائے غم ہوتا ہے تو دوسرا بھی مبتلائے غم ہو جاتا ہے، اس کا ذاتی تجربہ اکثر اشخاص کو حاصل ہوا ہے حضرت مصنف نے یہاں دل را بدل رہیست کے مضمون کو خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے ظاہر ہے کہ بے نظیر کی مفارقت سے جو غم بدر منیر کو ہوا وہ نجم النسا کو ہو نہیں سکتا تھا، گو نجم النساء بدر منیر کی ایک بڑی دردمند دوستدار تھی، بدر منیر کا تعلق بے نظیر کے ساتھ عشق کی بنیاد پر بالاصل اور نجم النساء کا بالعرض تھا اس تعلق کو بدر منیر کے حضرت مصنف نے شعر آخر میں خوب کھلایا ہے رفیق سے ایسا خطاب کہ خدا جانے اس شخص پر کیا ہوا وہی شخص کرے گا جس کا تعلق قلبی انتہا کو پہنچ گیا ہو گا، اللہ ری کلام کی بلاغت اللہ ری کیفیت دروں کی مصوری، اللہ ری واقعات بندی، اللہ ری فطرت نگاری یہی چیزیں ہیں کہ تائید غیبی کے بغیر نہیں آتی ہیں یہ محض عنایت ایزدی ہے اگر یہ شئے کسبی ہوتی وہبی نہ ہوتی تو ہر لائے مدرسہ سعدی شکسپئیر اور میر حسن بن بیٹھتا، اس خطاب کا جواب جو نجم النساء نے دیا گو روکھا معلوم ہوتا ہے مگر مصلحت آمیز ہے اس کے جواب سے ہویدا ہوتا ہے کہ وہ ایک مدبرانہ مزاج کی عورت تھی جیسا کہ وزیرزادی کو باشعور اور دور اندیش ہونا چاہیئے وہ تمامتر دیسی تھی اشعار ذیل نجم النسا کے جواب پر مشتمل ہیں،

کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ   وہ معشوق ہے اس کو پروا ہے کچھ
خدا جانے کس شغل میں لگ گیا   مری چیڑھ ہے اتنا بھی ہونا فدا
وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ   عبث آپ کو تم کرو مت تباہ
رکے جو کوئی اس سے رک جائیے   جھکے آپ سے اس سے جھک جائیے
تقول بھلا کچھ نکالا کرو   ذرا آپ کو تم سنبھالا کرو

یہ جواب پاکر بدر منیر چپ ہو رہی اس کی خاموشی تمامتر مقتضائے فطرت تھی ایسے جواب کے بعد کوئی مبتلائے غم پھر زبان کھول نہیں سکتا، بدر منیر کی خاموشی اس طور پر شعر ذیل میں حوالۂ قلم ہوتی ہے

یہ سن چپ ہی دل میں کھا پیچ و تاب   دیا پھر نہ اس بات کا کچھ جواب

سبحان اللہ حضرت مصنف انسان کے کوائف دروںی سے کس قدر باخبر تھے لاریب میر حسن اردو کے شکسپیئر ہیں اسی باخبری کی بدولت شکسپیر کو الہامی شاعر دنیا نے مانا ہے! در صورت اطلاع میر حسن کو بھی ویسا ہی مان سکتی ہے انصاف یہی ہے کہ میر حسن شکسپیئر کی طرح الہامی شاعر مانے جانے کے تمامتر مستحق ہیں اگر میر حسن انگلستان ایسے قدرشناس ملک میں ہوتے تو بے شک ایسے ہی مانے جاتے ؛

القصہ جب کئی دن گزر گئے اور بے نظیر کی کوئی خبر بدر منیر نہ پا سکی تو اس سے اُس کی کیا حالت ہو چلی اس کی پوری کیفیت اشعار ذیل سے ہویدا ہوتی ہے سبحان اللہ کیا فطرت نگاری ہے شاعری عبارت اسی سے ہے ان اشعار میں امور قلبیہ کا بیان نہیں ہے امور قلبیہ کی مصوری ہے فی الواقع میر حسن کی نیچرل شاعری کو وہی سمجھے جس نے شکسپیئر کی تحصیل میں برسوں جان کھپی کی ہو، نیچرل شاعری کا مذاق کھیل نہیں ہے بڑی مشقتوں سے یہ دولت نصیب ہوتی ہے ؛

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی ۔ بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی
اداسی سی ہر طرف پھرنے لگی ۔ درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب ۔ لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی ۔ دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ ۔ اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے ۔ محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو ۔ تو اٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے ۔ تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔ یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ۔ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
کسی نے کہا سیر کیجیے ذرا ۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا
جو پانی پلانا تو پینا اُسے ۔ غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش ۔ بھرا دل میں اُس کے محبت کا جوش
چمن پہ نہ مائل نہ گل پر نظر ۔ وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اُسی سے سوال و جواب ۔ سدا روبرو اُس کے غم کی کتاب

جو آ جائے کچھ ذکر شعر و سخن
تو پڑھنا یہ دو تین شعر حسن

غزل

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا
مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا

ملا میرے دلبر کو مجھ سے خدا
نہیں تو مرا جی مٹھ کاتے لگا

گنہ چشم خونبار کا کچھ نہیں
مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا

نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ حسن
مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

غزل یا رباعی و یا کوئی فرد
دیگر اسی ڈھب سے پڑھتا کہ ہو جس میں درد

سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں
نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں

سبب کیا کہ دل سے تعلق ہے سب
نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ایک مہجور غم دیدہ آفت رسیدہ رنج کشیدہ مضطرب مبتلائے ملال بیقرار بے آرام دل سوختہ جان باختہ کی اس سے بہتر کیا تصویر کھینچ سکتی ہے حق یہ ہے کہ اہل انصاف جس قدر داد سخن دیں بجا ہے اور اہل ہند جس قدر اس مثنوی کو سرمایہ ناز سمجھیں سزاوار ہے۔

داستان بدر منیر کے غم و اندوہ کی اور عیش باغی کے بلانے میں

بدر منیر کی حالت ہجر بے نظیر سے جو ہو رہی تھی اُس کی کیفیت بالا میں لکھی جا چکی لیکن ایک دن کی سرگذشت یہ ہے کہ بدر منیر خواب روز سے سو کر جو اٹھی تو اس کا جی چاہا کہ سیر چمن کیجیے کہ شاید اس سے کچھ تفریح کی صورت پیدا ہو کثرت اندوہ د

ملال میں کبھی انسان کے دل کو سیر و تفریح کی طرف میلان ہوتا ہے یہ امر خلاف فطرت نہیں ہے اِس خواہش سے وہ محل سے برآمد ہو کر چمن میں ایک زمردی مونڈھے پر جا بیٹھی۔ حضرت مصنف اِس کے انداز نشست اس کی حقہ نوشی اُس کی خواصوں کی حاضری اور چمن کے سماں کو جس قادر الکلامی کے ساتھ زیب رقم کرتے ہیں اس کی داد راقم کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے امور خارجیہ کا بیان اس ستھرے پن کے ساتھ شکسپیر کے کسی پلے میں نظر نہیں آتا ہے صرف سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک میں البتہ یہ مرقع نگاری دیکھی جاتی ہے بہر کیف اِس بیان کے بعد حضرت مصنف لکھتے ہیں کہ سیر چمن میں بدر منیر کو نغمہ کا خیال آگیا۔ یہ امر خلاف فطرت نہیں ہے سیر چمن میں نغمہ کی طرف میلان مقتضائے طبیعت ہے ایسا میلان الم کش کو بھی ہوتا ہے گو نغمہ سے اس کے اندوہ و ملال میں کمی نہیں ہوتی آپ فرماتے ہیں :۔

کہ اتنے میں کچھ جی میں جو آ گیا　　ادا سے لگی کہنے وہ دلربا
ارے ہے کوئی ہاں ذرا جائیو　　مری عیش بائی کو لے آئیو
عجب وقت ہے، اور عجب ہے سماں　　کرے وہ گھڑی آ کے مجرا یہاں
خفا ہوں مرا جی بھی مشغول ہو　　کوئی دم تو داغ جگر بھول ہو
کسی طرح سے دل تو لگتا نہیں　　جلے ہے جگر دل سلگتا نہیں

یہ حکم پاتے ایک خادمہ عیش بائی کو بلا لائی۔ وہ عیش بائی بھی شاہی مجرائی تھی اس کے حسن و جمال لباس زیور آرائش ساز و سامان آداب لحاظ کا کیا کہنا تھا جب بدر منیر کے حضور میں حاضر آئی وقت کے مطابق گوری کا حکم ہوا۔ اُس نے گانا شروع کیا حضرت مصنف اِس صحبت رقص کے سماں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

ہوا حکم گوری کا جو برملا لیے ساز اپنے سبھوں نے اُٹھا

دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

لگی گانے ٹھپہ وہ اس آن سے نکلنے لگی جان ہر تان سے

عجب تان پڑتی تھی انداز سے کہ بجلی تھی ہر تان آواز سے

وہ تھی گٹکری یا لڑی نور کی مسلسل تھی اک پھلجھڑی نور کی

گل و غنچہ کی طرح محبوب تھی کھلی اور موندی دل کو مرغوب تھی

غرض کیا کہوں اس کا میں ماجرا عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا

وہ گانے کا عالم وہ حسن بیاں وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں

گھڑی چار دن باقی ہر وقت تھا سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا

درختوں کی کچھ چھانو اور کچھ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

لپٹے ہوئے پوستوں پر تمام روپہلے سنہرے ورق صبح و شام

وہ لالے کا عالم نگھرے کا رنگ وہ آنکھوں کے ڈورے وہ نشہ کی ترنگ

گلابی سا ہو جانا دیوار و در درختوں سے آنا شفق کا نظر

وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور ہر اک جانور کا درختوں پہ شور

وہ سرو سہی اور آب رواں وہ مستی سے پانی کا بہنا وہاں

وہ اُڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ

وہ رقص بتاں اور بھترا الاپ وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

وہ دل بیدھنا ہاتھ پر مُہر کے ہاتھ اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

نہ انساں ہی کا ہو دل اس میں بند ہوئے محو سن کر چرند و پرند

غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے
اُڑے جس جگہ کو اڑے رہ گئے

جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے
جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے

لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا
گلوں نے بھی ٹیکے کان اودھر لگا

لگے ہلنے آہ جدھر سب درخت
کھڑے رہ گئے سُن ہو کر کرخت

درختوں سے گرنے لگے جانور
بنے مثل آئینہ دیوار و در

عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر
کہ ہو جائے پتھر کا پانی جگر

بندھا اس طرح کا جو اُس جا سماں
ہوا سب کے دل کا عجب حال واں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت قابل لحاظ ہے جتنی باتیں رقص و نغمہ سے متعلق ہیں پوری واقفیت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئی ہیں تاثیر نغمہ کے بیانات عجب پرتاثیری کے ساتھ رقم ہوئے ہیں بہت کچھ تو اُن میں واقعات نفس الامری کی حیثیت رکھتے ہیں بقیہ استعارات قریب کے ساتھ اور فطری رنگ پر بندش پاسے ہیں کہ دل کو ان کی جانب عجب طرح کی رغبت ہوتی ہے علاوہ اس کے مجمع خوباں صحبت رقص تازگی چمن کیفیت وقت ان سب کا سماں ایسی خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے کہ میر حسن کے سحر البیان ہونے میں ہر کہ شک آرد کافر گردو کا مضمون صادق آتا ہے تناسب کلام کی یہ خوبی ہے کہ اس سے زیادہ تناسب کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی جن صاحب نے اس شعر پر " درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ ÷ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ " یہ اعتراض وارد فرمایا ہے کہ دھان اور سرسوں کا ایک وقت نہیں ہوتا ان کا یہ اعتراض یا فن باغبانی یا فن زراعت کے اصول پر وارد کیا جا سکتا ہے ان دو پہلو کے سوا اور کسی پہلو سے اس شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ہے اگر زبان کی بدترکیبی پر کوئی اعتراض وارد کیا جائے تو

راقم کو اُس میں مجال گفتگو نہیں ہے کس واسطے کہ یہ ناچیز نہ زبان داں ہے نہ اہل زبان سے ہے بہرکیف اگر فن باغبانی کے رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے اور قرینہ بھی ایسا ہی ہے کہ فن باغبانی کے رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہوگا، کس واسطے کہ یہ دھان اور سرسوں بدرمنیر کے باغ کے اندر واقع تھے جہاں وہ گانا سن رہی تھی ظاہر ہے کہ سیرگشتی کے لیے زراعتی کھیتوں میں تو وہ نہیں گئی تھی پس اُس کا جواب باغبانی کے فن کے رو سے یہ ہے کہ امرا کے باغوں میں بجز سبزی کے خیال سے دھان اور جو بوئے جاتے ہیں اُن سے پیداوار کی غرض متعلق نہیں ہوتی، جس فصل میں جو کوئی چاہے سبزی کی غرض سے دھان یا جو بو کر دیکھ لے پس حسب ہر وقت میں دھان یا جو کا سبز تختہ تیار کیا جا سکتا ہے تو پھولی ہوئی سرسوں کے ساتھ دھان کے تختہ کا موجود رہنا خلافِ امکان کیا ہے سرسوں بولنے کے وقت حسب دھان بو یا جائے گا اس میں ناکامیابی لاحق نہ ہو گی لبشکل ثانی اگر اعتراض بالا زراعت کے اصول پر وارد کیا گیا ہے تو بھی میرحسن کے کلام میں عدم تناسب کا نقصان پایا نہیں جاتا ہے کس واسطے کہ جن ملکوں میں دو فصلیں یا تین فصلیں دھان کی ہوا کرتی ہیں وہاں دھان کی سبزی سرسوں کے پھولنے کے وقت میں پائی جاتی ہے علاوہ اس کے ایک قسم دھان کی ہوتی ہے جسے بورو کہتے ہیں یہ قسم سرسوں کے پھولنے کے وقت نہایت سبز رہتی ہے یہ قسم دھان کے محاصل کے اعتبار سے فصل گرما میں تیار ہوتی ہے اس وقت سے بہت پہلے سرسوں تیار ہو کر کٹ جاتی ہے، حضرت معترض کے ایسے اعتراض وارد کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر دیسوں میں جب سرسوں پھولتی ہے تو دھان میں سبزی نہیں باقی رہتی ہے لیکن اگر

حضرت معترض کو پورے طور پر زراعتی معاملات سے اطلاع ہوتی تو ایسے اعتراض کے وارد کرنے پر جرأت نہیں فرماتے، ایسے دلیسوں میں بھی کبھی سرسوں کے پھولنے کے وقت دھانوں کے بعض کھیتوں میں کافی طور پر سبزی باقی رہتی ہے، اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جب دھان پچھات اور سرسوں اگات ہوتی ہے تو ایسا ہی رہتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ سرسوں کے بونے کے دو زمانے ہیں ایک ہتیا نچھتر کے بعد اور دوم عین سرما میں پہلی قسم جب سویرے سے بوئی جاتی ہے تو اس کے پھولنے کے وقت دیر کے بوئے ہوئے دھانوں کا سبز رہنا خلاف توقع نہیں ہے المختصر میر حسن کا شعر نیچرل شاعری کے خلاف نہیں ہے عام اس سے کہ باغبانی یا زراعتی نگاہ سے دیکھا جائے

القصہ ہر چند گانا بڑی خوبی کے ساتھ ہو رہا تھا مگر بدر منیر کو اس سے تفریح طبع کی صورت پیدا نہیں ہوئی، چوٹ کھایا ہوا دل کہیں گانے بجانے سے بہلتا ہے سماں و رقص سے تو غم و الم کی افزائش ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے :-

لگا تھا زبس عشق کا اس کو تیر
لگی کھینچنے آہ بدرِ منیر

بندھا اس کو عاشق کا اپنے خیال
لگی رونے آنکھوں پہ دھر کر رومال

کہیں کا کہیں لے اڑا اس کو راگ
ہوا سے ہوئی اور گلزار آگ

لگی کہنے ہے یہ دیکھیں میں سیر
نہ ہو پاس میرے وہ یا دش بخیر

وہی جانے ہو جس کے کچھ دل کو لاگ
کہ معشوق بن سب ہے گلزار آگ

بھلا کیونکہ جی اس کا خوش حال ہو
کہ ہجراں کا غم جس کے دنبال ہو

جگر میں اگر آہ کی سول ہو
لگے خار کیسا ہی گو پھول ہو

درختوں کے عالم سے کیا ہو نہال — جیسے باد شمشاد کی ہو کمال
کرے گلشن و گل پہ کیا وہ نظر — جسے اپنے گل کی نہ ہووے خبر
یہ کہہ کر اٹھی واں سے وہ دلربا — چھپر کھٹ میں جا کر گری منہ چھپا
خوشی کا جو عالم تھا ماتم ہُوا — ورق کا ورق ہی وہ برہم ہُوا
سب اُٹھتے ہی بس اس کے جاتی رہیں — طوائف کہیں اور خواصیں کہیں

یہ بھی تصویر اس شخص کی ہے جو حالت غم میں جلسہ رقص و سرود کا شریک ہوتا ہے نغمہ و مے ان کے لیئے مسرت خیز ہے جن کے دل بند غم سے آزاد ہیں نہ ایسوں کے واسطے جو قیدی رنج و محن ہیں۔ لمولفہ:

نغمہ و مے کا ذکر مت چھیڑو — ہجر میں ناگوار ہیں دونوں

حضرت سودا نے خوب فرمایا ہے

جن کو وصل گل رخاں ہے ان کو بھاتی ہے بہار — ہم سے مہجوروں کو لیکن کب خوش آتی ہے بہار
دید گل کیا کیجیے بڑھتی ہے دونی بے کلی — خار ہجراں اور بھی دل میں چبھاتی ہے بہار

آخر میں حضرت مصنف تین شعر اخلاقی رنگ کے یوں حوالہ قلم فرماتے ہیں

مری عقل اس جا پہ حیران ہے — کہ یارب یہ کیسا گلستان ہے
ہر اک وقت ہے اس کا عالم جدا — جو چاہو یہ پھر ہو تو امکان کیا
کبھی ہے خزاں اور کبھی ہے بہار — نہیں اک تیرے پہ لیل و نہار

داستان بے نظیر کے غم ہجر سے بدر منیر کی بیقراری میں

حضرت مصنف نے ہر داستان میں بدر منیر کی غمزدگی کا فوٹو اس طرح پر کھینچا ہے

زباں پر تو باتیں ہوئے دل اداس — پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سر کی خبر نہ بدن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں — جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی — جو کنگھی نہیں کی تو یوں ہی سہی
جو سینہ کھلا ہے تو دل چاک ہے — غم آلودہ صبح طرب ناک ہے
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام — نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

اس کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ حسین بے آرائش بھی بھلے لگتے ہیں بلکہ بے آرائش اُن کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے یہ قول نہایت راست ہے اس میں مبالغہ کو جس برابر بھی دخل نہیں ہے، آپ فرماتے ہیں :-

ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا بھاؤ — کہ بگڑے سے دونا ہوا ان کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی — جو بگڑی ہے بیٹھی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا — بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا
جو ماتھے پہ چین جبیں غم سے ہے — تو وہ بھی ہے اک موج دریا ئے مے
وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ — تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
تپ غم سے یوں تمتمائے ہیں گال — کہ جوں رنگ لالہ ہو وقت زوال
گریبان سینہ پہ ہے جو کھلا — تو گویا وہ ہے صبح عشرت فزا
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے — دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے
ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا — کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ اکثر منقح مسائل بیان کر جاتے ہیں

واقعی حسن محتاج آرائش نہیں ہے جیسا کہ حضرت سودا فرماتے ہیں :-

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

داستان بیقراری بدر منیر کی بے نظیر کے فراق میں اور نجم النساء کے تسلّی دینے میں

بدر منیر ہجر بے نظیر میں یوں تو برابر بے قرار تھی مگر جب پورا مہینہ گذر گیا اور بے نظیر نہ آیا تب اس کا قلق بڑھنے لگا عشق نے انداز جنوں کا پیدا کیا بقول حضرت مصنف :-

محبت کا سودا سا ہونے لگا
جنوں تخم وحشت کا بونے لگا

سر کھنے لگا پاس ناموس و ننگ،
لگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ

خموشی اٹھانے لگی دل میں شور
جتلانے لگی ناتوانی بھی زور

واضح ہو کہ عشق ایک وسواسی مرض ہے اگر اس کا علاج وقت پر نہیں کیا جائے، تو جنوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے عشق کا بہترین علاج وصلِ معشوق ہے مگر یہ علاج دشوار صورت ہے ظاہر ہے کہ بحالت موجودہ اس طور پر بدر منیر کے علاج کی کوئی شکل نہ تھی اگر اُس کے عشق سے آثار جنون نمایاں ہونے لگے تو یہ امر تمامتر قرین فطرت تھا واقعی حضرت مصنف بہت ہی اطلاع عام رکھتے تھے زینہار ایسی شاعری ایک لاعلم شاعر سے انجام نہیں پاسکتی ہے القصہ جب بدر منیر کی یہ حالت پہنچی نجم النساء نے اس کے جوش کو مصلحت آمیز باتوں سے کم کر دینا

چاہا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہو گا :-

یہ احوال دیکھ اُس کا دختِ وزیر   لگی جل کے کہنے کہ بدرِ منیر
تو وہ ہے کہ سب کے تئیں دے وقوف   کدھر دل گیا تیرا اے بیوقوف
مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت   مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت
اُڑے چار دن کے ہیں یہ آشنا   ملا دل کو آخر کریں ہیں جُدا
گئے آسماں گر زمیں کے ہیں یہ   جہاں بیٹھے جا بس وہیں کے ہیں یہ
تو بھولی ہے کس بات پر اے بوا   خبر لے دیوانی تجھے کیا ہُوا
سنو جانی اپنے پہ کوئی مرے   تو دل پہلے اپنا بھی صدقہ کرے
اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو   تو پھر چاہیئے اس کی پروا نہ ہو
وہ خوش ہو گا اپنی پری کو لیے   عبث اُس پہ بیٹھی ہو تم جی دیے
تمہاری اسے چاہ ہوتی اگر   تو ابتک وہ تم کو نہ آتا نظر

نجم النسا کی یہ تقریر بڑے طبی اصول پر مبنی معلوم ہوتی ہے عشق کے علاج کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ معشوق کے حالات نفرت افزا اور خصال زشت کو عاشق کے آگے بیان کرتے ہیں مگر یہ طریقہ افراط عشق کی حالت میں سُود مند نہیں ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہُوا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہو گا :-

لگی کہنے تب اُس سے بدرِ منیر   کہ سنتی ہے اے میری دختِ وزیر
کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے   کہ اُس کا خدا عالم الغیب ہے
وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات   ہوئی اس پہ کیا جانئے کیا واردات
ہُوا قید یا آتے پایا نہ ہو   گئے اتنے دن اب تک آیا نہ ہو

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر | پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر
نہ باندھا ہو اس کو کسی صبد میں | کیا ہو نہ اس کے تئیں قید میں
پری نے کہیں طیش کھا لاف میں | دیا ہو نہ پھینک اس کہ قاف میں
پرستان سے بھی نکالا نہ ہو | کسی دیو کے منہ میں ڈالا نہ ہو
نہ ملنے کے دکھ اس کے سب ہیں سہے | بھلا اپنے جی سے وہ جیتا رہے
یہ کہہ حال دل اپنا رونے لگی | گہر آنسوؤں کے پرونے لگی
گئی منڈ کری مار آخر کو لیٹ | چھپر کھٹ کے کونے میں سر منہ لپیٹ

اشعار بالا کس قدر فطری رنگ رکھتے ہیں اول تو معشوق کی برائی کا یقین ہی پیدا نہیں ہوتا ہے معشوق ہمیشہ خوش خصال ہی نظر آتا ہے جیسا کہ قول ارسطو ہے "العشق یعمی حس العاشق ولقیمہ عن ادراک عیوب معشوقہ" ایسی صورت میں بدر منیر بے نظیر کی برائی کو کیونکر مان سکتی تھی پس ضرور ہوا کہ نجم النساء کو بدگوئی سے روکے، اور نجم النساء کی تردید میں بے نظیر کو خوبی کے ساتھ یاد کرے پھر بے نظیر کی نسبت تعلق کے ساتھ اس کی غیر حاضری کے احتمالات کو کہہ جائے سبحان اللہ کیا شاعری ہے اس کے بعد بے غرضی کی عاشقی کا اظہار کیا خوب حوالہ قلم ہوا ہے آخر میں بیکسی کا رو دینا کیا نیچرل رنگ رکھتا ہے اور رونے کے بعد منڈ کری مار کر اور چھپر کھٹ کے کونے میں سر منہ لپیٹ کر سو جانا کیا ہی واقعہ نگاری ہے۔

خواب دیکھنا بدر منیر کا بے نظیر کو کوئیں میں اور جوگن بن کر نکلنا نجم النسا کا اُس کی تلاش میں

واضح ہو کہ تزکیۂ روح میں ریاضت کو بڑا دخل ہے تن پروری حجاب چہرۂ جان ہوتی ہے فقرا نفس کشی سے روح کی صفائی پیدا کرتے ہیں فقیر کا تو بڑا درجہ ہے اس کی متقین اگر تصفیہ قلب و روح کی شکل پیدا کریں تو عجب کیا ہے ہم اہل دنیا بھی تکلیف دلی اٹھا کر کچھ نہ کچھ صاف دل ہو جاتے ہیں اس عاجز کا ذاتی تجربہ ہے کہ دلی مصائب کے زمانہ کے خواب نہایت حیرت انگیز ہوتے ہیں صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آلام قلبی کے اثر سے کچھ نہ کچھ دل کی اصلاح ہو جاتی ہے جس کے باعث روح میں بھی حسب استعداد قلبی کم و بیش طور پر صفائی آ جاتی ہے پس قلبی تکلیفیں اُٹھا کر ایسا خواب جیسا کہ اس داستان میں حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کیا ہے اگر بدر منیر نے دیکھا تو خلاف فطرت متصور نہیں ہے بلکہ علم ذہنیات کے رو سے اُس کا ایسے خواب دیکھنا نہایت قرین قیاس ہے کس واسطے کہ مضمون خواب قریب قریب وہی دکھائی دیتا ہے جو عالم بیداری میں اس کے ذہن میں موجود تھا اور جیسے مبتلائے خواب ہونے کے قبل وہ نجم النساء سے اعادہ کر چکی تھی بہرکیف یہ خواب خالی از حیرت نہ تھا۔ حیرت انگیز خواب بہت لوگوں نے دیکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ خواب جس کو ڈاکٹر ابرکرامبی نے اپنی کتاب فلسفہ میں خواب کی بحث میں درج کتاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ لندن میں ایک شخص نے اپنے دوست کی نسبت جو پارلیمنٹ

کا ممبر تھا یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ فلاں کا کوٹ پہنے ہوئے ہوس آف کامنس میں اسپیچ دے رہا ہے اسی حالت میں ایک شخص آیا اور اس نے اس ممبر پر چھری چلائی مگر وہ چھری کی نوک اس ممبر کی کوٹ کے ایک بٹن پر جا لگی جس کے باعث وہ ممبر زخمی ہونے سے بچ گیا، جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو فوراً اس ممبر کے پاس گیا اور سارا معاملہ خواب کا کہہ سنایا اور بتقاضائے دوستی سے التجا کی کہ اے دوست زنہار ہوس آف کامنس میں نہ جانا مجھے تمھاری جان کا خطرہ نظر آتا ہے، مگر منتجی کے دوست نے کچھ توجہ نہ کی اور جواب میں یہ کہا کہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں بروز حاضری جب وہ ممبر ہوس آف کامنس میں گیا اور جس وقت وہ اسپیچ دے رہا تھا ایک شخص آیا اور اس نے چھری ماری چھری کی نوک کوٹ کے بٹن پر پڑکے ٹوٹ گئی اور قتل ہونے سے بچ گیا، اتفاق وقت سے وہ ممبر اُس وقت اسی رنگ کا کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا جیسا کہ اس کے دوست نے خواب میں دیکھا تھا، یہ ممکن تھا کہ کیفیت خواب سن کر وہ ممبر کسی اور رنگ کا کوٹ پہن کر حاضر پارلیمنٹ ہوتا، مگر چونکہ اس نے اپنے دوست کے خواب کو محض خیالی امر سمجھا تھا کوٹ کے پہننے کے وقت اس ممبر کو کوٹ کے رنگ کا مضمون کچھ یاد نہ رہا ایسے خوابوں کی توجیہ ابھی تک کسی ملک کے علمائے ظاہری سے نہیں ہو سکی ہے لاریب یہ ایسے خواب ہیں کہ مجرد ہمارے اوہام اور خیالات کے نتائج نہیں ہیں کوئی شک نہیں کہ اُن کو ہمارے معاملات سے تعلق ہے جس کو ہم اہل ظاہر کچھ نہیں جانتے" حضرات انبیاء کے بعض خواب کتب سماویہ میں مندرج پائے جاتے ہیں ان کی صحت سے بے دین کے سوا کون انکار کر سکتا ہے خوابوں میں وہ خواب بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے جس

کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان مصر میں فرمائی تھی عوام بھی کبھی کبھی حیرت انگیز خواب تکلیفات قلبی کی حالت میں دیکھتے ہیں یہ شخص بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبوس زنداں تھا عجب نہیں کہ مصائب قلبی اٹھاتے اٹھاتے اس کی روح میں کچھ تزکیہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہو جس کے باعث اس نے یہ عجیب خواب دیکھا انبیاء علیہم السلام کے خواب رویائے صادقہ ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کی روح پر فتوح مصفا و مزکا ہوتی ہے لیکن کسی قسم کے تزکیہ کے باعث عوام بھی بعض اوقات ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ حیرت سے خالی نہیں ہوتے بیشتر عوام الناس کے خواب ان کے خیالات کے نتائج ہوتے ہیں مثل مشہور ہے کہ مرغ کے خواب میں دانہ ایسے خواب احلام کا حکم رکھتے ہیں اور مطلق قابل توجہ متصور نہیں ہیں۔ اب حضرات ناظرین میر حسن کے اشعار پر جو بدر منیر کے مضامین خواب پر مشتمل ہیں توجہ فرمائیں :-

قضا نے دکھایا عجب اس کو خواب — کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
جو دیکھا تو صحرا ہے اک لق و دق — کہ رستم بھی جسے دیکھ ہو جائے فق
نہ انساں ہے واں نہ حیوان ہے — فقط اک کف دست میدان ہے
مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں — کہ اٹھتا ہے آہوں کا واں دھواں
کنوئیں کا ہے منہ بند اور اس سے اڑی — کئی لاکھ من کی ہے اک سل پڑی
صدا واں سے ہے یہ کہ بدر منیر — ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان — کروں کیا کہ ہے قید مجھ پر گراں
پر اس قید میں بھی ترا دھیان ہے — فقط تیرے ملنے کا ارمان ہے

تو اپنی جو صورت دکھا دے مجھے — تو اس قید غم سے چھڑا دے مجھے
نہیں مجھ کو مرنے سے کچھ اپنے ڈر — یہ غم ہے کہ تجھ کو نہ ہووے خبر
تجھے کاش اس وقت میں دیکھ لوں — جیوں میں اگر تیرے آگے مروں
ولیکن یہ ہے خام میرا خیال — نہیں وصل ممکن بغیر از وصال
کوئی دم کا مہمان ہوں آج کل — اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

ان اشعار کے مضامین کی نغمگی، برشتگی سوز و گداز محتاج بیان نہیں ہے کلام کی خوبی ایسی ہے کہ ہر چند بے نظیر ایک فرضی شخص ہے مگر اس کی بے چارگی، بے کسی، رنج کشی مصیبت زدگی مایوسی پیش نظر ہو کر دل کو سخت چوٹ پہنچاتی ہے علاوہ اس کے عشق میں استقلال، بے غرضی محبت کی ثابت قدمی معشوق کی ایذا یابی کا خیال بے نظیر کی بڑی وقعت آنکھوں میں پیدا کرتی ہے سبحان اللہ کیا انداز بیان ہے خلاق سخن اسے کہتے ہیں یہی چیزیں ہیں کہ سیکھنے سے نہیں آتیں:

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

القصہ بے نظیر کو خواب میں اس طرح کلام کرتے دیکھ کر بدر منیر نے چاہا کہ کچھ بات کرے مگر اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی، یہ بیان بھی فطری ہے اکثر حالت خواب میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے انداز بیان رکھا ہے آنکھ کھلنے پر جو حالت بدر منیر کی ہوئی یہ کیفیت بھی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئی ہے پہلے تو بدر منیر نے اپنی حالت غم کو چھپایا مگر جب راز غم پنہاں نہ رکھ سکی تو ہمراز خواصوں سے معاملہ خواب کو بیان کیا جب نجم النسا حقیقت حال سے مطلع ہوئی تو اس کو بڑی بے قراری لاحق ہوئی۔ اس جگہ کا سین زبان مصنف سے ذیل میں عرض کیا

جاتا ہے :-

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا ترے واسطے میں نے اب دکھ سہا
بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں میں اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں
جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم تو پھر آکے یہ دیکھتی ہوں قدم
دگر مر گئی تو بلا سے موئی تو یوں جانیو مجھ پہ صدقہ ہوئی
کہا شاہزادی نے سن اے رفیق ہوئی ہیں تو اس چاہ غم میں غریق
بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو کہ وہ ہے پری اور انسان تو
رسائی تری ہوگی کیونکر وہاں مجھے بھی نہ دے ہاتھ سے میری جاں
میں جیتی ہوں اس آسرے پر فقط کہ ہوتا ہے تجھ سے مرا غم غلط
دگرنہ میں رک رک کے مر جاؤں گی اسی طرح جی سے گزر جاؤں گی
کہا اس نے کیا کیجیے پھر بھلا پڑی اب تو اپنے ہی سر یہ بلا
میں اس عشق کا یہ نہ سمجھی تھی ڈول ترے غم سے آنے لگا مجھ کو ہول
تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں
یہ کہہ اس نے رو رو اتارا سنگار کیا اپنی پشواز کو تار تار
گریباں کو مثل گل چاک کر دیا خاک پر پھینک ادھر اُدھر
پھر آئے جو کچھ اس کو ہوش و حواس سجا تن پہ جوگن کا اس نے لباس

اس کے بعد اس کے جوگن بننے کا فوٹو حضرت مصنف نے بڑی خوبصورتی اور بڑی دانست کے ساتھ کھینچا ہے جوگ کے بھیس میں تلاش معشوق میں نکلنے کا مضمون ملک ہندوستان سے خصوصیت رکھتا ہے بہت سے ہندی گیت دیکھے جاتے ہیں جن میں جوگی

اور جوگن کے مضمون بڑی لطافت کے ساتھ بندش پاتے گئے ہیں اس بھیس کے اختیار کرنے کا ظاہرا یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جوگ ایک مروج امر ہے بہت سے زن و مرد مذہبی خیالات کی پابندی سے یہ شیوہ اختیار کرتے ہیں پس اگر کوئی شخص جوگ کا پیرایہ کسی خاص ضرورت سے بھی اختیار کرتا ہے تو اس پر تفتیش کی آنکھ نہیں پڑتی ہے اور صفوت سے اس کی حقیقت حال پوشیدہ رہ جاسکتی ہے انگریزی شاعری میں جوگ کا مضمون قریب قریب نادر معلوم ہوتا ہے فقیر کو صرف دو تین ایسی انگریزی نظم سے اطلاع ہے جس میں فقیرانہ بھیس کا مضمون بندش پایا ہے ان میں سے بہت پر درد او دلاویزہ وہ فسانہ ہے جسے گولڈاسمتھ نے منظوم کیا ہے اور جو گولڈ اسمتس ہرمٹ کے نام سے معروف ہے لفظ ہرمٹ انگریزی ہے اس کے معنی تارک الدنیا اور فقیر ہے مگر یہ لفظ پورے طور پر جوگی کا مترادف نظر نہیں آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ قصہ اس کتاب کی جلد رابع میں درج پائے گا ؛

واضح ہو کہ نجم النساء کا جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکلنا اس کی بڑی پختہ مزاجی دردمندی اور دل سوزی سے خبر دیتا ہے ظاہر ہے کہ یہ عورت دختر وزیر تھی اور بلا گفتگو عیش و آرام میں پالی گئی تھی مگر دوست پر برا وقت جو آپڑا تو ساری ذاتی راحتوں کو چھوڑ کر بے دھڑک مصیبت کشی اور جانبازی کے لیے تیار ہو گئی اسی کو وفاداری کہتے ہیں البتہ مجھے وقت میں کام آنا دوستداری ہے نہ بھلے وقت میں دوست کہلانے کیلئے دنیا موجود رہتی ہے :-

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند — لاف یاری و برادر خواندگی

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

یہ قصہ بڑا اخلاق آموز پیرایہ رکھتا ہے واقعی نجم النساء کی یہ کارروائی اس کی بڑی شرافت

نفسی سے خبر دیتی ہے۔ اگر ذاتی غرض سے یہ عورت جوگن کا بھیس اختیار کرتی تو اُس کی یہ کاروائی معمولی طور کی ہوتی کس واسطے کہ جوشِ عشق میں ایسی کاروائی اکثر زن و مرد کی نسبت بیان کی گئی ہے مگر دوست کی ہمدردی کے تقاضے سے ایسی دشوار کاروائی کو اختیار کرنا ایک قدرت خاص رکھتا ہے خیر جب نجم النسا جوگن کا بھیس بنا چکی اور تلاش بے نظیر میں جانے لگی اس وقت کا سین حضرت مصنف نے بڑی خوبیوں کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے اس کی رخصت کی بندش نہایت فطری رنگ رکھتی ہے کلام کا عنوان ایسا نہیں ہے۔ جس سے دل نہ بھر آئے فقیر کی دانست میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اُس کی رخصت کو پڑھے اور متاثر و متالم نہ ہو حضرات ناظرین اشعار ذیل سے لذت یاب سوز و درد ہوں:

وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی
تو وہ صاحبِ خانہ رونے لگی

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

بہا تک بندھا اُس کے رونے کا تار
بہے پھوٹ دیوار و در ایک بار

لگے تھے وہ جوگن کے جو گرد کل
وہ رو رو ہوئے شبنم آلودہ گل

نہ دیکھا کسی نے جو کچھ اختیار
کہا حق کو سونپا تجھے بے سدھار

چلی جس طرح بیٹھ اپنی دیکھا
اسی طرح دکھلا ہمیں منہ پھرا

کسی نے کہا بھولیو مت مجھے
خدا کے تئیں ہیں نے سونپا تجھے

کہا اُس نے خیر اب تو جاتی ہوں میں
جو ملتا ہے تو اس کو لاتی ہوں میں

تمہیں بھی خدا کو میں سونپا سنا
مرا بخشیو تم کہا اور سنا

یہ رخصت پُر از درد و سوز ہونے کے علاوہ نسوانی پیرایہ کیا خوب رکھتی ہے طریقہ بیان ایسا ہے۔ جس سے تمام تر ایک عورت کی رخصت اپنی ہمجولیوں کے مجمع سے عیاں ہوتی

ہے یہاں بھی حضرت مصنف نے مصوّری کا عالم دکھلایا ہے لاریب خوش اسلوبی بیان ایسی ہی ہے کہ ایک عالم مصوّری اس کی مدد سے نجم النساء کی رخصت کی ایک سچی تصویر کھینچ سکتا ہے

بقیہ داستان نجم النساء کی صحرا نوردی کی کیفیتوں پر مشتمل ہے اشعار ذیل بڑی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں

جدا ہو کے القصّہ دوتوں کو چھوڑ — چلی اپنے گھر بار سے منہ کو موڑ
نہ سُدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی — نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
لیے بین پھرتی تھی صحرا نورد — تن چاک چاک اور رخ گرد گرد
کہ شاید کوئی شخص ایسا ملے — کہ جس سے وہ شیدا کا شیدا ملے
جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین — تو سننے کو آتے تھے آہوئے چین
بجاتی وہ جوگن جہاں جو گیا — وہاں بیٹھی خلق دھونی لگا
اُسے سن کر آتا تھا صحرا کو جوش — صدا سے درختوں کو آتا خروش
گل نغمہ جو اُس سے گرتے ہزار — تو لیتا انھیں دشت دامن پسار
کہیں حلقہ حلقہ کہیں لخت لخت — کھڑے ہو گئے گرد اس کے سنتے درخت
بجاتی تھی جوں جوں وہ بن بن کے بین — خس و خار سنتے تھے تن تن کے بین
نظر جو کر پڑتی تھی بوٹی جڑی — ہر اک عالم شوق میں تھی کھڑی
تماشا نہ دیکھا تھا جو یہ کبھی — دد و دشت عش ہو پڑے تھے سبھی
یہاں تک کہ رہ میں جو تھے نقش پا — وہ بیٹھے تھے کان اپنے اُدھر لگا
گل نغمہ تر کی تھی یہ بہار — کہ صحرا کے گل اس کے آگے تھے خار

سُن آواز کی اس کی شان و شکوہ | نکلنے لگی دب کے آواز کوہ
نہ پانی رہی سُن سرود اس کا چلنے | کنوئیں کے بھی دل میں اُٹھے ولولے
نہ چشمہ ہی کچھ آبدیدہ رہے | گریبان کر چاک دریا بہے
ہُوا بلبل و گل کا یاں تک ہجوم | کہ گرتی تھیں واں ڈالیاں جھوم جھوم
تحیر کا تھا واں ہر اک کو مقام | زبان کا نکلتا تھا ہاتھوں سے کام
چمن کرتی پھرتی تھی جنگل کے تئیں | بساتی تھی جنگل میں و گل کے تئیں
یہ ہر جا پہ تھا اس کے دم سے طلسم | بندھا تھا اُسی دم قدم سے طلسم
شب و روز سرگشتہ مثل صبا | یہی طرح پھرتی تھی وہ جا بجا

واضح ہو کہ ان اشعار میں حضرت مصنف نے مبالغوں کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا ہے ہر چند کثرت مبالغہ کلام میں بے تاثیری پیدا کرتی ہے مگر چونکہ یہاں ایسے مبالغوں سے کام لیا گیا ہے کہ فطری کیفیتوں سے علیٰحدگی نہیں رکھتے طبیعت کو اُن سے نفرت پیدا ہونے کے عوض رغبت پیدا ہوتی ہے واقعی یہ حضرت مصنف ہی کا کام ہے کہ استعمال مبالغہ میں بھی فطری شاعری کے لطف کو ہاتھ سے نہ دیں ‌۔

داستان فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کے بیٹے کا عاشق ہونا جوگن پر

جیسا کہ بالا میں ذکر ہُوا۔ نجم النساء جوگن کے بھیس میں جابجا پھرا کرتی تھی آخر کار اس کی نیل مرام کی صورت مسبب الاسباب نے پیدا کر دی:۔

مسبب کے اسباب دیکھو ذرا | کہ قدرت میں اس کی ہے کیا کیا بھرا
سپید و سیہ اس کے ہے اختیار | بنایا ہے اُس نے یہ لیل و نہار

جہاں میں ہے اندوہ و عشرت بہم — کہیں صبح عیش اور کہیں شام غم
دو رنگی زمانے کی مشہور ہے — کہیں سایہ ہے اور کہیں نور ہے

اشعار بالا آبِ زر سے لکھے جانے کے مستحق ہیں ان میں قدرت خداوندی کا بیان خوب ادا ہوا ہے واقعی مسبب الاسباب کے معاملات سمجھ میں نہیں آتے ع آنچہ در وہمت نہ آید آں کند۔ بسا اوقات بے سر و سامانی کی حالت میں لیسے ایسے سر و سامان مہیا ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظہور کا احتمال بھی نہیں ہوتا ہے اگر کوئی میر سامان نہیں ہے تو ایسے سر و سامان کہاں سے موجود ہو جاتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ بے سر و سامانی کی حالت میں پریشان نہ ہو خدا پر تکیہ رکھ کر ہمت نہ ہارے اپنی کوشش و فکر سے باز نہ آئے خداوند تعالیٰ محنت کی مزدوری دیتا ہے کیسی نہ کسی صورت سے حصول مدعا کی شکل پیدا کر ہی دیتا ہے البتہ انھیں کو حرمانی نصیب ہوتی ہے۔ جو جد و جہد سے جان چراتے ہیں اور اپنی کاہلی و جمودی کا نام توکل رکھتے ہیں ایسوں کو جو اپنے کو مدد نہیں دیتے کبھی خدا مدد نہیں دیتا اس کہانی میں جب نجم النساء نے کوشش کی مصیبت اختیار کی تب خدا نے اس کی بامرادی کا سامان بہم فرمایا حضرت مصنف اس سامان فرمائی کی سرگزشت اس طور پر ابتدا کرتے ہیں۔

قضارا سہانا سا اک دشت تھا — کہ اک شب ہوا اس کا واں بسترا
وہ تھی اتفاقاً شبِ چار دہ — ادا سے وہ بیٹھی وہاں رشکِ مہ
بچھی ہر طرف چادرِ نور تھی — یہی چاندنی اس کو منظور تھی
بچھا مرگ چھالے کو اور لے کے بین — دو زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
کدارا بجانے لگی شوق میں — لگی دست دینا مارنے ذوق میں
کدارا یہ بجنے لگا اس کے ہاتھ — کہ مہ نے کیا دائرہ مے کے ساتھ

بندھا اُس جگہ اِس طرح کا سماں، صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتّے چمکتے ہوئے خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
وبا یہ کہ جوگن کا منہ دیکھ کر ہوا نور و سایہ کا ٹکڑے جگر
گیا ہاتھ سے بین سن کر جو دل گئے سایہ و نور آپس میں مل
وہ صورت خوش آئی جو اُس نور کی دل اپنے پہ سایہ نے منظور کی
ہوا بند ھ گئی اس گھڑی اس اصول بسیرا گئے جانور اپنا بھول
درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا لگی وجد میں بولنے واہ واہ
کدورت کا عالم یہ تھا اس گھڑی کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

سبحان اللہ ثم سبحان اللہ یہ سین عجب خوش اسلوبی اور راستی کے ساتھ حوالہ قلم ہوا ہے۔ مگر اس کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے کہ جسے ایسے سین کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے اس سین کے بیان میں خس برابر بھی حضرت مصنف نے واقعات سے انحراف نہیں کیا ہے، اگر بے دیکھے ایسے سین کو حوالہ قلم کیا ہے تو معاملہ الہامی کے سوا اس کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ فقیر کو اپنے ایک دورۂ شکار افگنی میں پورے طور ایسے سین کے دیکھنے کا اتفاق پڑا ہے فرق اسی قدر ہے کہ اس وقت فقیر تنہا دشت نورد نہ تھا۔ جمعیت کے ساتھ جس طرح سفر شکار اختیار کیا کرتا ہے تیس چالیس آدمی شامل تھے، ورنہ سنسان جنگل شب چار دہ سہانا دشت اجلا سا میدان چمکتی سی ریت نورِ قمر درختوں کے پتے چمکتے خس و خار جھمکتے درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور

یہ سب کیفیتیں حضرت مصنف کے بیان کے مطابق موجود تھیں ایسے سماں میں موسیقی کی جیسی ضرورت منظور ہے محتاج بیان نہیں فقیر نے بین کار کو چاندنی راگ کی فرمائش کی (کدارا اور چاندنی واحد راگ کا نام ہے) وقت کی چیز کا کیا کہنا ہے ایسی بین بجی کہ شاید و باید. سامعین کے دل ہاتھوں سے جاتے رہے اس وقت فقیر نے اس سین کے دو تین شعر بھی پڑھے قول راست کا عجب اثر ہوتا ہے احباب باذاق جنھوں نے دعوت نشکار قبول فرمائی تھی۔ اور غایت کرم فرمائی سے شریک حال ہو رہے تھے حالت انشراح میں یک زبان ہو کر حضرت مصنف کی طباعی کی نسبت فرمانے لگے کہ یہ شاعری نہیں ہے یہ الہام غیبی ہے۔ اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ شاعری الہام غیبی سے خالی نہیں ہو سکتی جو شاعری الہام غیبی سے خالی ہو وہ شاعری نہیں ہے تک بندی ہے القصہ ایسے سماں میں نجم النساء بین بجا رہی تھی کہ اتفاق وقت سے فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کا بیٹا شب ماہ میں ہوا پر اپنا تخت اڑائے ہوئے چلا جا رہا تھا بین کی صدا سن کر اپنے تخت کو زمین پر اتار لایا اور نجم النسا کے حسن و جمال کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا کہ حقیقت میں وہ کوئی جوگن نہیں ہے یہ سب بناوٹ کا بھیس ہے یہ سمجھ کر اُس سے اس طور پر سوال کیا:-

پڑا تم پر ایسا کہو کیا بجوگ ‏ ‏ ‏ لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ
کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے ‏ ‏ ‏ دیا اپنی ہم پر بھی فرماؤ گے

اس سوال سے وہ سمجھی کہ دل آئے بغیر یہ سوال نہیں ہُوا ہے جیسا کہ حضرت مصنف فرماتے ہیں

وہ سمجھی کہ اس کا دل آیا اِدھر ‏ ‏ ‏ کہ دل بھی تو رکھتا ہے دِل کی خبر

یہ تو عام حالت دل کی ہوتی ہے مگر قابل لحاظ امر یہ ہے کہ عورت کو ایک خاص صلاحیت مودعہ ہے جس کے ذریعے سے وہ فوراً کیفیت عشق کو پہچان جاتی ہے گو کتنا ہی اُس کا

عاشق انتہائے عشق میں کوشاں ہو اِس شعر کے بعد حضرت مصنف یہ دو شعر رقم کرتے ہیں جو محض امور فطری پر مشتمل ہیں اور جن کی خوبی بیان محتاج بیان نہیں ہے۔

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے ۔۔۔ سدا حسن اور عشق میں لاگ ہے
وہ لے راگ ہے اور اُن میں ہوا ۔۔۔ کہ دونوں طرف آگ دے ہے لگا

یہاں دل آنے کے اسباب ہمہ وجوہ موجود ہیں کیونکر بے چارہ فیروز شاہ مبتلائے عشق نہ ہوتا اس جگہ پر راگ کا مضمون بہت قابل لحاظ ہے واقعی راگ سے حسن و عشق دونوں کا عالم بے انتہا ترقی کرجاتا ہے اوّل تو حسن خود بلائے جان ہے اُس پر سے راگ بس عشق کا سُر چہاں تک نہ چڑھ جائے وہی تعجب ہے۔

فیروز شاہ کی کیفیت عشق کو سمجھ کر نجم النسا نے اُس سے کہا کہ ہر لول ہر توجدھر سے آیا ہے اُدھر ہی چلا جا۔ مگر یہ جو کہا ہنس کر کہا، اس کا مطلب وہی سمجھیں گے جو انداز خوباں سے واقفیت رکھتے ہیں واقعی اس ایک لفظ سے شاعر کے کلام نے اِس سین میں جان دے دی ہے اگر نجم النساء ہنس کر فیروز شاہ کے سوال کا جواب نہ دیتی تو ایسے روکھے جواب سے فیروز شاہ کے دل پر چوٹ لگتی اور جو مطلب نجم النساء کا اپنی تقریر سے تھا ہرگز نہ نکلتا۔ فیروز شاہ نے گو روکھا جواب پایا مگر اِس سے بیدل نہ ہوا اس واسطے کہ معشوق کا ہنس کر جواب دینا گو روکھا ہی سہی بہت امید افزا ہوتا ہے ظاہراً ایسا ترش اور باطناً ایسا شیریں جواب پاکر

کہا تب پریزاد نے واہ جی ۔۔۔ بہت گرم ہیں آپ اللہ جی
نہ روکھے ہو اتنا بھلا جاؤں گا ۔۔۔ ذرا بین سن کر چلا جاؤں گا

ایسے جواب کی متوقع تو نجم النساء تھی ہی یہ سُن کر۔

کہا ہوتے سو تے سے اپنے کہو ۔۔۔ فقیروں کو چھیڑو نہ بیٹھے رہو

یہی تو فیروز شاہ کی مانگی مراد تھی ان آلیس کے لطیفوں کے بعد نجم النسا کے روبرو اُسی ہیئت میں وہ آبیٹھا۔ حضرت مصنف اِس جگہ فیروز شاہ کی محویت کا فوٹو اس طور پر کھینچتے ہیں:

نظر حسن پر گاہ گہ بین پر
سراپا دل اس نعمت چین پر

رہا تن بدن کا نہ کچھ اس کو ہوش
بنا کل وہ جوں نقش پا چشم و گوش

وہ جوگن جو تھی درد و غم کی اسیر
ہوا غم ہیں جوگن کے یہ بھی فقیر

نہ سُدھ گھر کی لی اور نہ لی راہ کی
جب آئی ذرا سُدھ تو پھر آہ کی

نجم النسا صبح تک بین بجاتی رہی اور فیروز شاہ برابر زار زار روتا رہا۔ جب صبح ہوئی نجم النسا نے کاندھے پر بین دھری اور انگڑائی لے کر اُٹھی مگر وہ کب جانے پاتی:

پریزاد نے تب پکڑ اُس کا ہاتھ
شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ

زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں
وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں

نہ مانا اور اس نے اُڑایا اُسے
پرستان میں لا بٹھایا اُسے

فیروز شاہ کا ایک غیر قوم کی جوان عورت کو پرستان میں لانا کب اس کے باپ سے چھپا رہتا اس لیے نہایت خوش خوش باپ سے جا کر حقیقت حال یوں عرض کی:

یہ جوگی جو ہے ایک صاحب کمال
ذرا بین سنیئے اور اس کے خیال

بہت آپ اس سے اُٹھائیں گے حظ
بہت بین سے اس کی پائیں گے حظ

فیروز شاہ کا باپ بارہ عقل رکھتا تھا جوان بیٹے کی رضامندی ملحوظ رکھ کر

کہا اس نے بابا بہت خوب ہے
ہمیشہ سے راگ اپنا مرغوب ہے

کہا آؤ جوگی جی بیٹھو اِدھر
کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر

کھلے بخت بیٹے کے اور باپ کے
سروں پر ہمارے قدم آپ کے

الغرض اس کے باپ نے مصلحت وقت کو خیال کر کے :-

بہت اس کی تعظیم و تکریم کی   جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

واضح ہو کہ یہ جزو داستان تدبیر المنزل کے ایک بڑے ضروری مسئلہ سے خبر دیتا ہے اکثر جو باپ اور بیٹے کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے رہیں اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ باپ کمال نادانی سے جوان بیٹے کو مولود تازہ کے برابر بے اختیار اور مجبور سمجھتا ہے یہ ایک بڑی غلطی ہے اس نافہمی کا باعث عجب عجب طرح کے خانگی فسادات پیدا ہوتے ہیں ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ جب بیٹا جوان ہو جائے تو اس کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو، فقیر نے اپنی آنکھوں سے چند ایسے وقعے دیکھے ہیں جن میں باپ کی طرف سے حضرت مصنف کے بیان کے برعکس کاروائیاں ظہور میں آئی ہیں عموماً ایسی بدعقلی کی کاروائیوں کے نتائج آپس کی پھوٹ اور خانہ بربادی کے سبب ہوا کرتے ہیں

داستان فیروز شاہ کی مجلس آرائی اور جوگن کے بلانے میں

جب رات ہوئی نجم النساء کو فیروز شاہ کے باپ نے مجلس میں بلایا اور اس کی بڑی خاطر داری کی، بہر زادما سے جوگن کی بین سننے کو جمع ہوئے جب نجم النسا آکر مجلس میں بیٹھی، جوگن کے بادشاہ نے بڑی تمنا کے ساتھ اُس سے

کہا ہم ہیں مشتاق کچھ گا دیجئے   سماں بین کا ہم کو دکھلا دیجئے

نجم النسا نے بڑی بے پروائی مگر معقول انداز کے ساتھ

کہا کچھ بجانا نہیں اپنا کام   ہر اک طرح رہیں ہر کا نام
ہے بیزار فرمائشوں سے فقیر   و لے کیا کریں اب ہوئے ہیں اسیر

اس جواب کو پاکر بادشاہ جن نے معذرت کے طور پر اور بڑی دلجوئی کے ساتھ

کہا جوگی صاحب یہ کیا بات ہے ۔ کرم آپ کا ہم پہ دن رات ہے
جو مرضی ہو تو تم کو تکلیف دیں ۔ نہیں جس میں راضی ہو تم سو کریں

نجم النساء نے ایسی نرمی کا جواب پاکر

کہا اس طرح سے جو فرماؤ گے ۔ تو ہاں بندگی ہی میں کچھ پاؤ گے

یہ کہ کر اس نے بین کاندھے پہ دھری اور ایسی خوبی کے ساتھ یہاں تک بجائی کہ اہل محفل کے دل پگھل گئے اور سبھوں کی آنکھیں شمع محفل کی طرح اشکوں سے بھر آئیں مگر فیروز شاہ جو مبتلائے عشق ہو رہا تھا اس کا حال اشعار ذیل ہی سے خوب عیاں ہوتا ہے :-

کبھی سامنے آکے کرتا نظر ۔ کبھی دیکھتا چھپ کے ایدھر اودھر
ستونوں کی کبھی اوٹ میں ہو کے وہ ۔ کھڑا دیکھتا اس کو رہ رہ کے وہ
کبھی ایدھر اودھر سے پھر پھر کے آ ۔ چھپے اس کے مکھڑے کی لیتا بلا
وہ گو کچھ نہ سنتی نہ کہتی اسے ۔ کن انکھیوں سے پر دیکھ رہتی اسے
نظر اس کی جب آن پڑتی ادھر ۔ تو یہ اور کی طرف کرتی نظر
اس آن واد اپر وہ فیروز شاہ ۔ دل و جان سے کرتا تھا ہر لحظہ آہ
اگر کوئی جوگن کی کرتا ثنا ۔ تو کھا رشک کہتا کہ پھر تم کو کیا

ایسی بے چینی محفل نغمہ میں سوا عاشق کے کس کو ہو سکتی ہے الغرض نجم النساء کی بین کاری نے جمیع سامعین کو محو کر ڈالا جیسا کہ اشعار ذیل سے اس صحبت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے ۔

بجی پہلی صحبت میں وان ایسی بین ۔ کہ غش کر گئے وے جو تھے نکتہ چین
سراہا پری زاد کے باپ نے ۔ کہا کیا دیا جوگی جی آپ نے

اسی طرح ہر شب کرم کیجئے | مری بزم رشکِ ارم کیجئے

مقدم ہمارا ار جھانا کرو | ہمیں اپنا مشتاق جانا کرو

یہ گھر بار ہے آپ ہی کا تمام | ہوئے آج سے ہم تمہارے غلام

تکلف کو موقوف کر دیجئے | جو کچھ تم کو درکار ہو لیجئے

کہا اُس نے مطلب نہیں کچھ ہمیں | تمہارا مبارک رہے گھر تمہیں

کہاں ہم کہاں تم ہوا یہ جو ساتھ | یہ تھی بات سب آب و دانہ کے ہاتھ

گانے بجانے کے بعد نجم النساء اپنی قیام گاہ میں چلی گئی مگر اس شب سے اس کا یہ معمول بندھا کہ وہ ہر شب بادشاہ جن کی خدمت میں جاتی اور اسے اپنے نغموں سے مسرور و ممنون کرتی اس درمیان میں فیروز شاہ کا جوشِ عشق ترقی کرتا گیا اس کی حالت روز بروز تباہ ہوتی گئی اس کی بدحالیوں کی کیفیت بڑی صراحت اور قابلیت کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کی ہے بخوف طوالت یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، یہ جزو داستان بھی دیدنی ہے اربابِ شوق خود مثنوی میں ملاحظہ فرمالیں مختصر جب فیروز شاہ کے عشق کی حالت برداشت سے باہر ہوگئی تب اُس نے ایک روز موقع پاکر نجم النساء سے اظہار مدعا کیا نجم النساء نے بڑی رد و کد کے بعد وصل کی امید دلائی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی کہانی غور سے سن کر فیروز شاہ اُس کے بر آرِ مدعا میں کوشاں ہو، فیروز شاہ نے وعدۂ واثق کیا۔ تس پر نجم النساء نے ساری سرگزشت بدرِ منیر کے عشق اور اپنے جوگن کے بھیس اختیار کرنے کی کہ سنائی جن کے شاہزادہ نے اپنی قوم کو بلا کر ان سے کہا کہ پرستان میں ایک آدمی قید ہے تم جاؤ اور اس کا پتا لگاؤ کامیابی کی صورت میں حسبِ دستور ملک انعام پاؤ گے پریزاد تلاش میں نکلے آخر ان میں سے ایک کا وہاں گذر ہوا جہاں ماہ رخ کا قیدی مبتلائے چاہِ الم تھا نگہبان چاہ سے بھید لے کر وہ پریزاد شاہزادے

کے پاس واپس آیا اور اس سے حقیقت حال عرض کی پھر ادائے مجرا کے بعد انعام کا طالب ہوا حسب معمول شاہزادے نے انعام میں اُسے جواہر کے پر لگا دیئے' واضح ہو کہ سب مضامین اِس داستان میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن بخوفِ طوالت راقم اُن کے ریویو سے قلم کو روک لیتا ہے ؏

داستان پیغام بھیجنے میں فیروزشاہ کے ماہِ رُخ کو

مخبر سے دریافت کر کے فیروزشاہ نے ماہِ رخ کو ایک سخت حکم بھیجا وہ دوڑی اور شاہزادے سے عذرِ تقصیر چاہا جیسا کہ اشعارِ ذیل سے ظاہر ہو گا ؏

کہا مجھ سے تقصیر اب تو کوئی ۔ کہا اِس کو لے جائیے یہاں سے کوئی
اگر اب میں لاگو ہوں اس کی کبھی ۔ تو پھر پھونک دیجو مجھے تم تبھی
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو ۔ کہ اس کا پرستان میں چرچا نہ ہو
مرے باپ کو یہ نہ ہووے خبر ۔ کہ پھر میں نہ اِیدھر کی ہوں نے اُدھر

یہ التجا بھی نہایت نیچرل رنگ رکھتی ہے اکثر اشخاص جو اس طرح کی بداطواری کے مرتکب ہوتے ہیں اپنے عیب کے پنہاں رہنے کے بڑے متمنی ہوتے ہیں، مگر اُن کے افعال قبیحہ کبھی پوشیدہ نہیں رہتے شیطان گھر گھر اُن بدفعلیوں کی منادی کراتا ہے' ماہِ رخ کا جواب پاکر فیروزشاہ وہاں گیا، جہاں بے نظیر قید تھا، اُس کے حکم سے ایک دیو بے نظیر کو بڑی حفاظت کے ساتھ کنوئیں سے باہر نکال لایا، یہ سب مضامین بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کیے ہیں' سبحان اللہ! کیا سحر البیانی ہے، شاعری ہے کہ اعجاز ہے ؏

داستان کنویں سے نکلنے میں بے نظیر کے

جب بے نظیر کنویں سے نکلا تو اس طرح کی قید شدید سے جو اس کی حالت ہو رہی تھی، اس کی تصویر اشعار ذیل میں کھینچی ہے ۔

وہ جیتا تو نکلا و لے اس طرح ۔ کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
زبس اوپر آنے کا تھا اس کو غم ۔ کہے تو کہ بھرتا تھا اوپر کا دم
جمی خاک تن پر برنگ زمین ۔ گڑا جیسے نکلے ہے پتلا کہیں
نہ آنکھوں میں طاقت نہ تن میں تواں ۔ کہ جوں خشک ہو نرگس بوستان
وہ تن سرخ جو تھا سو پیلا ہوا ۔ وہ جوڑا جو تھا سبز نیلا ہوا
وہ سر میں جو تھے اسکے سنبل سے بال ۔ ہوئے لاغری سے بدن کی وبال
فقط پوست باقی تھا یا استخوان ۔ نہ تھا خون کا رنگ موجی درمیان
بدن سے رگوں کی تھی اس ڈھب نمود ۔ کہ الجھی ہو جیوں ریسماں کبود
بدن خشک و زرد اس طرح تھا وہ گل ۔ خزاں دیدہ ہو جس طرح برگ گل
وہ ناخن جو تھے اس کے مثل ہلال ۔ سو وہ ہو گئے بڑھ کے بدر کمال

حسن بیان محتاج ستائش نہیں ہے میر حسن کے مبالغے بھی فطرت سے علیحدہ نہیں ہوتے، ایسے مبالغوں سے سچی شاعری میں بٹا نہیں لگتا، واقعی حضرت مصنف بڑے نیچرل شاعر ہیں یہی حال شکسپیر کا ہے کہ اس کے مبالغے خواہ تشبیہ اور خواہ استعارہ کی بنیاد پر ہوں کبھی فطرت سے بے لگاؤ نہیں ہوتے، القصہ جب بے نظیر اس طرح کنویں سے نکلا فرخ شاہ اس کی حالت دیکھ کر رونے لگا بعد ازاں بے نظیر کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھا کر وہاں سے آیا جو باغ نجم النسا تھی مگر پہلے

فیروز شاہ نے اُسے کسی جگہ مصلحتاً چھپا رکھا پھر نجم النساء سے جا کر بے نظیر کے آنے کی خبر کی چونکہ وہ بے نظیر کے لیے بدحال ہو رہی تھی ایسی غیر متوقع خبر پا کر بڑے اضطراب کے ساتھ حقیقت حال دریافت کرنے لگی اور وہاں چلنے کے لیے جہاں بے نظیر تھا جلدی کرنے لگی فیروز شاہ نے اس امر کو خیال کر کے کہ خوشی میں بہت عاجلانہ کارروائی نہیں کرتے نجم النساء سے کہا کہ اس قدر عجلت کو راہ نہ دو پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اطمینان کے ساتھ اُسے وہاں لے آیا جہاں بے نظیر کو وہ تخت پہ بٹھا چھوڑ آیا تھا اس جگہ پر نجم النساء اور بدر منیر کے آپس میں ملنے کا سین حضرت مصنف یوں رقم فرماتے ہیں :-

یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی بلا اس کی لے لے کے گرنے لگی
گلے لگ کے رونے لگی زار زار کیا اپنے تن من کو اُس پر نثار
وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اُٹھا بے نظیر تو نجم النسا ہے یہ دخت وزیر
کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ سوگ
کہا تیرے غم نے دیوانہ کیا کہ عالم سے اپنے بیگانہ کیا
بغل کھول کر پھر تو آپس میں مل وہ رویا کئے دیر تک متصل
بیاں دونوں اپنا جو کرنے لگے دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگے
کہی سرگزشت اس نے اُس دم تلک کہ اس طرح پہنچے ہو تم ہم تلک

اس کے بعد فیروز شاہ بے نظیر اور نجم النسا ایک روز وہاں مقام کر کے مرکب ہوائی یعنی تخت کے ذریعہ سے بدر منیر کے باغ میں جا اترے۔ بدر منیر سے نجم النسا کے پھر ملنے کا سین بطرز ذیل بیان ہوا ہے

یکایک جو آ وہ قدم پر گری تو جھجکی وہ شاہزادی اور کچھ ڈری
پھر آخر جو دیکھا تو جوگن ہے یہ مرے دردِ غم کی پرو گن ہے یہ

کہا میری نجم النسا تو ہے جان | ارے تیرے صدقے مری مہربان
ہمیں تیرے ملنے کی کب آس تھی | کہ جینے سے اپنے ہمیں یاس تھی
بہت اس نے چاہا کہ ہووے کھڑی | کھڑی ہوتے ہوتے وہیں گر پڑی
کہا بارِ غم سے افاقت نہیں | ارے کیا کروں مجھ میں طاقت نہیں
بلائیں لگی لینے نجم النساء | لگی گرد پھرنے بہ رنگ صبا

ان اشعار کی قدر اہلِ مذاقِ صحیح کے سوا کون کر سکتا ہے واقعی ایسے اشعار کی قدردانی کے لیے بڑی تعلیم یافتگی کی حاجت ہے نا تعلیم یافتہ زمانوں میں فطرت نگاری کبھی اپنے حق کو نہیں پہنچتی ہے جس وقت میں شکسپیئر نے اپنے حیرت انگیز پلے تصنیف کیے تھے اس وقت اس نادرِ روزگار کی کچھ بڑی قدر نہیں ہوئی تھی مگر جیوں جیوں تعلیم یافتگی دنیا میں پھیلتی گئی اس شاعر العامی کی قدر بڑھتی گئی اسی طرح ایک وقت آئے گا جب میر حسن کی مثنوی بھی دیدۂ حیرت سے دیکھی جائے گی اور اس کی نارسائی زائل ہو جائے گی۔

اس سین کے بعد حضرت مصنف بدر منیر اور تمام محل و باغ کی اس انقلابی حالت کو جو نجم النسا کی غیبت میں پیدا ہوئی تھی یوں رقم فرماتے ہیں:-

اسے شاہزادی کا تھا حال یاد | جو دیکھا تو یاں اس سے کچھ ہے زیاد
نہ گھر کی وہ رونق نہ اس کا وہ حال | گلوں سے لگا ڈال تک پائمال
پڑے سارے بیداد سے دیوار و در | محل کو جو دیکھا تو ٹوٹا سا گھر
خواصیں جو تھیں پاس وہ نازنین | سو میلی کچیلی کہیں کی کہیں
نہ چوٹی گندھی اور نہ کنگھی درست | جو چالاک تھی بن گئی وہ بھی سست
ہر اک اپنے عالم میں دیکھو تو دنگ | اُڑا رنگ چہرے کا مثلِ تفنگ

نہ آپس کی چہلیں نہ وہ چہچہے — نہ گانا بجانا نہ وہ قہقہے
غم آلودہ ہر ایک زار و نزار — نہ آرام جی کو نہ دل کو قرار
جو بیٹھیں تو رونا جو اٹھیں تو غم — غرض بیٹھتے اُٹھتے اُن پر ستم
چمن سارے ویراں سے رہیں پڑے — شجر گل کے اک جھاڑ سے میں کھڑے
جو خود ہے تو حیران و بیمار سی — کہ جوں زرد شیشے کی ہو آرسی
نہ تاب و تواں اور نہ ہوش و حواس — ضعیف و نحیف و پریشان اداس
یہ دیکھ اُس کا احوال نجم النسا — جلی شمع کی طرح آنسو بہا

اس کے بعد کا سین وہ ہے کہ جب نجم النسا کے آنے کی خبر محل کے رہنے والیوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے اُسے گھیر لیا، یہ سین نہ صرف فطری خوبی رکھتا ہے بلکہ اس میں زمانہ رسوم ملکی بھی خوب ادا ہوئے ہیں، اشعار ذیل قابل لحاظ ہیں :-

ولیکن محل میں پڑی جب یہ دھوم — کیا مثل پروانہ اُس پر ہجوم
سُنی ایک سے ایک نے یہ خبر — مبارک سلامت ہوئی یک دگر
کوئی غنچہ کی طرح کھلنے لگی — کوئی دوڑ کر اُس سے ملنے لگی
ٹکے کوئی صدقے کو لانے لگی — کوئی سر سے روٹی چھوانے لگی
کوئی آئی باہر سے گھر سے کوئی — اِدھر سے کوئی اور اُدھر سے کوئی
حقیقت لگی پوچھنے آ کوئی — لگی کرنے آپس میں چرچا کوئی
ہوا سر بسر ایسے زیں اژدہام — لگی کرنے گھبرا کے سب کو سلام
کہا بیبیو کل کہوں گی میں حال — کہ اب راہ کی ماندگی ہے کمال

جب زناں محل کی بھیڑ چھٹی تب بڑی تمیز داری کے ساتھ نجم النسا، بدرمنیر کو خلوت میں لے گئی اور

بے نظیر کے آنے سے مطلع کیا یہ سن کر بدر منیر غایت مسرت سے غش کر گئی پھر افاقہ کے بعد افراط حیرت کی حالت میں اُس نے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے یا اس سے کوئی چھیڑ مراد ہے نجم النساء نے بدر منیر کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تشفی کر دی بعد ازاں ساری سرگذشت کہ سنائی علاوہ اس کے پریزاد کے آنے سے بھی خبر دی بدر منیر نے پوچھا کہ پھر وہ دونوں کہاں ہیں تب نجم النساء نے کہا کہ ہم نے انھیں درختوں میں چھپا رکھا ہے اب نجم النساء کی بقیہ گفتگو اور بقیہ کیفیتیں اس داستان کی ذیل میں بزبان حضرت مصنف عرض کی جاتی ہیں :-

عجب وقت میں میں ہوئی تھی جدا	کہ دلبر کو تیر سے دیا لا ملا
مگر ایک یہ آپڑی بے بسی	کہ میں تیری خاطر بلا میں پھنسی
سو اب ایک کو تو لے آتی ہوں میں	رہا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
یہ سن شاہزادی ہنسی کھلکھلا	کہا کیوں اڑاتی ہے نجم النساء
ارے ایک ہے تو بڑی قہر ہے	کہیں تو ہے امرت کہیں زہر ہے
چل اب چوچلے بس زیادہ نہ کر	انھیں جا کے جلدی لے آتو ادھر
کہا پھر پری زاد کے روبرو	بغیر ان کے کس طرح ہوگی تو
کہا وہ تو ایسا دیوانا نہیں	وہ اس بات کو کیا کہے گا نہیں
اگر دل میں کچھ تیرے وسواس ہے	نہیں دور وہ بھی ترے پاس ہے
ذرا پوچھ لیجو تو اس بات کو	کہ وہ روبرو اس کے ہو یا نہ ہو
یہ سن کر شتابی گئی وہ نگار	لیا جا کے آہستہ ان کو پکار
چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں	وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں
پھر اس سے یہ پوچھا کہ اے بے نظیر	کہے تو چلی آوے بدر منیر

کہا خیر ہے تجھ کو رشک چمن — چھپے ہے کہیں بھائی سے بھی بہن
مرا جان و مال اس پہ قربان ہے — کہ اس کے سبب سے مری جان ہے
مرا یہ تو ہمدم ہے دن رات کا — مجھے اس سے پردہ ہے کس بات کا

یہاں حضرت مصنف نے پردہ کے اصول کی نسبت ایک ایسی بات حوالۂ قلم فرمائی ہے کہ بہت کچھ قابل لحاظ ہے اس ملک میں بڑے سخت پردہ کا رواج دیکھا جاتا ہے ایسا پردہ نہ ایران میں ہے نہ روم میں اس پر بھی شرعی پردہ مدار ہے یعنی عورتیں ایسے لوگوں سے حضور ہوتی ہیں جو ان کے محض غیر ہیں مثلاً شوہر کے چھوٹے بھائیوں یا شوہر کی بہنوں کے شوہروں سے ظاہرا صرف رواج ملکی کی بنیاد پر یہ حضور ہوتا ہے ورنہ ایسے رشتہ مندوں سے حضوری کی قرآنی اجازت نہیں ہے لیکن راقم کی دانست میں جب ایسے رشتہ مندوں سے حضوری رواجاً مجاز مان لی گئی ہے تو میر حسن کا قائم کردہ اصول خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے واقعی اگر چار شخص بے نظیر بدر منیر فیروز شاہ اور نجم النساء کی خصوصیت اور آزاد مشربی کے کہیں ہوں تو ان کے آپس کے پردہ کا التزام نہ صرف ذریعۂ تکلیف باخود ہا بلکہ تمام تر مخل علیش و نشاط ہوگا اس جگہ حضرت مصنف نے بدر منیر کے خیال فرمانبرداری کو بھی خوب دکھلایا ہے یعنی فیروز شاہ سے حضور ہونے کی بات کو بے نظیر کے امتزاج پر موقوف رکھا ہے عورت کو شوہر کے اتباع کا خیال ایسا ہی چاہیئے جس عورت میں یہ خوبی نہیں وہ کبھی اپنے شوہر کو رضامند نہیں رکھ سکتی جس کا نتیجہ یقینی تنگی عافیت اور بربادی عافیت ہے ؛

داستان بے نظیر و بدر منیر کے ملنے اور اس کے باپ کو بیاہ کا رقعہ لکھنے میں

فطرتی طریقہ بیان تو میر حسن پر ختم ہے مگر جہاں پر اخلاقی لغزشیں موجود ہیں ان کا دکھا دینا

بھی کلام کو کریٹک (CRITIC) کا ہے یہ لفظ انگریزی ہے اور اس سے مراد وہ شخص
ہے جو مصنف کے کلام کے حسن و قبح پر نظر ڈال کر اظہار رائے کرتا ہے۔ اس داستان میں
حضرت مصنف پہلے بے نظیر اور بدر منیر کے ملنے کو رقم فرماتے ہیں، اس کا سین نہایت
خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچا ہے، واقعی جب دو بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق ملتے
ہیں تو اسی طرح ملتے ہیں پھر مفارقت کے بعد کی پہلی شب کو جو گفتگو آپس میں ہوتی ہے
اس کا وہی انداز ہوتا ہے جسے مصنف نے حوالۂ قلم فرمایا ہے، کوئی شک نہیں کہ یہ سب
بیانات بہت کچھ قابل توجہ ہیں اور راقم بہ طوالت ان کی خوبیوں کو حوالۂ قلم کرتا مگر ضرورتِ
اختصار کے باعث قلم کو روک لیتا ہے اور صرف کلام کی اخلاقی لغزش کی طرف متوجہ
ہوتا ہے، جاننا چاہیئے کہ اس داستان کے انداز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدر منیر اور
بے نظیر کی طرح فیروز شاہ اور نجم النساء بھی ناجائز طور پر زن و شو کی طرح رہنے لگے، یہ
دوسری لغزش حضرت مصنف کی ہے پہلی وہ تھی کہ جو قبل کی ایک داستان میں بدر منیر اور بے نظیر
کی نسبت بیان کی جا چکی ہے اس وضع کی مواصلت کسی مذہب میں جائز نہیں ہے بے شک
اخلاقی پایہ سے یہ بیان گرا ہوا نظر آتا ہے، بہت خوب ہوتا اگر حضرت مصنف نے
ان دونوں عورتوں کا قبل از نکاح کنواری حالت میں قائم رہنا بیان فرمایا ہوتا کہانی کے
پہلو کو بدل دینے سے یہ اخلاقی لغزش ظہور میں نہیں آتی، موجودہ صورت اس کہانی کی ایسی
ناجائز مواصلت کے باعث معیوب و زشت نظر آتی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہی ناجائز
مواصلت کے بیانات سے یہ مثنوی بدنام ہو گئی ہے ورنہ جس قدر اخلاق آموز باتیں اس مثنوی
میں ہیں کسی اردو کی مثنوی میں پائی نہیں جاتی ہیں گو حضرت مصنف نے بدر منیر اور نجم النساء کو صرف بتلائے
عشق دکھایا ہوتا اور قبل از نکاح آلودہ مواصلت نہیں بیان کیا ہوتا تو اس کی کہانی کا روحانی

پہلو بہت ترقی کر جاتا اور یہ مثنوی اخلاقی پایہ کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی لیکن افسوس ہے کہ بدر منیر اور نجم النسا کی بے نظیر اور فیروز شاہ کے ساتھ ایسی مواصلت دکھائی گئی ہے کہ ان چاروں اشخاص نے اپنی حالتوں کو ناپسندیدہ سمجھ کر ان کی اصلاح کی طرف مائل ہونا ایک ضروری جانا چنانچہ اُن سبھوں میں یہ رائے قائم ہوتی گئی کہ بدر منیر اور نجم النسا اپنے اپنے باپ کے گھر جائیں اور بے نظیر اور فیروز شاہ بھی طور سے بیاہ کے خواستگار ہوں.

نامہ بھیجنا بے نظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بدر منیر کی

بے نظیر نے جو رقعہ لکھا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ صدی ہائے ماسبق کے بادشاہوں کی خواستگاری کے رقعے اکثر ہوتے تھے یہ رقعہ خواستگاری کا ہے کہ ہے یہ تو خاصا پیام جنگ ہے اگر مخاطب نافہم ہو تو لڑائی کے ٹھنڈھنے میں کیا باقی رہ جاتا ہے ہندو راجاؤں میں اکثر بیاہ لڑائیوں کے بعد انجام پائے ہیں اسی لیے ایک بیاہ ان کے یہاں ہوتا تھا کہ جسے رکشاس کہتے ہیں اس بیاہ کا یہ طور تھا کہ دولھا صاحب سُسر سالے سب کو لڑائی میں قتل کر کے دلھن کو میدان جنگ سے روتی ہوئی اپنے ملک کو لے جاتے تھے.

جواب نامہ بے نظیر کا ملک مسعود شاہ سے

رقعہ خواستگاری کا جواب بھی ترکی بہ ترکی نظر آتا ہے بہرحال مسعود شاہ نے درخواست بے نظیر کی منظور کی، اور طرفین سے شادی کے سامان ہونے لگے ؛

داستان بے نظیر اور اُس کے تجمل میں

اس داستان میں حضرت مصنف نے ہندوستانی امیروں کی بارات کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ کسی اور شاعر سے نہیں کھینچ سکتی ہے اسی طرح بارات کی محفل آرائی اور سارات کے معاملات کے بیانات اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ ملکی رسومات بڑی قوت شاعری کے ساتھ اس طور پر حوالہ قلم ہوئے ہیں کہ غیر ملک کا سیاح مجرد میر حسن کے بیانات کو پڑھ کر ہندوستانی بارات اور سارات کے جزوی معاملات کو آسانی کے ساتھ درک کر سکتا ہے کیا خوبی بیان ہے کہ اس داستان کو پڑھنے سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کوئی بھاری بارات بڑی تیاری کے ساتھ جا رہی ہے پھر بارات کی قیامگاہ میں ایک نہایت آراستہ و پیراستہ محفل ہو رہی ہے اسی طرح سارات میں جو کیفیتیں گذرتی ہیں وہ سب کی سب پیش نظر ہو رہی ہیں۔ واقعی میر حسن عجب حیرت انگیز شاعر گذرے ہیں کہ معاملات خارجی و داخلی دونوں کے بیان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں لاریب شکسپیر کو معاملات ذہنی کے بیان کی لاجواب قدرت ہے مگر معاملات خارجی کی مصوری میر حسن کے برابر یہ شاعر گرامی نہیں کر سکتا ہے راقم الحروف کی دانست میں اس قدرت کے اعتبار سے میر حسن کو شکسپیر پر یقینی ترجیح ہے

نکاح ہونا بے نظیر کا بدر منیر سے اور شادی نجم النسا کی پری زاد سے اور رخصت ہونا آپس میں

یہ داستان بھی میر حسن کے کمال شاعری کا ایک نمونہ ہے اس میں حضرت مصنف پہلے بے نظیر کے نکاح کا ذکر فرماتے ہیں بعد ازاں اس کے تجمل میں دولہا بن کر جانے کو بیان کرتے ہیں ان امور کے ساتھ جو رسوم انجام پاتے ہیں وہ اس وفور اطلاع اور خوش اسلوبی

کے ساتھ جو الفاظ نظم ہوئے ہیں کہ پڑھنے والے کو حیرت دامن گیر ہوتی ہے پھر صبح کو رخصتی کا سین جو بیان کیا گیا ہے اور اس کے متعلق کے رسوم جو احاطہ تحریر میں در آئے ہیں نہایت ہی قابل لحاظ ہیں اس کا سین کا داخلی (SUBJECTIVE) پہلو بھی بکمال قابلیت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ دلھن کو اپنی عیش گاہ میں لانے کے بعد بے نظیر پری زاد کے بیاہ کا سامان کرتا ہے اس کے بیاہ کی چوتھی کے ساتھ ابھی دھوم دھام سے پری زاد اور نجم النسآ کی شادی انجام پاتی ہے اس شادی کے انجام کے بعد پری زاد اور نجم النسا پرستان کو چلے جاتے ہیں مگر بے نظیر سے اس کا اقرار کر جاتے ہیں کہ گو اس وقت کی مفارقت ایک امر مجبوری ہے مگر آئندہ ہمیشہ آپس میں ملتے رہیں گے۔ پری زاد اور نجم النسا کی روانگی کے بعد بے نظیر بدر منیر کے ساتھ اپنے باپ کے ملک کی طرف رُخ کرتا ہے تمام اجزا اس داستان کے کس قدر نیچرل اور خوش اسلوب ہیں، سبحان اللہ، سبحان اللہ ÷

داستان بے نظیر کا بدر منیر کو اپنے وطن لے جانے اور ماں باپ سے ملاقات کرنے میں

باپ کے شہر کے نزدیک پہنچ کر بے نظیر نے ایک دریا کے کنارے قیام کیا جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو تمام شہر میں اس کے آنے کا شور مچ گیا اس کے ماں باپ کو بھی خبر ہوئی ایسی خبر سُنکر جو اُن کا حال ہوا اس کو حضرت مصنف کن نیچرل خوبیوں کے ساتھ ذیل میں منظوم فرماتے ہیں:۔

خبر یہ ہوئی جبکہ ماں باپ کو ۔۔۔ کیا گم اُنھوں نے وہیں آپ کو
زمیں دل تو تھا یاس ری سے بھرا ۔۔۔ یہ سن ہاتھ اور پا گئے تھرتھرا

لگے رونے آپس میں زار و نزار — کہا ہائے ہم کو نہیں اعتبار
ملا دے گی ہم سے ہمارا حبیب — یہ دشمن نہیں اپنے ایسے نصیب
یہ ہوگا کوئی دشمن ملک و مال — سو سُن کر وہ ہم ہوگئے غم زدہ حال
کوئی اس کا وارث تو آخر نہیں — وہی لے کے جائے یہ جھگڑا کہیں

ظاہر ہے کہ مصیبت زدگی میں اچھی خبر ایسا ہی حال پیدا کر دیتی ہے سبحان اللہ فطرت کی تبعیت حضرت مصنف کو کس قدر ملحوظ رہتی ہے اس جگہ داخلی پہلو کے حقوق کیا خوب ادا ہوئے ہیں کیا کہنا ہے کہیں حضرت مصنف شکسپیئر کی داخلی شاعری کا اور کہیں سر والٹر اسکاٹ کی خارجی شاعری کا تماشا دکھاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہی شاعر مثنوی نگاری کی داد دے سکتا ہے جس کو بیان کی یہ دہری قوت خدائے تعالیٰ کی جانب سے موہوب ہوئی ہے ظاہرا حضرت مصنف شکسپیئر اور سر والٹر اسکاٹ کی قوتوں کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں خیر جب لوگوں نے بے نظیر کے باپ کو بے نظیر کے آنے کا یقین دلایا اور مکرر بے نظیر کا نام اُس کے آگے لیا گیا تب تو باپ صاحب ننگے پاؤں اُس کی طرف دوڑے اِدھر سے بیٹے صاحب بھی چلے ہی آتے تھے باپ پر جو نظر پڑی باپ کے پاؤں پر بے نظیر یہ کہہ کے کہ "خدا نے دکھائے قدم آپ کے" گر پڑا، اس کے بعد حضرت مصنف یوں فرماتے ہیں:-

سنی یہ صدا جوں ہی اُس ماہ کی — تو اس غم رسیدہ نے پھر آہ کی
اٹھا سر قدم پر سے چھاتی لگا — لپٹ کے گھڑی دو تلک خوب رویا
یہ رو یا بالشدت کہ غش کر چلا — کہے تو کہ آنسو کا لشکر چلا
ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے — کہ یوسف ملے جیسے یعقوب سے

پھر تو چھوٹے بڑے سب کو علی مسرت ہوئی، اجڑا گھر سر نو سے آباد ہوا بے نظیر بدر منیر کی سواری کو محل سرا میں لے جا کر بدر منیر کو اتارا اسی عرصہ میں بے نظیر کی آنکھیں جو

تو قدموں پہ گر پڑا ۔ دونوں تقاضائے فطرت سے خوب روئے ۔ ماں نے بہو اور بیٹے کو چھاتی سے لگایا ۔ اس جگہ پر حضرت مصنف کا فرمودہ مندرج ذیل ہوتا ہے ۔

وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے ۔۔۔ یہ روئی کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا ۔۔۔ وہ دونوں کی لے ہاتھ سے وہ بلا
ہوئی جان اور جی سے اُس پر نثار ۔۔۔ پیا پانی ان دونوں پر وار وار

بعد حضرت مصنف اس کہانی کو اس طور پر تمام فرماتے ہیں کہ شاہی گھرانے والے سب مل کر آپس میں رہنے لگے ۔ بے نظیر کے باپ اور ماں نے بے نظیر کا سر نو سے خوب حوصلے دل کے نکالے ذیل میں خوشی اور بہبودی کے مضامین بزبان حضرت مندرج پاتے ہیں ۔

محل میں عجائب ہوئے چہچہے ۔۔۔ وہ مرجھائے گل پھر ہوئے لہلہے
ہوا شہر پہ فضل پروردگار ۔۔۔ وہی شاہزادہ وہی شہریار
وہی لوگ اور وہ ہی چرچے تمام ۔۔۔ وہی ناز و انداز کے اپنے کام
وہی بلبلیں اور وہی بوستان ۔۔۔ شگفتہ گل و مجمع دوستاں

کہانی کے تمام پر حضرت مصنف کچھ دعائیہ مضامین یوں زیب رقم فرماتے ہیں ۔

انھوں کے جہاں میں پھرے جیسے دن ۔۔۔ ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن
ملیں سب کے بچھڑے الٰہی تمام ۔۔۔ بہ حق محمد علیہ السلام
ہوئے جیسے وہ شاد ہوں شاد ہم ۔۔۔ رہیں شہر میں اپنے آباد ہم
رہے شاد نواب عالی جناب ۔۔۔ کہ ہے آصف الدولہ جس کا خطاب
خوشی اس کی ہے سرسبز باغ مراد ۔۔۔ رہے اس کا روشن چراغ مراد

بحقِ حسین و بحقِ حسن / رہوں شاد میں بھی غلام حسن

حضرت مصنف کو جس طرح ہر قسم کے مضامین کی بندش پر قدرت ہے اسی طرح دعائیہ مر
کی بندش پر بھی اختیار حاصل ہے پہلے سب بنی آدم کی خیر چاہتے ہیں پھر آقا کے
دعا فرماتے ہیں اور آخر میں اپنی ذاتِ خاص کی نسبت دست بدعا ہوتے ہیں۔ سبحان
کیا خوش مذاقی ہے کیا خوش کلامی ہے یہ خوش اسلوبی ایک امر مودع ہے سیکھنے سے
آسکتی ہے ایں سعادت بزور بازو نیست ؛ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ؛ اس سے
حضرت مصنف اپنی اس مثنوی کی داد مانگتے ہیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اگر ایسی
کی داد نہ ملے تو اس سے بڑھ کر انصاف کشی اور کیا ہو سکتی ہے آپ فرماتے ہیں :-

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا / کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
زبس عمر کی اس کہانی میں صرف / تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب بن گیا ہوں میں پیر / تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی / مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان / نئی مثنوی ہے یہ سحرالبیان
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام / کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام
ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا / تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا
اگر واقعی غور ٹک کیجیے / صلہ اس کا کم ہے جو کچھ دیجیے
غرض جس نے اس کو سنا یہ کہا / حسن آفریں مرحبا مرحبا
جو منصف سنیں گے کہیں گے یہی / نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

انصاف یہی ہے کہ حضرت مصنف نے اپنی مثنوی کی تعریف بالا میں کوئی امر احاطۂ حق-

یں ارشاد فرمایا ہے ۔ اشعار بالا میں خس برابر بھی مبالغہ نے جگہ نہیں پائی ہے ۔ بلاشبہ
وبی ایسی ہی ہے کہ " نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہو گی کبھی " مرزا قتیل کا مصرعہ تاریخ بھی جادہ
ی سے باہر نہیں ہے آپ فرماتے ہیں کہ " بریں مثنوی باد ہر دل فدا " حقیقت حال
ہی ہے کہ وہ حضرات جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتے ہیں اس مثنوی پر دل سے فدا ہیں ۔
رت مصحفی کا فرمانا کہ " یہ بتخانۂ چین ہے بے بدل " تمامتر قرین حق ہے واقعی یہ
ایک لاجواب بتخانۂ چین سے بھی زیادہ خوشنما اور دل آویز ہے ،

ی گلزار نسیم یہ مثنوی بھی بڑی شہرت رکھتی ہے اس کے مصنف حضرت نسیم خواجہ
حیدر علی آتش کے شاگرد تھے ۔ کہتے ہیں کہ خواجہ نے اس کی اشاعت
پہلے اس کی نظر ثانی فرمائی تھی ۔ خیر بحالت موجودہ یہ مثنوی بہت توجہ طلب ہے ، اس کی نظم
حیرت انگیز اختصار کا عالم رکھتی ہے اس پر بھی ادائے مطلب کا ایسا جلوہ دکھلاتی ہے کہ
ایدہ زبان کی عمدگی اپنا جواب نہیں رکھتی یوں تو کوئی کلام بشری اعتراض سے پاک نہیں ہو سکتا
ی اس کی خوبی نظم اور عمدگی زبان بہت کچھ لائق تحسین ہے البتہ اس مثنوی میں میر حسن کی فطری
کم ہیں ۔ وہ تناسب خیالات جو مثنوی میر حسن میں دیکھا جاتا ہے اس مثنوی میں گویا نہیں ہے ۔
ن ایک نیچرل شاعر تھے ان کے امور ذہنیہ اور امور خارجیہ کے بیانات تناسب سے
ی بھی جدا نہیں دیکھے جاتے ہیں یہ خوبی اس مثنوی میں کمتر نظر آتی ہے ۔ میں مثالاً یہ عرض کرتا
کہ تاج الملوک کے چاروں بیٹوں کا ذکر حضرت نسیم یوں فرماتے ہیں ؛-

خالق نے دیئے تھے چار فرزند عاقل دانا ذکی خردمند

زبان کیا خوب ہے اور نظم کیا چست ہے مگر کلام میں تناسب حسب مراد نہیں دکھائی
ہے حضرت نسیم کی ساری مثنوی پڑھ جانے کے بعد بھی کہیں سے ان چاروں صاحبزادوں

کی عقل مندی، دانائی، ذکاوت اور خرد مندی کا کوئی پتا نہیں لگتا ہے بلکہ حضرت نسیم کے آئندہ کے بیان حالات سے اُن کی بے وقوفیاں اور بدتمیزیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے میر حسن کی مثنوی کا انداز ہے کہ ساری مثنوی بلکہ کلام ایسے تناسب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ بے اختیار دل میر حسن کے حسن کلام کا معترف ہو جاتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ تناسب ہی حسن ہے۔ انسان بھی تناسب کے حاصل رہنے سے حسین کہلاتا ہے اور ہر شے جو تناسب رکھتی ہے دل آویز ہوتی ہے اگر یہ تناسب گلزار نسیم کو حاصل رہتا تو اس مثنوی کی دل آویزی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی بہر حال یہ مثنوی اپنے رنگ میں اچھی ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے عرض ہوتے ہیں :-

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گُل کا جو عالم چمن چمن ہے
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غُل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل — سوسن تو بتا کدھر گیا گُل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
ٹھرائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہُوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چُرانے والا — اُوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاولی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشمِ حوض کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی ہَیں — اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو رہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لاریب زبان کی خوبی اور بندش کی چستی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے مگر اشعار بالا کے مضامین نہ جذبات قلبیہ کا کوئی زور دکھلاتے ہیں اور نہ کسی سین یا سینری کا تماشا پیش نظر کر دیتے ہیں شاعری کے اعتبار سے یہ اشعار اعلیٰ درجہ کے داخلی یا خارجی مضامین کی کوئی خوبیاں نہیں رکھتے حکمت و فلسفہ سے تو اُن کو کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے اور اخلاقی تعلیم کی

بھی ان کو ہوا نہیں لگی ہے۔ فطری شاعری کے نمونے یہ اشعار ہرگز نہیں مانے جا سکتے ہیں۔ ان کی جو خوبیاں ہیں مصنوعی انداز کی ہیں۔ فطرت پسندوں کے لیے اور ہی انداز کی شاعری درکار ہے۔ جو حضرات میر حسن اور شیکسپیئر کے کلاموں کے لذت یاب ہیں ان کو اس ترکیب کے مضامین سے بہجت قلبی کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے۔ کلام کا فطری انداز کچھ عجیب لطف رکھتا ہے' ذیل میں کچھ اشعار مثنوی کی ترکیب کے کتاب مذہبِ عشق معروف بہ گل بکاؤلی سے درج کیے جاتے ہیں۔ ہر چند یہ اشعار کوئی علمی مسئلہ سے خبر نہیں دیتے ہیں مگر چونکہ ان میں ایک امیر گھر کی ہندوستانی دلھن کا سچا فوٹو ہے یہ اشعار لطف سے خالی نہیں ہیں۔ یہ اشعار بکاؤلی کے عروس بننے سے تعلق رکھتے ہیں اور اہل مذاق کے قابل توجہ ہیں:۔

پرستاروں نے یہ اس کو بنایا — جہاں میں حورِ جنت کو دکھایا
عجب صورت سے کی بالوں میں کنگھی — کہ بکھرا دیکھ کر ہر ایک کا جی
لپٹ آئی جو بوئے زلفوں کی یکبار — ہوئی کافور بوئے مشک تاتار
کھجوری گوندھی وہ پاکیزہ چوٹی — کہ سب اہل نظر کی جان لوٹی
جب اس کی موتیوں سے مانگ بھر دی — فلک نے کہکشاں قربان کر دی
جو ٹیکا اس کے ماتھے پر لگایا ۰ قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا
برنگ مہر تاباں تھا جو چہرہ — ہوا تار شعاعی منہ پہ سہرا
وہ آنکھیں بند کرنا بھی ادا تھی ۰ چھپی مژگاں میں پوشیدہ حیا تھی
جب اس کے کان میں پہنایا جھمکا — پریشاں ہو گیا عقدِ ثریا

پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا — وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں چمکا
مسی آلودہ دنداں پیارے پیارے — چمکتے تھے شب یلدا میں تارے
مسی مل کر جب اس نے پان کھایا — یہ مطلع پڑھ کے ناسخ کا سنایا
مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے — تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے
بنایا خال کاجل سے ذقن پر — عجب جوبن تھا اس رشکِ چمن پر
چوڑھی منہ پر دلھن کے ایسی شیریں — کہ پھیکی پڑ گئی نظروں سے شیریں
گلے میں پہنا جب موتی کا مالا — بنات النعش کو حیرت میں ڈالا
اگر ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے تھے — زرِ خالص کے زیبِ پا چھڑے تھے
بہت اس کے سوا بھی اور گہنا — مناسب جس جگہ تھا اُس نے پہنا

ظاہر ہے کہ یورپ کا کوئی آدمی جو ہندوستان کی رسمی اور رواجی باتوں سے واقف نہیں ہے اشعار بالا سے کوئی حظ نہیں اٹھا سکتا مگر ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی آدمی جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے ضرور ہے کہ بیانات بالا سے متلذذ ہو اس لئے کہ یہ اشعار واقعات سے تمامتر تعلق رکھتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں دلھنیں دولت مند گھروں کی اسی طور پر سنواری جاتی ہیں پس ایسا سچا بیان واقعات کا جو شاعرانہ انداز کے ساتھ ہو کیوں کر مطبوع اہل مذاق نہیں ہو سکتا ؛

حکمت آموز مثنویاں : اس ترکیب کی مثنوی اُردو میں "بوستان سعدی" اور "پند نامہ عطار" کے پایہ کی کوئی نہیں ہے ؛

تصوف آموز مثنویاں : اس قسم کی مثنویاں بھی اُردو میں اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں کوئی ایسی نہیں ہے جو مولانائے روم کا جواب سمجھی جائے ؛

متفرق مضامین کی مثنویاں: اس انداز کی مثنویاں بہت ہیں، سیکڑوں قصص و حکایات رنگ برنگ کے منظوم ہوتے گئے ہیں ذیل میں ایک مثنوی غالبؔ کی جو آم کی تعریف میں ہے درج کی جاتی ہے:

ہاں دِل دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میدان ہے — ثمر و شاخ گوی و میدان ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان — آئے یہ گوے اور یہ چوگان
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہ کن باوجود غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان — پردہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغ جنت سے

انگبیں کے بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخ نبات
مدتوں تک دیا ہے آب حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہ برگ و نوا
نازشِ دودمان آب و ہوا

رہرو راہ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردہ بہار ہے آم

واضح ہو کہ مرزا رفیع سودا نے بہت سی مثنویاں مختلف مضامین کی لکھی ہیں یہ مثنویاں ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ حضرت سودا کی طباعی جو اب نہیں رکھتی ہے اس شاعر گرامی کو اصناف شاعری پر قدرت حاصل تھی۔ ان مثنویوں میں چند ہجو کی بھی مثنویاں ہیں جن سے کم و بیش طور پر عام و خاص واقف ہیں۔ لاریب حضرت سودا کو ہجو نگاری میں بڑا دخل تھا اور نہ نیبار ان کی طباعی اس کی محتاج نہ تھی کہ فحش گوئی سے وہ کسی قسم کی اعانت لیتے مگر اس بتیج انداز سے اپنے کو بچا نہ سکے اگر ایسے نازیبا اشعار ان کی ان مثنویوں سے نکال دیئے جائیں تو ان کی ہجو نگاری اہل تہذیب کے لیے بھی قابل توجہ ہو جا سکتی ہے اس لیے کہ ان مثنویوں سے حضرت سودا کی طباعی کا اظہار اس درجہ ہوتا ہے کہ اس کے لطف سے کوئی شخص طبیعت دار اپنے کو محروم رکھنا پسند نہیں کر سکتا ہے یہ مثنویاں علاوہ اظہار طباعی کے حضرت سودا کی اطلاع عام سے بہت کچھ خبر دیتی ہیں وہ مثنویاں جو

قابلِ ملاحظہ ہیں ان کے نام درجِ ذیل ہوتے ہیں :-

ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ	ہجو شیدی کوتوال
ہجو امیر دولت مند	ہجو ضاحک
ہجو حکیم غوث	ہجو چیک میرزا فیضو

کمال حضرت سودا کا یہ ہے کہ بسبب اطلاعِ عام کے جس چیز کو لکھتے ہیں اس کے متعلقات کو اپنے بیان میں فرو گذاشت نہیں کرتے ہیں۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر کچھ اشعار مثنوی ہائے بالا سے درج کیے جاتے ہیں :-

اشعار از مثنوی ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ

کیا ساقی نے گو مجھ کو سیہ مست — تو کر فکر بلند اے ہمتِ پست
قلم سے کہہ کہ ہو سر گرمِ تحریر — بنے تا صفحۂ کاغذ پہ زنجیر
قوی ہاتھی سے بھی اپنا سخن ہے — زبانِ خامہ یاں گجلی بن ہے
اگر ہم فیل معنیٰ کا بنا دیں — تو بہتر ہاتھیوں سے کر دکھا دیں
پھر اس کو جو کوئی سمجھے سو جھومے — قدم آ حضرتِ سودا کا چومے
یہ دعویٰ گو کوئی شاعر نہ مانے — پر اس کو جو سخن رس ہو سو جانے
کہ طرزِ شاعری انسب یہی ہے — سخن کا ہے جو کچھ فن سب یہی ہے
کہوں میں پیل معنیٰ کی جو اوقات — تو شیخی ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات
بندھے ہے ہی وہ سدا اگر مرے باں — جگہ ہے گشت کی فہم سخن داں
تو اس سے اگر وہ چھوٹ جاوے — کوئی شاعر ہی اس کو باندھ لاوے

دبلے ہے اُس سے جو کوئی ہو کج فہم — کہ اس کی طبع کو انکس کرے وہم
بنا ہے پاک طینت اس قدر وہ — قدم ہرگز نہ رکھے خاک پر وہ
سبک چلنا کوئی کیا اس کو بتلائے — جہاں تک ہجو کاغذ پر چلا جائے
کریں ہیں آفریں اس پر سو کیا ہے — گویا اس کی وہ آوازِ درا ہے
نہ لگوائے کبھی مستک پہ سیندور — بہت اس کی بزرگی سے ہے یہ دور
ہوا کیا گر نہیں کرتا ہے تزئین — اُسے کہتے ہیں اہلِ طبع رنگین
نہ ہو شے قد و قامت میں وہ موجود — بلندی عرش سے ہے اس کی افزود
بھلا اس شان کا ہاتھی کہیں ہے — کہ جس پر سر کوئی ایسا تعیں ہے
مہاوت دل ہے نالہ بھالہ بردار — ہے چرخی پیچش آہ شرر بار
نہ کچھ پیوے کبھو نہ کچھ وہ کھاوے — نظر بھی اس بندگی پر نہ آوے
کوئی ہاتھی کی ہوتی ہے یہ اوقات — نہیں دم مارنے کی اس جگہ بات
غرض ہاتھی خدا دیوے تو ایسا — نہ فیل راجہ نرپت سنگھ جیسا

اس کے بعد اس ہاتھی کی ہجو ہے۔ ہاتھی سے جو باتیں متعلق ہیں ایک بھی نہیں اُٹھا رکھی گئی۔ افسوس کہ اس کتاب میں ہر پہلو سے اختصار ہی کی ضرورت ہے ورنہ ہجو کے اشعار کم از کم دس بیس تو ضرور داخل کتاب ہذا کر دیئے جاتے۔ سبحان اللہ کیا شاعر گرامی سودا گذرا ہے حقیقت ہے کہ سوا حضرت سودا کے اس قابلیت کی مثنویاں کسی شاعر سے انجام نہیں پا سکتی ہیں۔

اشعار از مثنوی ہجو شیدی کوتوال

قوت انتخاب جواب دینے لگتی ہے کیا کلام ہے سبحان اللہ مجموعہ ذیل میں کچھ اشعار

عرض کر دیئے جاتے ہیں ورنہ لطف کلام تو پوری مثنوی پڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

گشت جب اس کا پھرتا آتا ہے
یہی نرسنگیا بجاتا ہے

سن لو جو رو یہ مختصر قصہ
صبح کو بیچ دیجیو حصہ

شہر کے بیچ کیا کہوں میں اب
روز محشر کی دھوم ہے ہر شب

شب ہے، نرسنگیوں کی قال و قیل
گویا پھنکتی ہے صور اسرافیل

کتے آہٹ سے ان کی بھونکتے ہیں
مردے خواب عدم سے چونکتے ہیں

آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے
چوروں کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے

آسماں پر بھی منعدم ہے خواب
کھلا رہتا ہے دیدۂ مہتاب

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہے کر کے رزم کا ساماں

تس پہ یہ ہے کہ بہر طرہ زر
لگے ہے چور شمع سے آکر

طرۂ شمع یک طرف سے یار
گم ہے خورشید کی بھی شب دستار

شام سے صبح تک یہی ہے شور
دور یو گٹھڑی لے چلا ہے چور

صبح شبنم جو گل پہ ہوتی ہے
بقچہ کو غنچہ کے وہ روتی ہے

اس مثنوی میں کوئی بات جو کوتوال کے متعلق ہے اس شاعر نامی سے چھوٹ نہیں رہی ہے اپنی اطلاع عام سے کام لینا حضرت سودا ہی کا کام ہے اس زور کا شاعر جو اصناف شاعری پر اس قدر قادر ہو، اردو میں کوئی نہیں ہے حضرت سودا اپنے جواب آپ ہیں۔

اشعار از مثنوی ہجو امیر دولتمند بخیل

حضرت سودا اس مثنوی میں لکھتے ہیں کہ آپ کے ایک آشنا ایک امیر کی ملاقات کو

گئے اُن کے وہاں جاتے ہی ابر گھر آیا اور بارش ہونے لگی وہ امیر محل میں چلا گیا اور نہیں وہ رات مجبوری سے اس کے گھر رہنا پڑا۔ بکاول سے حسب ہدایت امیر جو کھانے کے واسطے کہا تو اُس نے اس امیر کی بخالت کے حالات بہت کچھ بیان کیے یہ بیانات حضرت سوداؔ کی بڑی طباعی اور مضمون آفرینی سے خبر دیتے ہیں آخر میں بکاول نے یہ باتیں کہیں۔ اشعار ذیل میں منظوم ہیں :-

ایک فرزند یہ رکھے تھا اولاغ — سارے گھر کا تھا اُس کے چشم و چراغ
اُس نے اک روز یہ حماقت کی — آشنا اپنے کی ضیافت کی
نہ ضیافت، کہ جس میں ہو رنگ رس — اک رکابی طعام و دیگچہ بس
تس پہ یوں پیش آیا یہ مردود — یاد آیا اُسے چھٹی کا دود
چاہتا تھا کرے یہ اس کو عاق — اور ماں کو بھی اس کے دیوے طلاق
بارے لوگوں نے آ کے سمجھایا — تب یہ جورو کے حق میں فرمایا
پھر اس کے عوض یہ کیوں نہ جنی — کاش بھینس مرتا داں یہ ناشدنی
یارو مجھ سے تو لاولد بہتر — میرا بیٹا اور اس قدر ابتر
اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیاش — اس سلیقہ سے پر کرے تھا معاش
جو کوئی اس کے گھر میں نوکر تھے — رات کو اس پہ یہ مقرر تھے
پھرتا وہ ٹکڑے مانگتا گھر گھر — لاتا آقا کے آگے جھولی بھر
اچھے چُن چُن کے آپ کھاتے تھے — برے تنخواہ میں لگاتے تھے
پیدا جو کر گئے تھے یوں اجداد — سو یہ بدبخت دے ہے یوں برباد
جانتا تھا میں آپ ہی کو فضول — پر یہ تجھ سے بھی نکلا نامعقول

گرڑے پیسے یہ سب اُڑا دے گا — اینٹوں تک بیچ بیچ کھاوے گا
اِس ۔۔ادی کے باپ کا اک روز — آشنا تھا سو وہ نپٹ دل سوز
لایا کھچڑی پکا شراکت سے — دونوں کھانے لگے رفاقت سے
ان نے اک دو لیے نوالے بڑے — جد مرحوم دو ہیں ہو کے کھڑے
لگے کہنے نہیں شراکت نیک — میرے سو لقمے اور تیرا ایک
تھی بزرگوں کے اپنے تو یہ چال — کرتی ہیں یاں ضیافتیں پامال
خوب جو کچھ اُٹھا خزینہ سے — لو اتالیق کے مہینے سے
سنا اِس گھر کا یار تو نے حال — مجھ سے کھانے کا پھر کیجو سوال

خوبی بیان کا کیا کہنا ہے ، بکاول اپنے آقا کے حالات بیان کرتا ہے پھر بکاول خود کچھ نہیں کہتا ہے صرف اپنے آقا کے اقوال کا اعادہ کرتا ہے اس اعادہ میں آقا کی بی بی بیٹے دادا پردادا سب کی ہجو ہو جاتی ہے یہ ترکیبیں حضرت سودا کے سوا کس سے انجام پا سکتی ہیں۔ واہ ری طباعی واہ ری مضمون آفرینی واہ ری خوش اسلوبی بیان کیا حیرت انگیز قدرت شاعری کی اس شاعر گرامی کو عطا ہوئی تھی۔ اہل اطلاع حضرت سودا کی جس قدر قدر فرمائیں بجا ہے۔

اشعار از مثنوی ہجو ضاحک

اِس مثنوی میں میر ضاحک کی بسیار خواری کی ہجو ہے معلوم ہوتا ہے کہ میر ضاحک نے سودا کی ہجو کی تھی۔ یہ مثنوی اُن کی ہجو نگاری کی مکافات ہے، خلاقی سخن حضرت سودا پر ختم ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار

اس مثنوی کے درج ہوتے ہیں۔ پوری مثنوی دیدنی ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

جو اسے میہماں بلاوے ہے
آفت اپنے وہ گھر پہ لاوے ہے

یہی کہتا پھر اس کے گھر بیٹھے
اور کوئی نہ کھانے پر بیٹھے

بولتا آوے ہے قدم بہ قدم
کہو کھانے کو جلد دیویں دم

نہ سلام و علیک نہ کچھ بات
صاحبِ خانہ سے کرے بذات

بیٹھتے ہی نکالے ہے یہ ذکر
پیٹ کی میرے تم کو ہے کچھ فکر

بھوک کچھ اِن دنوں ہے کم میری
روٹیاں سو پچاس ادھ سیری

نان پاؤ کہو یہ بلوا کر
جلد اِن کو تنور لگوا کر

جب تلک کھانے پک چکیں سارے
ان ہی کو لا کے میرے سر مارے

جتنے دنیا کے بیچ ہیں اخکال
اشتہا ان میں تھامنا ہے محال

جب تلک کھانا آوے ہی آوے
اسی یک بک میں جان کھا جاوے

کھانا آوے ہے تو اس طرح ٹوٹے
جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے

مارے لقمے تو اس طرح بدذات
جیسے جھاڑے کوئی پٹے کی بات

وہ جو نوکر کھڑے ہوں جس تس کے
منہ کو حیراں ہو تکا رہیں اس کے

دیکھے جب یہ چاٹ کر چھوڑے
منہ کو کھانے سے موڑے تو موڑے

اشعار از مثنوی ہجو حکیم غوث

حضرت سودا کی بڑی اطلاع عام اور حیرت انگیز قابلیت شاعری کا ثبوت یہ

مثنوی بھی ہے واقعی مضمون آفرینی اس شاعر جادو نگار پر ختم ہے، کچھ اشعار اس مثنوی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں :-

کیسے ہی بیمار تھے اور ایک گھر
سو ہی تو وہ گور سے تھا تنگ تر

آن کے بیٹھا وہ ستم گار جب
گرد ہوئے اس کے یہ بیمار سب

چھوتے ہی اک شخص کی دیکھی جو نبض
کہنے لگا تجھ کو بشدت ہے قبض

کچھ نہیں کرنے کا بجز اس کے شو
لکھ دیا یہ کر کے سفوف بہود

اور غذا اس کو یہ بتلائی دوست
ماش کی روٹی سے تو کھا ساگ پوست

صاحب ہیضہ کو بتایا کٹول
واسطے مرضیہ کے لکھا اسپغول

لکھ دیا مجنون کو شیر شتر
کر دیا مستسقی کو جا فصد کر

پوچھا جو اُن نے کہ غذا کیا کہی
ساتھ کلتھی کے کہا کھا دہی

یہ کہا اس کو جسے تھی آتشک
موضع مخصوص پہ چھڑکو نمک

کہنے لگا دیکھ کے ایک اور کو
زخم کو دنبل کے کرا تا رفو

بیٹھ کے پھر پاس وہ اک ڈولی کے
نبض کہا دیکھوں ہیں لا ہاتھ دے

دیکھ چکا نبض کو جب بے تمیز
خادمہ سے اس کی کہا اے کنیز

درد کمر اس کو ہے یا درد سر
پر مجھے نقرس کا ہے ڈر بیشتر

کر کے پھر آخر کو مقرر صرع
کہنے لگا دو اسے ماء القرع

اور جو کھانے کی گئے اس کو لو
کچھ نہ اُسے دیجیو جبز آش جو

کہنے لگی سن کے یہ کیا قہر ہے
واسطے اس کے یہ دوا زہر ہے

لقوہ و فالج اسے ہے پیر زال
کرتے ہو کیوں قتل کا اس کے خیال

لقوہ و فالج ہو جیسے یا صرع　　دیجیے اس کے تئیں ماء القرع

یہ کمال ہجو نگاری ہے۔ مرض مشخص کے خلاف دوا و غذا کی تجویز کیا خوش اسلوبی کے ساتھ دکھلائی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت سودا کی طباعی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے لاریب حضرت سودا ایک بڑے شاعر گذرے ہیں فطرت نے انہیں شاعری کی بے حد قابلیت بخشی تھی اپنی اطلاع عام سے جس قدر انھیں کام لینے کی صلاحیت حاصل تھی دنیا میں بہت تھوڑے شاعروں کو نصیب ہوئی ہے ؎

اشعار از مثنوی ہجو چیک مرزا فیضو

اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اطلاع عام مرزا رفیع سودا کی ایک حیرت خیز انداز رکھتی ہے، ہندوستان کے ہر قسم کے معاملات سے اس شاعر گرامی کو خبر تھی حضرت سودا کی کلیات کی سیر سے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ اپنی اطلاع عام کی بدولت حضرت سودا ہر قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے تھے واقعی کون سی بات شاعری کی ایسی ہے جو حضرت کی کلیات میں نہیں ہے، اس مثنوی کے اشعار بھی حضرت کی بڑی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میر شکاری کے فن سے بھی پوری اطلاع رکھتے تھے نا واقف فن ہرگز اس خوبصورتی کے ساتھ ایسی مثنوی نہیں لکھ سکتا ہے۔ حضرت سودا نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کو ہمہ دان ہونا چاہیئے۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اصناف شاعری پر قادر ہونے کے لیئے اطلاع عام کی بڑی ضرورت ہے میری دانست میں حضرت سودا اطلاع عام کے اعتبار سے ہندوستان میں اپنے جواب آپ ہیں جیسا کہ

شکسپیر انگلستان ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے ہدیہ ناظرین ہوتے ہیں :-

آہ و داد و بلا ز دستِ روزگار
قوش خانوں میں یہ غم ہے آشکار

سر سے ہر یک باز نے پٹکی کلاہ
رخت ہر شاہیں نے پہنا سیاہ

ہو گئے چرّوں کے دل غم سے دو نیم
باشہ و باشین و شکرے بھی یتیم

کیا تمتی کیا کہی کیا بسیرا
یک بیک ان سے زمانہ یوں پھرا

آہ کچھ مت پوچھو اب اس کا سبب
کیا کہوں یارو میں تم سے ہے غضب

زا فیضو کی چیپک مر گئی
قوش خانے جگ کے ویراں کر گئی

کس قدر ہے آسماں بے امتیاز
آہ کیا مارا ہے اس نے شاہباز

وضع دوراں سخت نا انصاف ہے
دیکھیو یارو یہ کیا انصاف ہے

میرزا غمگیں ہوں چڑیاں شاد ہوں
گھونسلے چیلوں کے یوں آباد ہوں

دیکھ تو سارد کو کیا خرسند ہے
ڈھڈو کو اس سے خوشی دو چند ہے

ہلتے کیا تیتر کے گھر شادی ہے آج
پپیناٹ غوغائی کے گھر آیا ہے راج

کبک کیا کیا مارتی ہے قہقہے
کیسی در تیبر کیدی ہے چہچہے

ہائے وہ مرزا کہ جس کا سن کے نام
آب ہو سیمرغ کا زہرہ تمام

سو کیا اس کو فلک نے یوں ذلیل
مرتے ہی چیپک کے بگڑا ہے یہ نیل

جب نکلتے گھر سے وہ بازار کو
تیز کرتے وال چھری کی دھار کو

دیکھ کر ان کے تئیں بنیئے تمام
بند کر آنکھوں کو کہتے رام رام

ان سے یہ کہتے اگر منظور دھرم
ہے تمہیں اور دھرم کی کچھ شرم

تو چھڑاؤ پھنکیوں کے جانور ‏ ‏ ‏ ‏ جتنے ہوں لپیٹے انھوں کے سج کر
بھیج دو جلدی نہ ہو ایسا کہیں ‏ ‏ ‏ ‏ کھولوں میں پتوار سے چپک کے تئیں
اس سخن کو جس گھڑی سنتے تھے وہ ‏ ‏ ‏ ‏ وہ ہیں کہتے تھے کہ جو چاہو سو لو
یہ تو بینے کیا ہیں کئی اک روز میں ‏ ‏ ‏ ‏ راجپوتانہ سے آئیں رشوتیں
جب ہے مرنا ہو گیا اس کا یقین ‏ ‏ ‏ ‏ ایک خرمہرہ کوئی دیتا نہیں

ذیل میں ایک حکایت منظوم بھی اس شاعر گرامی کی داخل کردی جاتی ہے یہ ترکیب حضرت سعدی کی بوستان کی ہے اگر حضرت سودا نے اس صنف شاعری کی طرف توجہ فرمائی ہوتی تو اردو میں ایک کتاب بوستان کا جواب ہو جاتی ؂

حکایت

سنا ہے کہ اک مرد اہل طریق ‏ ‏ ‏ ‏ نہایت رہی واقع ہوا تھا خلیق
صفت سے تواضع کی موصوف تھا ‏ ‏ ‏ ‏ کریمی کے عالم میں معروف تھا
غرض چاہیئے آدمی میں جو چیز ‏ ‏ ‏ ‏ رکھے تھا سبھی خوبیاں وہ عزیز
قضا کار مجلس میں ہوتا کہیں ‏ ‏ ‏ ‏ اُڑاتا نہ منہ سے مگس کے تئیں
کسی نے کیا اس سے اکدن سوال ‏ ‏ ‏ ‏ وضع سے کیا ہے تیرا آل
جو ملنے میں ٹک ہاتھ کے ہوئے کام ‏ ‏ ‏ ‏ تو حاصل اٹھانے سے تکلف نام
کہا راستی ہے جو تم نے کہا ‏ ‏ ‏ ‏ ولے اس سے یہ ہے مرا مدعا
کہ جس حال میں دوں اس کو اُڑا ‏ ‏ ‏ ‏ ہے ممکن کسی اور پہ بیٹھے جا
پس ہمت کے نزدیک ہے کیا بھلا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ میں اور پر ٹالوں اپنی بلا
غرض جتنے گزرے ہیں اہل کمال ‏ ‏ ‏ ‏ ہر اک کا سمجھتے تھے اپنا سا حال

تو کز محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

مثلث و مخمس

یہ دونوں تضمینیں ہیں عام اس سے کہ شاعر خود اپنے کلام یا کسی دوسرے شاعر کے کلام پر تضمین کرے مثلث عبارت ہے تین مصرعوں سے جس میں اول مصرع تضمین کا ہوتا ہے اسی طرح مخمس مراد ہے پانچ مصرعوں سے جس میں تین مصرعے تضمین کے ہوا کرتے ہیں یہ عرفی ترکیب مثلث اور مخمس کی ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے مثلث اور خمسہ کو ایسا ہونا چاہیئے کہ تضمین کے مصرعے اصل مصرعوں سے ایسے دست و گریباں ہوں کہ سرمو بھی ان کے آپس میں کوئی امتیازی امر لاحق نہ ہو یعنی تینوں یا پانچوں مصرعوں میں ایسی چسپانی پیدا ہو کہ اصل مصرعوں سے تضمین کے مصرعے نام کو بھی جدا نہ معلوم ہوں اکثر غزلوں پر تضمین کی جاتی ہے مگر مثلث کے اعتبار سے مخمس تضمین زیادہ دیکھی جاتی ہے سلاموں کی بھی تضمین ہوتی ہے اور زیادہ مخمس ہی ہوتی ہے

تضمین فارسی

ذیل میں حضرت حافظ علیہ الرحمہ کی ایک غزل کا خمسہ عرض ہوتا ہے

ہر کسے را در درون خلوت دل راہ نیست — ہر گدائے لائق قرب جوار شاہ نیست

حق شناسی کار ہر بد طینت گمراہ نیست — زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست

در حق ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

ایکہ مارا دست مطلب خالی از ہر مدعاست — در خور ہمت عاری ز اندازہ شال و قباست

بندہ پرور بار آلہا از تو نالیدن خطا ست　　ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ و کج اندازِ ماست

ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

جاہلاں در فکر شرب و شاہد و نقل و شراب　　آنکہ داناسینہ بریان و جگر خون دل کباب

فاش گویم بر ملا گو جرم باشد یا صواب　　صاحبِ دیوان ما گویا نمید اند حساب

کاندریں طغرا نشانے حسبۃً للہ نیست

از حریف حیلہ گر غافل کجا خواہیم ماند　　گرچہ با ما مہرہ ہا بر تختۂ حیات نشاند

اسپ ما را پیل دولت کے جلو خواہد نشاند　　تا چہ بازی رخ نماید بیرقی خواہیم راند

عرصۂ شطرنج رندان را مجال شاہ نیست

یہ مصرعے جناب حضرت سید شاہ عبد الودود صاحب کے ہیں آپ کا شیراز وطن ہے ترک دنیا کر کے ۱۰۶۵ھ میں اپنے دیس سے ہندوستان تشریف لائے پٹنہ میں ۳۲ برس تک قیام پذیر رہے بہت ذی علم اور ظاہرا صوفی مشرب تھے، فقر کی ساری باتیں اُن کی ذات بابرکات میں موجود تھیں کیمیا گر ہونے کا شبہ اُن پر لوگ کرتے تھے، کہتے ہیں کہ کسی شخص نے انھیں دنیاوی غرض سے مسموم کر ڈالا، وقت رحلت اُن کی عمر ۹۶ برس کی تھی۔ نور اللہ مرقدہٗ ؂

تضمین غزل مرزا فاخر مکین از مرزا رفیع سودا

ما خانۂ کس بہر مدارات نرفتیم　　جائے پئے گزراندن اوقات نرفتیم

این ننگ بخود کردن اثبات نرفتیم　　در دیر و حرم بہر مناجات نرفتیم

جز کوئے تو اے قبلۂ حاجات نرفتیم

بستیم اگر بہر طواف حرم احرام ما توبہ نہ کردیم دمے از مے گلفام
در میکدہ چوں ساختہ زنداں ہمہ را بد نام صد بار گرفتیم رہ کعبہ و یک گام
بے مصلحت پیر خرابات نرفتیم

آں شوخ ازاں روز کہ با ما شدہ باغی داریم دل غمزدہ چوں بلبل باغی
کو خرمی عید دریں سینۂ داغی صد عید شد و رفت در آشفتہ دماغی
ہرگز بہ کسے بہر ملاقات نرفتیم

جستیم بہ آفاق ہمہ روئے زمیں را دیدیم بہ ندیر فلک استاد حزیں را
برخاک درش رفتہ بسائیم جبیں را اشعار شنیدیم و ندیدیم مکیں را
مشغول صفاتیم و پے ذات نرفتیم

تضمین اُردو

اُردو میں غزلوں اور سلاموں پہ زیادہ تضمینیں دیکھی جاتی ہیں اُردو غزلوں اور سلاموں کے علاوہ فارسی غزلوں اور سلاموں پر بھی اُردو تضمینیں پائی جاتی ہیں، ذیل میں کچھ اُردو تضمینیں بشکل مثلث و مخمس ہدیۂ ناظرین ہوتی ہیں :-

مثلث اُردو

یہ مثلث میر پرورش علی مرحوم کا ہے آپ کڑا مانک پور علاقہ فتح پور ہسوا کے ساکن تھے سخی تخلص فرماتے تھے آپ کا زمانہ اور خواجہ آتش صاحب کا زمانہ ایک تھا، اُستاد مصحفی کے تقاضائے شعر گوئی کا شغل شروع کیا تھا صاحب دیوان

ہیں مگر آخر عمر میں نوحے اور سلام کہا کرتے تھے موسیقی میں پورا دخل رکھتے تھے بے انتہا خوش آواز بھی تھے اکثر پوربی زبان میں پاتی یعنی نامے تصنیف کرکے بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور رویا کرتے تھے، آپ سادات کرام سے تھے۔ اور مولوی وحید صاحب ممدوح بھی جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے سندی سادات میں سے تھے۔ میر پرورش علی صاحب جس وقت پٹنہ میں تشریف لائے تھے اِس تشریف اُن کا انتی سے متجاوز تھا آدمی بہت قدآور جسیم اور وجیہ تھے، ایک قطعہ آپ کا سابق میں درج ہذا ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں آپ نے جو اپنی غزل کو مثلث فرمایا ہے یہ بھی نذر ناظرین ہوتا ہے۔

مثال شمع ہم ثابت قدم ہیں سر کٹاتے ہیں
مزا کیا ضربت شمشیر قاتل کا اٹھاتے ہیں
شہادت کی جو ہم کو بھوک ہے تلوار کھاتے ہیں

وہاں سے قاصد آیا ہے کہ عزرائیل آتے ہیں
بڑا اندیشہ ہے دیکھیں کدھر فرقت میں جاتے ہیں
خدا پہلے بلاتا ہے کہ وہ پہلے بلاتے ہیں

کسی دن مہربانی اور عنایت پر جو آتے ہیں
یہ فرماتے ہوئے کوٹھے سے وہ جلوہ دکھاتے ہیں
کلیجا تھام لو کھڑکی کا پردہ ہم اٹھاتے ہیں

تعالیٰ شانہ کیا وقت ہے اور کیا زمانہ ہے
عجب اس عاشقی کا الٹا پلٹا کارخانہ ہے
ہمیں رو بیٹھے ہیں اُن سے وہ ہمیں اُن کو مناتے ہیں

ذرا سُننا کہ میرا ماجرا سننے کے قابل ہے
جہاں تھا بیٹھنا مشکل وہاں سے اٹھنا مشکل ہے
کہ پانوں کے انگوٹھے سے مرادامن دباتے ہیں

سنا تھی بے تحاشا جو زمیں پر منہ کے بل آئے
ابھی رو کا تھا اشکوں کو مگر باہر نکل آئے

یہ لڑکے کیا کسی کی بات کچھ خاطر میں لاتے ہیں

یہ کوئی بات ہے اپنی نگاہوں میں سمائے گا
فلک کیا چودھویں کا چاند تو ہم کو دکھائے گا
ہم ایسے طنطنت میں کل حسیں کا منہ دھلاتے ہیں

کریں اہلِ زمیں تدبیر کچھ اپنے مکانوں کی
فرشتوں سے کہو اب خیر مانگیں آسمانوں کی
وہ نالے کرتا ہوں جو عرش کے پائے ہلاتے ہیں

کوئی پوچھے تو ان سے اِس میں کچھ میرا بھی ہے مقصد
سُنی ہے صید آہو کے لئے کس شوخ کی آمد
سنی جو خار ہائے دشت پر آنکھیں بچھاتے ہیں

اُردو میں غزل حافظ شیراز کی تخمیس

عنادلِ گل رو سے تو گلعذار انند
اسیرِ دامِ بلائے تو دل شکار انند
غبارِ راہ وفائے شہسوار انند
غلامِ نرگسِ مست تو تاجدار انند
خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند

سمائے مدِ نظر تھے بہت نشیب و فراز
نہ کوئی واقفِ اسرار تھا نہ محرمِ راز
یہ کیا کریں کہ یہ ہے مقتضائے راز و نیاز
ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

خرامِ ناز سے پامال ہے جہاں یکسر
ہے عاشقوں کا ترے ساتھ ساتھ اک لشکر
رہے نہیں تجھے احوال پر کسی کے نظر
ز زیرِ زلفِ دوتا چوں نگہ کنی بنگر
کہ در یمین و یسارت چہ بے قرار انند

کہے ہے پیرِ مغاں دیکھنا یہ رنگِ سخن
ہے تازہ توبہ ابھی یاد کر شرابِ کہن

بکے ہے تیرہ درون واعظ اس کی بات پہ بن　　بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند

سیاہ پوش ہے اک خلق اک جہاں غمگیں　　وہ کون ہے کہ پریشان و خستہ حال نہیں
ہمارے کہنے کا تجھ کو اگر نہ آئے یقیں　　گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بہ بیں
کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار انند

ہمیں امید رہائی نہ آرزوئے خلاص　　نہ عادتِ تنگ و دو ہے نہ جستجوئے خلاص
ہے ناگوار بہت جی کو گفتگوئے خلاص　　ز دامِ زلفِ تو دل را مباد روئے خلاص
کہ بستگانِ کمندِ تو رستگار انند

ہے سر پہ خاک کلہ گرد ہے لباسِ بدن　　کدورتِ دلِ غمگیں عبیرِ پیراہن
غبارِ فرق سے آئینہ جبیں روشن　　ز نقشِ چہرہ حافظ ہمی تواں دیدن
کہ ساکنانِ درِ دوست خاکسار انند

یہ تخمیس اُستاد مومن خاں کی ہے۔ حافظ علیہ الرحمہ کے شعروں پر اُردو کے مصرعے لگائے ہیں مطلع میں فارسی کی تضمین سے چارہ نہ تھا؛

تخمیس غزل رندؔ از رندؔ

جسے کہ یاد نہ ہو اپنا آشیاں صیاد　　بھلا وہ خاک کہے حالِ بوستاں صیاد
عبث عبث تو نہ ہو مجھ سے بدگماں صیاد　　کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

خراب تھا مرے ہمراہ سایہ ساں صیاد　　چمن میں تھا کبھی بن میں رواں دواں صیاد

غرض کہ ساتھ ہی پہنچا جہاں نہاں صیّاد — جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیّاد
پھر اتلاش میں میری کہاں کہاں صیّاد

بتنگ کردیا دنیا کے کارخانے نے — بٹھایا خاک مذلت پہ سر اُٹھانے نے
پھنسایا لا کے کہاں حیف ابن ہانے نے — دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیّاد

کچھ اور مجھ کو شکایت نہیں یہ ہے یہ گلا — بہار کیا کہ خزاں میں چھوا نہ اک تنکا
عبث یہ او ستم ایجاد کیوں غضب توڑا — اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پر آسماں صیّاد

بیاں کر نہیں سکتا جو میری حالت ہے — حواس باختہ ہوں مجھ پر اک مصیبت ہے
ابھی ہوں تازہ گرفتار زور وحشت ہے — عجب قصہ ہے عجیب اک حکایت ہے
سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیّاد

کلام کرتا ہے وہ دل جو خوش آتا ہے — حکایت گل و بلبل مجھے سناتا ہے
ہر ایک بات میں سو سو طرح لبھاتا ہے — اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیّاد

خدا گواہ ہے تعریف ہو نہیں سکتی — زیادہ گھر سے ہے راحت مجھے قفس میں بھی
کب اس کی ذات سے اتنی مجھے توقع تھی — عزیز رکھتا ہے کرتا ہے خاطریں میری
ملا ہے خوبیٔ قسمت سے قدرداں صیّاد

میں اس کے دام میں آتا نہ زینہار اے رندؔ — یہ کشمکش نہ اٹھاتا میں زینہار اے رندؔ
کبھی قریب نہ جاتا میں زینہار اے رندؔ — قریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رندؔ

نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

حضرت رندؔ نے خود اپنی غزل کی تضمین حسب ارشاد امجد علی شاہ بہادر مرحوم کی ہے

میر تقی میر کی غزل کی تخمیس

میری وحشت کا جو کچھ حال سنا میرے بعد ہو گیا جوش جنوں حد سے سوا میرے بعد
سونا جنگل جو نظر اُس کو پڑا میرے بعد آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

باغ عالم میں وہ بلبل ہوں کہ ہوں جان چمن میں نہ ہوں گا تو نہ ہو گا کوئی خواہاں چمن
پھاڑ ڈالیں گے گریباں کو جواناں چمن منہ پہ رکھ دامن گل روئیں گے مرغان چمن
ہر روش خاک اڑائے گی میرے بعد

کیا کہوں اس سے کہ وہ تو ہے نہایت کمسن یاد کیا ہے کہ رہیں گے اسے طفلی کے دن
سب پہ ظاہر کیے دیتا ہوں میں حال باطن اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن
خوں رلائے گا اسے رنگ حنا میرے بعد

سنسناہٹ سی اک اٹھتی ہے بدن میں ہر صبح جان آ جاتی ہے گویا مرے تن میں ہر صبح
آہ بھر کر یہی کہتا ہوں کفن میں ہر صبح وہ ہوا خواہ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا تھا اور باد صبا میرے بعد

میں ہی دیوانہ اکیلا نہیں صحرا میں رہوں بعد میرے ابھی ہوویں گے بہت سے مجنوں
کتنے تلووں کا ابھی تجھ کو بہانا ہے خوں تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مرگیا جبکہ امانت تو پھری کچھ تقدیر　　غم ہوا اس کو بہت ہوگئی حالت تغیر
جیتے جی تو نہ خبر لی نہ ذرا کی تدبیر　　بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ تمیر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

مخمس سلام فصیح از مونس رحمہما اللہ تعالیٰ

السلام اے گہر معدنِ عالی النسبی　　السلام اے ثمرِ گلشنِ والا حسبی
السلام اے قمرِ برجِ رسولِ عربی　　السلام اے جگرِ فاطمہ و جانِ نبی
انتَ مولائیٰ فافدیک بامی و ابی

خسرو کون و مکاں حق نے تجھے کو لقب　　کس نے پایا ہے جہاں میں یہ حسب اور نسب
عابد و زاہد و معشوق خدا عاشق رب　　جگر شیر خدا جانِ شہنشاہِ عرب
فخر حمزہ شرف ہاشمی و مطلبی

کٹ گیا دشت مصیبت میں گلستان نبی　　چاک اس غم سے نہ کیونکر ہو گریبان نبی
کس طرح تر نہ رہے اشکوں سے دامان نبی　　جاں بقربانِ لب خشک تو اے جانِ نبی
پا رہت زیب لب کوثر و تو تشنہ لبی

لب رنگیں ترے اے بادشہ عالی جود　　رات دن جن پہ رہا ذکر خدا اے معبود
وا دریغا وہ ہوئے پیاس کی گرمی سے کبود　　آہ آن سینہ کہ آغوش نبی جالیش بود
پا نہد شمر برآں سینہ بایں بے ادبی

قبلہ خلق سمجھتے ہیں تجھے کعبہ پرست　　عرش اعلیٰ بھی ترے پایۂ رفعت سے ہے پست
ایک دن وہ تھا کہ تھی دوش محمد پہ نشست　　ایں چہ حال است کہ در خاک تنت عریاں ہست

کفن از خلد بیا ورد رسول عربی

تیری توقیر سے آگاہ ہے دنیا ساری
ہے رسولان سلف سے ترا پلہ بھاری
تو نے سر دے کے کیا دین کا سکہ جاری
اللہ اللہ کہ عجب رتبۂ عالی داری
آنکہ با حمزۂ شاہ شہدا ہم لقبی

کیا قیامت ہے کہ قبروں میں ہوئے دفن لعین
رہ گئی لاش تری بے کفن اے سرور دین
تن نازک پہ ترا ہے غضب اور گرم زمین
مگر از حال تو آگاہ نشد روح امین
مہد جنبان تو مے بود در ایام صبی

دل لرز جائیں جدھر ہو تری آواز بلند
سُن کے تقریر تری نطق فصیحوں کے ہوں بند
اے شہنشاہ زماں چھیڑ کے میداں میں سمند
رجز از بہر چہ خوانی ہمہ کس می داند
خسرو ملک حجازی شہ والا حسبی

چاہتا تو جو سپاہ ستم آرا کی شکست
جتنے سرکش تھے وہ اک آن میں ہو جاتے پست
لائے خنک او رنہ کچھ دل میں کوئی ظلم پرست
باز در سجدہ بہ بردم خنجر این است
مغفرت بہر غلامان ز خدا می طلبی

کام لکھا تھا ترے نام پہ جو روز الست
حق نے وہ ختم تجھی پر کیا اے حق پرست
جانتے ہیں یہ وہی جو ہیں مئے عرفاں سے مست
بخشش امت عاصی ز بیت خوں تو ہست
بہر آسائش امت تو بہ رنج و تعبی

فیض پاتا ہے ترے در سے ہر اک حاجتمند
تیری ہر بات ہے اللہ و محمدؐ کو پسند
نسل خورشید فلک بزم جہاں میں ہر چند
چاند وہ نور بلا شبہ و شک یکساں اند
تو ازاں ہا مگر اے نور خدا منتجبی

ہے بجا روحِ محمدؐ جو ہو تجھ سے گلہ مند
گوشۂ قبر میں پہنچائے ہیں زہرا کو گزند

باغِ فردوس ہے گھر حسنؑ کا وہ زنداں میں بند
آلِ یٰسین بر سن آل زیاد آزاد اند

وا دا اے چرخ جفا کار باین بوالعجبی

چھوڑ مت تو نس کی طرح الفت ضیائے قبیح
در رکھتا ہے تو مولا تجھے کر دیں گے صحیح

عرض کر چل کے تمنائے ولی پیش ضریح
قدر داں تو امام اتو حسینؑ است فصیح

پس چرا مطلب خود از دگراں می طلبی

مسدس

عروضی ترکیب مسدس کی یہ ہوتی ہے کہ ایک بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ چار مصرعے تو ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں مگر آخر کے دو مصرعے جو ٹیپ کے مصرعے کہلاتے ہیں پہلے چار مصرعوں سے علٰحدہ قافیہ رکھتے ہیں اردو میں اس عروضی ترکیب کی پابندی کے ساتھ تین قسموں کی شاعریاں ہوتی جاتی ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) واسوخت ۔ جیسے واسوخت امانت ۔ واسوخت مومن وغیرہ وغیرہ؛

(۲) مسدس حکمت آموز، جیسے مسدس کربلا ۔ مسدس حالی مدظلہ، وغیرہ وغیرہ؛

(۳) مراثی حال، جیسے مرثیہ ہائے میر ضمیر و مرزا دلگیر و میر انیس و مرزا دبیر و میر و نشر وغیرہ وغیرہ؛

واضح ہو کہ فارسی میں یہ قسمیں شاعری کی اس عروضی ترکیب کے ساتھ کمتر دیکھی جاتی ہیں اور اگر ہیں تو حسب مراد تصنیفیں راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری ہیں اس لئے فارسی کی کوئی ایسی تصنیف درج نہیں کی جاتی ہے اب حضرات ناظرین صرف اردو کی

مسدس نگاریوں پر نظر توجہ ڈالیں ؛

نمبر(۱) واسوخت

یہ ایک عاشقانہ رنگ شاعری کا ہے اور مسلسل طور پر غزل سے زیادہ اس میں موقع جذبات قلبیہ اور واردات ذہنیہ کی بندش کا حاصل ہے مگر افسوس ہے کہ کوئی واسوخت آج تک حسب مراد تصنیف نہیں ہوا، اس وقت تک جتنے واسوخت اُردو میں دیکھے جاتے ہیں نہایت پوچ خیالات سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، بلکہ اس قدر بے ربط خلاف فطرت اور پست مضمون ہیں کہ طبیعت اُن کے پڑھنے سے گریز کرتی ہے ایسے واسوخت کسی تعلیم یافتہ خوش مذاق شریف طبیعت پاک طینت شخص کو پسند نہیں آسکتے، ایسے واسوخت کے وہی حضرات قدر دان ہوسکتے ہیں جن کے دل و دماغ خیالات فاسد سے خراب ہوئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر عشق کی تفضیح کی سیر کسی کو دیکھنا ہو تو اُردو کے واسوختوں کو دیکھیے فقیر کی دانست میں اُردو کا جو بہترین واسوخت سمجھا جاتا ہے وہ عشق کی تفضیح کا بڑا سے بڑا کارنامہ ہے جس واسوخت کو دیکھیے اس میں عشق تمامتر فسق کے پیرایہ میں دکھلایا گیا ہے۔ واسوخت میں عموماً اسی طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں جو قابل اعادہ منقضو نہیں ہیں مگر مثالاً اصلاح مذاق کے خیال سے مدرج ذیل ہوتے ہیں ؛

پہلے شاعر صاحب اپنے ایسے زمانہ کو بیان فرماتے ہیں جب انھیں عشق سے سروکار نہ تھا معشوق کے نام سے اُنھیں وحشت ہوتی تھی، مگر اُن کا ایک دوست تھا جو مبتلائے عشق ہو رہا تھا اس شاعر صاحب نے پوچھا تو جو عاشق ہے تو

یہ بتا کہ عشق کیا چیز ہے۔ دوست صاحب نے فرمایا کہ نہایت تعجب کی بات ہے
کہ تُو نے کبھی دل کسی کو نہیں دیا۔ شربتِ وصل نہیں پیا۔ کسی سے ہم بغل نہیں ہوا لذت بوس و
کنار سے واقف نہیں ہوا اپنے دوست سے ایسی تقریر سن کر شاعر صاحب کے دل میں عشق جگہ
کر گیا اسی کا سودا پیدا ہو گیا کہ عشق کرنے کے واسطے کسی خوبصورت کو ڈھونڈ نکالیے
اب ہمہ تن شاعر صاحب تلاش معشوق کی نظر سے جانے لگے۔ کہاں گئے کہاں۔ گئے
آخر ایک معشوق نظر آ گیا اب حسن کے وصل کی فکر میں اس کے کوچہ میں روز جانے لگے
اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے لگے پھر اشارہ بازی شروع کی پھر اس سے
اس کے گھر کے اندر جانے کی تمنا دکھلائی، وہ معشوق بھی چونکہ کسی اصول زندگی کا پابند نہ
تھا اس نے شاعر صاحب کو اندر گھر کے بلا لیا۔ گھر کے اندر کچھ بے سروپا گفتگو آپس میں ہوتی
گئی اس روز سے عاشق معشوق ساتھ رہنے لگے شاعر صاحب نے اپنے معشوق کو معاشرت
کے طریقے بتلائے لباس و آرائش کے ڈھنگ سکھلائے جب کچھ روز اس طرز پر گزرے اور شاعر صاحب
کی بعیش سے گزرنے لگی تو ان کے معشوق نے پہلے پوشیدہ طور سے پھر کھلے ڈلے رنگ،
پر اغیار کے گھر جانا شروع کیا ایسے معشوق سے اور کس چیز کی امید ہو سکتی تھی ایسا معشوق
ایسا نہیں کرتا تو کیا کرتا۔ بہر حال بے چارے شاعر صاحب نے اس آوارہ مزاج معشوق
کو بہت سمجھایا اپنے احسانات جتائے۔ ذکر احسانات میں یہ بھی فرمایا کہ تو فنِ معاشرت
سے بالکل بے بہرہ تھا تجھ کو لباس پہننا نہیں آتا تھا۔ چوٹی کنگھی کے طریقہ سے تو
کچھ بھی واقف نہ تھا۔ تجھے مسی لگانا نہیں آتی تھی گفتگو کا طریقہ تجھے کچھ نہیں معلوم
تھا، یہ سب کمالات تجھ میں میری بدولت پیدا ہوئے جب تو سب کچھ مجھ سے سیکھ
چکا تو اب میرے پاس نہیں رہتا ہے۔ دس دس روز دن تک غیر دل میں پڑا رہتا ہے خیر

شاگرد احسان فراموش کب اُستاد کی سنتا ہے بیچارے شاعر کی فہمائشیں کچھ کارگر نہیں ہوئیں اور وہ آوارہ مزاج معشوق مبتلائے بدحالی رہا، تب شاعر صاحب نے ایک اور معشوق پیدا کیا جس کے ساتھ شب و روز صحبت گرم رکھنے لگے پھر حضرت نے معشوق سابق کو اپنے اس نئے معشوق کی خبر کی اور اس کے کمالات صوری و معنوی اس پر یعنی معشوق سابق پر ایک بیان طولانی کے ساتھ ظاہر کیے اس سے معشوق سابق کے دل میں غایت کی آگ جو اٹھی دوڑ کر شاعر صاحب کے گلے لگ گیا اور پوچھنے لگا کہ واقعی تم نے کوئی نیا معشوق پیدا کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تم سے میں انحراف ورزی نہ کروں گا جب وہ قسم کھا چکا تو شاعر صاحب نے بھی قسم کھائی کہ صرف تجھ کو چھیڑنے کے لیے نئے معشوق کا قصہ گڑھا تھا اس روز سے معشوق سابق کے ساتھ شاعر کی پھر عیش سے گزرنے لگی :۔

حضرات اہلِ مذاق میری اس سمع خراشی کو معاف فرمائیں، ظاہر ہے کہ سارا قصہ بالا طومار خرافات ہے اس کے جتنے مضامین ہیں غیر فطری مہمل اور ناپاک ہیں اگر اسی کا نام واسوخت نگاری ہے تو ایسی شاعری پر سو سو نفرین حضرات شاعری کوئی بیکار شئے نہیں ہے اس سے دنیا اور دین دونوں کو نفع پہنچ سکتا ہے یہ کون سی شاعری ہے۔ جس سے نہ دنیا کا فائدہ حاصل ہو اور نہ دین، کا یہ شاعری کیا ہے یہ تو اوباشی کا ہدایت نامہ ہے اوباش سے اوباش شخص اس سے اور زیادہ کیا کر سکتا ہے۔ تعجب ہے، اُن اشخاص سے جو ایسے واسوخت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں اور ایسی بدنیال سریوں کو شاعری سمجھتے ہیں جب خدائے تعالیٰ کسی قوم پر ادبار نازل کرتا ہے تو پہلے اس کے اخلاقی انداز خراب ہو جاتے ہیں ایسی شاعریاں معاذ اللہ قوم کے کس درجہ ابتذال سے خبر دیتی ہیں ارحمنا یا ارحم الراحمین اگر کاش صحت مذاق کے ساتھ کوئی واسوخت

لکھا گیا ہوتا تو اردو میں عاشقانہ شاعری کا عجب تماشا نظر آتا، چونکہ غزل کے اعتبار سے واسوخت کا دائرہ وسیع تر ہے اس میں جذباتی مضامین زیادہ گنجائش کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں اگر شعرائے حال غیر فطری مہمل اور ناپاک مضامین سے بچ کر واسوخت نگاری مذاق صحیح کے ساتھ فرماویں تو اردو کی شاعری کی بڑی ترقی متصور ہے یہ میدان حضرات شعرائے باکمال کی توجہ کے قابل ہے داخلی (SUBJECTIVE) شاعری غزل سرائی کے اعتبار سے واسوخت نگاری کے طریقہ پر زیادہ وسعت کے ساتھ برتی جا سکتی ہے۔

نمبر ۲ مسدس حکمت آموز

اس عروضی ترکیب کے ساتھ دو تصنیفیں بہت قابل توجہ ہیں ایک تو مسدس کریما اور دوسرا حالی. کریما برائے خود شیخ سعدی کی ایک لاجواب تصنیف ہے اس کے اشعار کی تضمین جو نظیر اکبرآبادی سے ہے مضامین کے اعتبار سے اچھی ہے۔ اچھے شعر کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی تضمین بھی اچھی ہو:

راقم الحروف کی دانست میں ہر شخص کو چاہیئے کہ ایک بار نظیر کے اس مسدس کو پڑھ لے اور لڑکوں کو ضرور پڑھائے۔ کریما کے پہلے شعر کی تضمین جو اس فطری شاعر کے افکار سے ہے درج ذیل ہوتی ہے:

صد دل سے اے مومن پاکباز   وضو کر کے پڑھ پنج وقتی نماز
بوقت مناجات با صد نیاز   تو کر اپنے ہاتھوں کو کر کے دراز

کریما ببخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

جس وقت میں تضمین بالا کو پڑھتا ہوں تو مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب مسلمانوں میں نماز

ایک ضروری فرض خداوندی سمجھی جاتی تھی اور بے نماز کو پیران اسلام گمراہ اور قابل احتراز سمجھتے تھے اور اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ نماز گذار ذلیل اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے یورپین تعلیم کا یہی تقاضا ہے کہ نماز روزہ حج خمس اور زکوٰۃ کو نئی روشنی والے لایعنی فعل سمجھتے ہیں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یورپین تعلیم کا وہی اثر یورپین عیسائیوں پر ہوتا ہے جو مسلمانوں پر ہوتا ہے یعنی یورپین عیسائیت بھی اسی قدر ضعیف ہو جاتی ہے جیسا کہ یورپین تعلیم سے مسلمانوں کے اسلام میں ضعف آجاتا ہے، میں اس جگہ مسلمانان ہند کی نسبت عرض کر رہا ہوں ترک، ایران کے مسلمان یورپین تعلیم پاکر کیا ہو جاتے ہیں مجھے اس کی خبر نہیں ہے یورپین تعلیم کے مسلمان سو میں ایک ہی دو ایسے نظر آتے ہیں جو پنج وقتی نماز کے پابند ہیں، ورنہ پنج وقتی نماز تو درکنار عید کے نمازی بھی ایسے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں قریب قریب ندارد ہیں، یورپین تعلیم جو عیسائی اور مسلمانوں دونوں کو اپنے اپنے مذہب میں ضعیف کر دیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم خس برابر بھی روحانی انداز نہیں رکھتی ہے یہ تعلیم سراسر مادیات سے تعلق رکھتی ہے اس تعلیم کو معاد سے کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ اس تعلیم کی غرض معاش ہی معاش ہے، تعجب ہے کہ اس نقصان عظیم پر بھی یہ تعلیم بنی آدم کے لیے مفید سمجھی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے زمانہ کے نزدیک انسان بے روح بنا ہے اور جب بے روح اس کی خلقت واقع ہوئی ہے تو اس کو روحانی تعلیم کی کیا حاجت ہے میری دانست میں تمام یورپ کی حالت قابل گریہ ہے کہاں ہیں حضرت مسیح، اپنی دنیا طلب امت پر نوحہ کیوں نہیں فرماتے، کہاں اس جناب کی روحانی تعلیمات اور کہاں آپ کی امت کے تعلقات مادی مصرع "بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا" اے نوجوان مسلمانو تم بالیقین جاگو کہ تمہاری تعلیم کی غایت میز کرسی چھری کانٹا کوٹ پتلون نہیں ہے افسوس ہے کہ تم

اپنے روحانی معاملات سے غافل بیٹھے ہو، تم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تم کو دنیا اور دین دونوں سے یکساں تعلق ہے، صرف دنیا کے ہو رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔ فرائض خدا کی پابندی ایک ضروری امر ہے مرد آخر بین مبارک بندہ ایست۔

دوسرا حکمت آموز مسدس شمس العلماء مولانا حالی مدظلہ کا ہے، یہ مسدس مسلمانوں کے سابق اور موجودہ حالات کی تصویر ہے اور غرض اس تصنیف کی یہ ہے کہ مسلمانان حال جو مبتلائے بدحالی ہیں ترقیوں کی راہیں اختیار کریں جس سے دنیا کی سر بر آوردہ قوموں کی طرح ان کو بھی خوش حالی نصیب ہو، مسدس نامطبوع رنگینیوں سے تمام تر پاک ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ مولانا حالی کے سوا کوئی شاعر ایسا مسدس لکھ بھی نہیں سکتا تھا ایسے مسدس کے لکھنے کے واسطے شاعر کو تاریخی معاملات سے پورے طور پر باخبر ہونا ضروری ہے، علاوہ اس کے اس کو مبالغہ تشبیہہ استعارہ وغیرہ کی طرف فطری طور پر کم میلان ہونا چاہیئے، واقعی یہ مسدس "ایک ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن" ہے اور ایسا ہی ہے کہ ہر گز بریانی اور مرغ مسلّم پکانے والے طعام پز سے پک نہیں سکتا، میں اطمینان کے ساتھ عرض کر سکتا ہوں کہ میر مومن غالب آتش اور دیگر رنگین طبع شعراء ہر گز ایسی مسدس نگاری پر قادر نہیں ہو سکتے تھے ان کی اعلیٰ رنگین مزاجی ایسی سادہ تصنیف پر ان کو نہیں قادر ہونے دے سکتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے ہی طرح مولانا حالی اگر اساتذہ بالا کے مقابلہ میں غزل سرائی کے میدان میں گوے سبقت لے جانا چاہتے تو ہر گز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ میرے اس بیان کی تائید خود مولانا کا دیوان کرتا ہے۔

ذیل میں کچھ بند مسدس حالی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں

بیان ملک عرب و بعثت آں صلعم

عرب جس کا مذکور ہے یہ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند اس کا جدا تھا
نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی تھی رُوح پرور
کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر
کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
بدقت بسر ہوتی تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
لوؤں کی لپٹ باد صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں
کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں
نہ صحرا میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی
خدا کی زمیں بن جتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا
کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا

بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا
بتوں کا عمل سو بسو جا بجا تھا
کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیلؑ ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا
وہ تیرتھ تھا اک بُت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزّیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہر انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لُوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک ایسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی ۔۔۔ صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی ۔۔۔ تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا ۔۔۔ کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا ۔۔۔ کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر ۔۔۔ تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور ۔۔۔ کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی ۔۔۔ شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی ۔۔۔ غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی
بہت اس طرح گزری تھیں ان کو صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت ۔۔۔ بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت ۔۔۔ چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت — کہ طالع ہوا ماہِ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت — کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت

یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰی
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا — اللھم صل علی محمد و آل محمد

نمبر ۳ - مراثی

اس زمانہ میں مراثی بشکل مسدس لکھے جاتے ہیں۔ میر ضمیر مرحوم کے عہد کے پہلے اس کی عروضی ترکیب مربع اور مخمس کی ہوا کرتی تھی۔ جاننا چاہئے کہ عہد میر انیس سے اردو میں مرثیہ نگاری شاعری کی دشوار ترین صنف شاعری ہوگئی ہے اور اس کا درجہ اس قدر رفیع ہوگیا ہے کہ اس کے ذکر کے ساتھ ہومر و رجل ملٹن و الملکی بیاس اور فردوسی کی رزمی تصنیفات کا ذکر اتفاقاً نہایت قرین عمل دکھلائی دیتا ہے فارسی میں یہ صنف شاعری

کی گویا ندارد ہے، اہل ایران کی مرثیہ نگاری اُردو کی مرثیہ نگاری کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے میر انیسؔ کے مراثی معاملات محمد آل محمد سے تعلق رکھتے ہیں، ان معاملات کو دینی حیثیت کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے مصائب کشی کی بنیاد پر ممتاز ترین ان معاملات سے واقعہ کربلا ہے اس واقعہ کے سمجھنے کے لیے اسلام کے تاریخی معاملات تمدن و مذہب سے پوری واقفیت کا حاصل رہنا ایک امر ضروری ہے مگر یہاں ایسے معاملات کے درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے پس جن حضرات کو اس واقعہ عظیمہ کے اسباب ما تبعلق بہا پر نظر ڈالنا منظور ہو تو فقیر کی کتاب معروف بہ نذر آل محمد کو ملاحظہ فرمائیں۔

میر انیسؔ صاحب کی شاعری

میر انیسؔ صاحب ہندوستان کے اردو بولنے والے حصوں میں مرثیہ نگاری کی شہرت رکھتے ہیں، جاننا چاہیئے کہ میر صاحب کی مرثیہ نگاری ایک رزمی مرثیہ نگاری ہے یہ اس لیئے کہ واقعہ کربلا کی مرثیہ نگاری رزمی شاعری کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے پس حضرت کی شاعری کا شمار ہومر ورجل ملٹن فردوسی او بیاس کی شاعروں کے ساتھ ایک ضروری امر ہے جس طرح یہ سب شعرائے نامی رزمی مضامین حوالۂ قلم کرتے گئے ہیں میر صاحب بھی اسی طرح رزمی مضامین کو تقاضائے واقعہ کے باعث اپنے مراثی میں کثرت کے ساتھ جگہ دیتے گئے ہیں ایسی حالت میں میر صاحب کو شعرائے مسبوق الذکر کی طرح رزمی شاعر کہنا بے محل نہ ہوگا واضح ہو کہ انگریزی میں رزمی شاعری کو ایپک پوئٹری (EPIC POETRY) اور رزمی شاعر کو ایپک پوئیٹ (EPIC POET) کہتے ہیں پس میر صاحب اصطلاح انگریزی کے مطابق ایک ایپک پوئیٹ تھے مگر کس درجہ کے ایپک پوئٹ تھے اس کی حقیقت راقم کی آئندہ

کی تحریروں سے منکشف ہو گی ؎

راقم اس وقت تک صرف ہومر ورجل اور فردوسی کی رزمی شاعریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے ملٹن والمکی اور بیاس کی رزمی شاعریوں پر اسے بلائے زنی کا ابھی تک موقع نہیں ملا ہے اگر حیات نے وفا کی ان شعرائے نامی کے کلام پر بھی انشاء اللہ تعالیٰ ریویو کی نوبت آ ہی جائے گی بہر حال ان تینوں شعرائے نامی یعنی ہومر ورجل اور فردوسی میں صرف ابوالشعراء ہومر ہی ہے جس کے ساتھ میر صاحب کا موازنہ صورت رکھتا ہے ورنہ ورجل جو ہومر کا متبع ہے میر صاحب کا ہرگز ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ اس ہم پایگی کا استحقاق فردوسی کو حاصل ہے میر صاحب کو فردوسی ہند کہنا بے شک میر صاحب کی ایک بڑی ناقدر شناسی ہے حضرات ناظرین راقم کے اس ریویو پر نظر غور ڈالیں جسے اس نے کتاب شاہنامہ پر سابق میں لکھا ہے تب طالبان تحقیق پر روشن ہو جائے گا کہ فردوسی میں اور میر صاحب میں کیا فرق حائل ہے میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے اس افزونی کی وجہ یا یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس قوت شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب کو سبجکٹ (SUBJECT) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہاتھ لگا ہے جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا ہے اس واقعۂ عظیمہ کے ساتھ واقعہ دیر ٹرائی کو کوئی نسبت نہیں ہے شاہزادہ ٹرائی کا قصہ ایک ناپاک قصہ ہے اور ہرگونہ قابل نفرین ہے یہ ہومر ہی کی قابلیت شاعری تھی جس نے اسے قابل توجہ بنا دیا ہے ورنہ شاہزادہ ٹرائی کے قصہ میں کوئی ایسی عظمت کی بات نہیں پائی جاتی ہے جس کی طرف اہل مذاق کو کسی طرح کی رغبت خاص پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے

کربلا کا معاملہ ہے کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے امور دین اخلاق امور تدبیر المنزل اور امور سیاست مدن وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ایسے معاملات کی طرف توجہ کرنا ہر دانشمند اور ہر ذی علم ہر حکیم اور فلسفی کا کام ہے۔ یہ واقعہ معاملات عالم کی تمام خوبیوں کا خلاصہ ہے پس کچھ تعجب نہیں اگر میر صاحب کی شاعری کو اس طرح کے ارفع مضامین نے ایک بیقیاس مدد دی ہے جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عمدہ سبجکٹ کے دستیاب ہونے سے میر صاحب ہومر سے سوا میر معلوم ہوتے ہیں۔ لاریب یہ امر میر صاحب کے مرجح سمجھے جانے کا ایک بڑا سبب دکھائی دیتا ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے بھی راقم کی دانست میں میر صاحب کی کیریکٹر نگاری ہومر کی کیریکٹر نگاری سے بڑھی معلوم ہوتی ہے اگر رائے راقم کی صحیح ہے تو ایسی صورت میں شاعر ہونے کی حیثیت سے میر انیس صاحب ہومر پر فوقیت رکھتے ہیں میر صاحب کی کیریکٹر نگاری کی بحث آئندہ آنے کو ہے +

میر انیس کے معاملات شاعری واقعہ کربلا ہر پہلو سے ایک اہم امر دکھائی دیتا ہے جس کو اپنا سبجکٹ بنانے کے لیے لاریب میر انیس صاحب شائستہ ترین شخص نظر آتے ہیں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے میر صاحب کے مراثی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ایک فطری امر ہے نہ کہ کسبی نہیں ہے اگر کسبی ہوتا تو ہر شخص جو پڑھا لکھا ہے۔ میر صاحب کا کمال پیدا کر لیتا۔ بلاشبہ و بلاشک میر صاحب وہ الہامی شاعر گرامی ہیں کہ تائید غیبی کے بغیر میر صاحب کا کمال کوئی بنی آدم پیدا نہیں کر سکتا ہے یہ امر راقم کے داخل عقیدہ ہے کہ شعراء خدا کے شاگرد ہوتے ہیں اور جو ان میں زیادہ صلاحیت شاعری کی رکھتا ہے اس کے ساتھ زیادہ تائید غیبی شامل حال ہوتی ہے۔ ہر ملک میں شعرا مورد الہام ہوا کرتے ہیں شکسپیئر کی روح جو ارواح مؤانی کے ذریعہ سے طلب کی گئی تو شکل ہو کر اس نے

بیان کیا کہ فلاں فلاں ([illegible]) ہم نے محض الہامی طور پر حوالۂ قلم کئے ہیں ان پہلے کی تحریر کے وقت مجھے کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں البتہ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تائید غیبی میرا ساتھ دے رہی ہے اور میں لکھ رہا ہوں مگر کیا لکھ رہا ہوں اس کو سمجھ نہیں سکتا تھا میرے خیال میں میر صاحب کا بھی حال دم مرثیہ نگاری ایسا ہی ہوتا ہوگا کہ تائید غیبی جنبش قلم میں پیدا کرتی ہوگی اور میر صاحب بند پر بند لکھے جاتے ہوں گے، جو حضرات تائید غیبی کے قائل نہیں ہیں لازم ہے کہ ارواح خوانی کا فن سیکھیں، میں بھی ایک زمانہ میں الہام و تائید غیبی، دعوت ارواح و استمداد ہمت سے انکار رکھتا تھا مگر الحمد للہ کہ پہلے کے وہ سب ملحدانہ خیالات ائمہ معصومین کی روحانی تعلیمات کی بدولت رفع دفع ہو گئے اب میں بدیہیات کی طرح مانتا ہوں کہ ائمہ معصومین اپنے غلاموں کی ہر طرح پر تائید کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، میں اب شیخ نجدی کے اس خیال کا ہرگز شریک نہیں ہوں جس کو اس نے اپنی غایت شامت سے قبر رسالتمآب پر ظاہر کیا تھا اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جب یہ تنگ حوصلہ ظاہر بیں خود پرست قبر شاہنشاہ کونین پر گیا تو اس نے نہایت بے ادبانہ انداز سے قبر پاک کی طرف رخ کر کے یہ کہا کہ "اے وہ شخص جو اس میں مدفون ہے اس وقت تجھ سے میرا عصا بہتر ہے" اس راندہ درگاہ کو نہیں معلوم ہو سکا کہ انبیاء و اوصیا بعد وفات بھی احیاء کا حکم رکھتے ہیں اس کمبخت نجدی کے دماغ میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ سرور کائنات جب رحلت حیات فرما چکے تو خاک ہو گئے پس خاک ہو کر اس جناب میں کیا باقی رہ گیا، پس آنحضرت سے اس شامتی نجدی کا عصا ضرور بہتر ہو گا معلوم ہوتا ہے کہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب نے ایسے ہی نجدیوں میں تعلیم پائی ہے جو رسول و آل رسول کے مقابلہ میں ایسی بے ادبیوں سے پیش آتے ہیں لاحول

ختم لاحول: یہ بات کوئی تعجب کی نہیں ہے جب میں بھی شیخ نجدی کے پیروؤں میں تھا، تو ایسی طرح کی شرارت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ خیر۔ جاننا چاہیئے کہ شعرار کو تائید غیبی ضرور شامل حال ہوا کرتی ہے۔ میر انیس صاحب کا موید من اللہ ہونا ایک امر یقینی ہے اگر بلا تائید غیبی کوئی شخص میر صاحب کے برابر کا شاعر ہونا چاہیئے تو کوستان ہوکر دیکھ لے میر صاحب کے کلام میں اس قدر خوبیاں ہیں کہ خود میر صاحب اپنے کلام کی تصنیف کے وقت اُن سے غبر نہیں ہوتے ہوں گے بعد تصنیف جب اپنے کلام معجز نظام پر نظر ڈالتے ہوں گے تو اس پر بھی بہت سی خوبیاں ان کے کلام کی ان سے مخفی رہ جاتی ہوں گی، الہامی کلام کا یہی حال ہوتا ہے کہ وقت تصنیف کہنے والا اُن کی تمام خوبیوں پر اطلاع نہیں پاتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہنے والے کو تمام عمر اپنے کلام کی بہت سی خوبیوں سے بے خبری رہ جاتی ہے میں مثالاً ایک شعر میر صاحب کا اس موقع پر درج کرتا ہوں جس کی نسبت میرا گمان یہی ہے کہ میر صاحب خود اس کی تمام خوبیوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے وہ شعر یہ ہے سے

طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہ شعر مضامین صبح سے تعلق رکھتا ہے مگر اس شعر سے ہی شخص حسب مراد متلذذ ہو سکتا ہے جو علم حیوانات سے باخبر ہے علم حیوانات سے مراد وہ علم ہے جس کو انگریزی میں (ZOOLOGY) کہتے ہیں اس علم کی دلالت سے انسان تمام حیوانات روئے زمین کی بیمی کیفیتوں سے بحد طاقت بشریہ اطلاع پا سکتا ہے یہ علم کوئی ظنی یا خیالی نہیں ہے اس علم کی بنا تحقیق پر واقع ہوئی ہے اس لیے کہ اس کے مسائل تفحص اور استقرا کے ذریعہ سے تنقیح پاتے گئے ہیں اور اس بنا پر یہ علم تمامتر علم کا حکم رکھتا ہے یہ علم مسلمانان

ہند سے بالکل جاتا رہا ہے، اس وقت اس علم کی کوئی حسبِ مراد کتاب عربی فارسی
یا اردو میں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ عربی میں علامہ فخر الدین رازی کی کتاب موالید ثلاثہ ہے جس
میں علم حیوانات سے علامہ موصوف نے بحث کی ہے مگر وہ ایک ناکافی ہی تصنیف ہے
اور اس عہد کے لیے کوئی بھاری سرمایہ تحقیق نہیں ہے، بلاشبہ حضرات علمائے ہند تمامتر
اس علم سے ورہیں صرف دور ہی نہیں ہیں بلکہ اس علم کو چنداں قابل توجہ نہیں سمجھتے ہیں
صرف وہی اشخاص ہندی اس علم سے مناسبت رکھتے ہیں جنہوں نے ہندوستان
یا انگلستان میں انگریزی یا اور کسی یورپین زبان کے ذریعہ سے اس علم کی تحصیل کی ہے
اردو میں جو کتاب عجائب المخلوقات دیکھی جاتی ہے وہ ایک لغو کتاب ہے اور علم
حیوانات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ خیر میر صاحب کے شعر بالا سے وہی شخص
لذت یاب ہو سکتا ہے جس کو علم حیوانات سے بہرہ حاصل ہے۔ جاننا چاہیئے کہ
صبح کے وقت طیور کو ہوا کے ساتھ محویت رہتی ہے، یہ محویت طیور کو ہوا کے ساتھ
دوپہر یا شام کو نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح کو طیور کو اس کی حاجت نہیں ہوتی ہے
کہ قبل اس کے کہ وہ تلاش رزق میں اُڑیں اپنے بازوؤں کو پرواز کے قابل بنالیں
شب بھر بے کار رہنے سے اُن کے بازو مشق تازہ کے محتاج ہو جاتے ہیں اس لیے
کچھ طیور تو آسمان میں گھنٹے آدھے گھنٹے تک ادھر اُدھر پر مارتے پھرتے ہیں اور
کچھ جنگلوں اور باغوں میں ورزش کی ترکیب سے جھاڑی جھاڑی اور درخت درخت اُڑتے پھرتے
ہیں، اس ریاضت کی محتاجی تمام ایسے طیور کو ہوتی ہے جن کو اپنی پرواز کے ذریعہ سے
دن بھر سامان رزق بہم کرنا ہوتا ہے۔ زیادہ طیور ایسے بھی دیکھے جاتے ہیں جن کی رزق یابی
کا مدار ان کی پرواز ہے پس صبح کو طیور کا محو ہوا ہونا ایک فطری امر ہے اور کس قدر تحقیقات

علم حیوانات قرین ہے ہرن کو صبح کے وقت سبزہ زار کے ساتھ محویت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس قسم کے ہرن کو صبح کے وقت سبزہ زار کے ساتھ محویت ہوتی ہے وہ بیشتر سبزہ زار ہی میں رہتی ہے جنگلوں میں نہیں رہتی، چونکہ اس قسم کے ہرن شب کو چری نہیں کرتے ہیں اور چری کے عوض شب بھر جگالی کیا کرتے ہیں، صبح ہوتے نہایت بھوکے ہو جاتے ہیں پس صبح کے ہوتے چری میں مشغول ہو جاتے ہیں چونکہ صبح کو انھیں بھوک کی شدت پیدا ہو جاتی ہے، بھوک اُن کو سبزہ زار کے ساتھ محویت پیدا کر دیتی ہے یہ ہرن اقسام غزال سے ہوتے ہیں ان کے نر کے صرف دو شاخیں خم بخم سر پر ہوتی ہیں۔ اور بیشتر یہ ہرن صحرا پسند ہوتے ہیں اور قسمیں ہرن کی یا پہاڑوں میں رہتی ہیں یا جنگلوں میں صبح کے وقت یہ قسمیں سبزہ زار کی طرف نہیں رخ کرتی ہیں اس لیے کہ شب کو چری کر کے آسودہ رہتی ہیں برخلاف غزالوں کے جو شب کو چری نہیں کرتے اور جن سے مراد شاعر شعر بالا میں ہے دوسرے مصرع میں میر صاحب جنگل کے شیر کے ہو نکنے کا ذکر فرماتے ہیں اور اس کے ہو نکنے کی جگہ کو کچھار قرار دیتے ہیں، سبحان اللہ سبحان اللہ کیا تناسب کلام ہے عالم علم حیوانات کے سوا کون شخص ایسا پیرایہ بیان اختیار کر سکتا ہے جائے لحاظ ہے کہ اس شاعر گرامی نے صرف شیر کا مذکور نہیں فرمایا، بلکہ "جنگل کے شیر" کی قید لگا دی۔ جاننا چاہیے کہ شیر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک کا مسکن پہاڑ ہوتا ہے اور دوسرے کا جنگل، عادات و خواص میں بھی یہ دونوں قسم کے شیر موافقت نہیں رکھتے، مزاج بھی دونوں کے دو طرح کے ہوتے ہیں اور معاشرت کے طور بھی دونوں کے جدا گانہ دکھائی دیتے ہیں، پہاڑی شیر رات بھر تلاش رزق میں اِدھر اُدھر پھر کر صبح کو پہاڑ کے کسی غار میں جو اس کا مسکن ہوتا ہے، جا چھپتا ہے اور شام کے قریب تک سوتا رہتا ہے، پھر شام ہوتے تلاش رزق میں نکلتا

یہ شیر کچھار سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، مگر جو جنگل کا شیر ہوتا ہے وہ دن کچھار ہی میں بسر کرتا ہے اور صبح کو بستی پر ہونکا کرتا ہے، راقم نے دونوں طرح کے شیر دیکھے ہیں اور شکار بھی کیے ہیں، لاریب علم حیوانات کی اطلاع اور ذاتی معلومات کے حاصل رہنے سے میر صاحب کا یہ شعر ان کے پڑھنے والے کو عجب لطف کلام بخشتا ہے راقم کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ میر صاحب علم حیوانات سے واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں زیادہ قرینہ یہی کا ہے کہ اس علم کے غیر مروج ہونے کے باعث حضرت کو اس کی تحصیل کا موقع نہیں ملا تھا، یہ بھی راقم کو نہیں معلوم ہے کہ حضرت سفر شکار اختیار فرمایا کرتے تھے یا نہیں زیادہ تو اسی کا قرینہ ہے کہ سیر و شکار کی طرف توجہ فرمانے کا کم موقع رکھتے تھے مگر علم حیوانات کی بڑی اطلاع سے جو یہ شعر خبر دیتا ہے اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ میر صاحب کو الہامی طور پر ایسے ایسے مضامین دستیاب ہوا کرتے تھے

کیریکٹر نگاری کی بحث راقم نے شاہنامہ کے لگاؤ میں کی ہے فردوسی کی کیریکٹر نگاری کا نقص دکھایا جا چکا ہے اسی کے ساتھ ہومر کی کیریکٹر نگاری کی خوبیاں بھی نہ صرف شاہنامہ کے لگاؤ سے دکھلائی جا چکی ہیں بلکہ خود ہومر کی شاعری کے بیان میں حوالہ قلم ہو چکی ہیں لاریب ہومر کی کیریکٹر نگاری بہت اعلیٰ درجہ کی ہے اور ایسی ہی ہے کہ اس کی کیریکٹر نگاری کی بنیاد پر ڈراما جیسی صنف شاعری کا ایجاد ظہور میں آیا، اب ہم میر انیس صاحب کی کیریکٹر کی خوبیوں کو عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خوبیاں دشوار پیرایہ رکھتی ہیں۔ اور میر صاحب کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتی ہیں۔ یوں تو میر صاحب کی کیریکٹر نگاری بھی ایجاد ڈراما کی باعث ہو سکتی تھی۔ اگر دنیا میں ڈراما کو وجود نہیں ہوا ہوتا۔ مگر میر صاحب کی کیریکٹر نگاری کی

بڑی دشواری یہ ہے کہ میر صاحب کو اپنی کیریکٹر نگاری میں معاملات روحانیہ کو پیش نظر رکھنا پڑا ہے معاملات روحانیہ کا التزام کوئی آسان کام نہیں ہے میر صاحب کے کیریکٹر میں (CHARACTER) وہ اشخاص گرامی ہیں جو واقعہ کربلا سے تعلق رکھتے ہیں شاہنامہ اور ایلیڈ کے رستم وگیو یا ایکیڑ واکلیز نہیں ہیں یہ وہ حضرات ہیں کہ امام من جانب اللہ اور عزیزان و پیروان امام من جانب اللہ ہیں یہ سب کے سب ایسے ہیں جو دنیا کو ایک ذلیل شئے جانتے اور حیات و ثروت دنیا کو خس برابر بھی نہیں سمجھتے ہیں ان کے دل توحید و عدل و معرفت کے انوار سے روشن ہیں اور کفر و ظلم و حرص و ہوا کی ظلمتوں سے تمام تر پاک ہیں۔ یہ سب کے سب ایسے ہی ابرار ہیں کہ معاد و آخرت کے خیالات کے سوا کوئی اس دنیا کا خیال ان کا مرکوز خاطر نہیں ہو سکتا، تمام صفات روحانیہ سے متصف ہیں اور ایسے ہی ہیں کہ اپنے کمالات باطنی کے ذریعہ سے فعلاً و قولاً دین محمدی کو حق ثابت کر سکتے ہیں ملٹن کی رزمی تصنیف جو پیریڈایز لاسٹ کے نام سے مشہور ہے ہر چند معاملات عالم بالا سے سراسر تعلق رکھتی ہے مگر روحانی لغزشوں سے خالی نہیں ہے ملٹن نے تصنیف نامی میں دکھلایا ہے کہ خدائے تعالیٰ سے شیطان نے کس طرح بغاوت کی اور اس نافرمانی سے کس طرح وہ لعین قعر دوزخ میں ڈالا گیا پھر اپنی فدیات کو لے کر اس عاقبت برباد نے کیونکر خدائے تعالیٰ کے لشکر ملائکہ سے مقابلہ کیا اور کس طرح پر لشکر خدا کو اس نے شکست دی مگر میری رائے میں یہ شاعر نامی اپنی تصنیف گرامی میں شان خداوندی کو اس شکست کے بعد قائم نہیں رکھ سکا ہے ملٹن لکھتے ہیں کہ شیطان نے زمین کے اندر بیٹھ کر لوہے نکالے اور توپیں ڈھالیں اور بارود ترکیب دی۔ جب لشکر ملائکہ سے صف آرائی ہوئی تو اس نے جبرئیل و میکائیل او دیگر ملائکہ پر ایسی گولہ باری کی کہ سارے ملائکہ سخت زخمی ہوتے گئے اور لوگوں کے

صدمے سے یہ کیفیت گزری کہ غیر مقرب ملائکہ مقرب ملائکہ پر چوٹ کھا کھا کر گرے بالمختصر لشکر ملائکہ کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی۔ جب اس شکست کی خبر خدائے تعالیٰ کو ہوئی تو خدائے تعالیٰ کو سخت تشویش دامنگیر ہوئی۔ جناب باری کو اس کا یقین ہوگیا کہ شیطان اس ذات پاک اور جمیع ملائکہ کو آسمانی مقامات سے نکال پھینکے گا۔ اس حالت بیچارگی میں خدائے تعالیٰ کو چین نہیں آتا تھا حضرت جل شانہ کو شیطان کے غضب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھی تھی بالآخر حالت پریشانی میں خدا صاحب اپنے اکلوتے بیٹے حضرت مسیح کے پاس تشریف لے گئے اور خدا زادے سے شکست فوج ملائکہ اور اپنی بے بسی کا معاملہ کہہ سنایا خدا زادے نے اپنے پدر محترم کی پریشانیوں کے حالات سن کر نہایت تشفی بخش کلمات فرمائے جس سے فی الجملہ خدا صاحب کو بھی تسکین کی صورت پیدا ہوگئی اس کے بعد خدا زادے ایک تخت نور پر سوار ہوکر شیطان کے مقابلہ کو تشریف لے گئے اور شیطان کو شکست فاش دی۔ مصرع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند ٭ واضح ہو کہ ہر چند پیراڈائز لاسٹ ایک ایسی تصنیف ہے جس کو تمام تر روحانیت سے تعلق ہے مگر بظاہر اس کتاب کے بعض معاملات روحانیہ کچھ ایسی بدترکیبی سے حوالہ قلم ہوئے ہیں کہ دل میں عظمت پیدا کرنے کے عوض طبیعت کو ان سے تنفر پیدا ہوتا ہے ادیب ملٹن کے بیانات بالا نہ صرف عزت و جبروت خداوندی کے کم کر دینے والے نظر آتے ہیں بلکہ اپنے ابتذالی انداز سے بیحد مسخرا اور مضحک بھی دکھائی دیتے ہیں برخلاف اس کے میر صاحب کے بیانات ہیں جن سے خدائے تعالیٰ کی تمجید و تقدیس کی ایسی شکل قائم ہوتی ہے کہ شان کبریائی پیش نظر ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ رزمی شاعری جن جن زبانوں میں دیکھی جاتی ہے نہ صرف تمام دنیا میں انہیں بلند پایگی حاصل رہی ہے بلکہ قومی اعتبار سے ان زبانوں کے بولنے والوں کو بھی وجاہت

اور ثروت حاصل رہی ہے ہومر اہل یونان سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان یونانی ہے درجیل اہل اطالیہ سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان لاطینی ہے ملٹن اہل انگلستان سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان انگریزی ہے فردوسی اہل عجم سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان فارسی ہے والمکی اہل ہند سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان سنسکرت ہے ظاہر ہے کہ یہ سب زبانیں پایۂ امتیاز رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والے بھی قومی اعتبار سے اہل ثروت سے شمار کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں مگر میر انیس صاحب نے رزمی شاعری کا جلوہ ایک ایسی زبان میں دکھلایا ہے کہ نہ وہ زبان ابھی تک اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے اور نہ اس کے بولنے والے کسی طرح کا دنیاوی امتیاز رکھتے ہیں ایسی حالت میں اگر میر انیس صاحب کے کمالات اہل دنیا سے پوشیدہ رہ جائیں تو جائے تعجب نہیں ہے حقیقت حال یہ ہے کہ ابھی تک یورپ اور امریکہ میر صاحب کے نام سے بھی واقف نہیں تعلیم یافتہ دنیا ابھی تک نہیں جانتی ہے کہ زمانہ حال ہندوستان کی ایک ناپرساں اور مظلوم زبان میں ایک ایسے شاعر نے رزمی شاعری کی اتنی بڑی داد دی ہے کہ اگر ہومر اس وقت زندہ ہوتا تو اس ناپرساں شاعر کی طباعی سے حیرت زدہ ہوتا، میر صاحب کو کم از کم عباس اعظم کے عہد میں پیدا ہونا اور فارسی زبان میں اپنے کلام کا جلوہ دکھلانا تھا مگر ایسی مرضی الٰہی نہ تھی حیف صد حیف کہ میر صاحب نے ایسے زمانہ میں نشوونما پکڑی جب مسلمانان ہند اخلاقی تمدنی اور تمام جہتوں سے انتہائی ابتذال کو پہنچ چکے تھے لاریب یہ زمانہ میر صاحب کے ظہور کے لئے مناسب نہ تھا۔

پس زبان اور قوم دونوں کی وجہوں سے میر صاحب کی طباعی کو دنیوی شہرت کے حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا اب اس کی کم امید ہوتی ہے کہ میر صاحب کی شہرت اردو بولنے والے صوبجات ہند سے باہر قدم رکھ سکے، اردو کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ سرکار انگلشیہ کی

مردود ہے اور اردو بولنے والے مسلمان ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ ممتاز اقوام دنیا سے ان کا کسی میں شمار نہیں ہے اگر زبان کی حیثیت سے اردو کوئی ممتاز زبان ہوتی اور اس کے بولنے والے کسی طرح کا وقار دنیا میں رکھتے تو میر صاحب کی شہرت آپ ہی آپ تمام تعلیم یافتہ دنیا میں پھیل جاتی بحالت موجودہ باوجود حاصل رہنے ایک عدیم المثال قوت شاعری کے میر صاحب کی نسبت یہ ہرگز امید نہیں کی جاسکتی ہے کہ میر صاحب یورپ ایشیا اور امریکہ میں ہومر ورجل ملٹن فردوسی والمکی اور بیاس کی طرح ایک معروف رزمی شاعر مانے جائیں گے کس قدر تعجب ہے کہ یورپ میں عمر خیام کے نام کے کلب قائم ہوتے گئے ہیں مگر ابھی تک کوئی انیس کلب قائم نہیں ہوا ہے اور نہ ایسے کلب کے قائم ہونے کی کوئی امید کی جاسکتی ہے حالانکہ شاعری کے اعتبار سے میر صاحب عمر خیام سے کہیں ارفع درجہ کے شاعر ہیں واقعی دنیا کے لئے یہ ایک ستم کی بات ہے کہ میر صاحب جیسا شاعر دنیا میں آیا اور دنیا اس سے بے خبر رہ گئی ہی کو افتاد زمانہ کہتے ہیں خیر اگر دنیا میر صاحب سے واقف نہ ہوسکی تو اس کا علاج ہی کیا ہے مگر زیادہ تر ستم کی یہ بات ہے کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبجات بھی میر صاحب کے کمالات سے حسب مراد طور پر اطلاع نہیں رکھتے ہیں پس ہندوستانیوں میں میر صاحب کی قدر شناسی کیونکر ہوسکتی ہے مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ ذہبی شاعری کا مذاق صحیح بہت کم رکھتے ہیں کچھ مسلمانوں کو مذہبی اسباب میر صاحب کی شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے ہیں کچھ مسلمان حضرات مولویت کے تقاضات عموماً شاعری سے اجتناب رکھتے ہیں غرض یہ کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبوں میں بھی میر صاحب قریب قریب ایک غیر معروف شخص ہو رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے مولانا شبلی، مولانا اسشہری اور بعض دیگر اہل مذاق کا جو میر انیس

کو روشناس اہل ہند بنانے میں کوشاں ہوئے ہیں۔ کاش ایسے صاحبان علم وفضل اہل یورپ کو بھی میر صاحب کے کمالات سے باخبر کردینے میں سعی فرماتے۔ ایسی کا ائی سے نہ صرف اہل یورپ کی آنکھوں کے آگے ایک نیا اور بڑا میدان خیالات رفیع کا پیش ہوجاتا بلکہ خود اُردو بھی ایک غیر متوقع توقیر پیدا کرتی ۔

رزمی شاعری کی رفعت :-

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ رزمی شاعری کا درجہ ہر زبان میں ارفع دکھائی دیتا ہے۔ اس صنف شاعری کے برتنے میں شاعر کو داخلی (SUBJECTIVE) اور خارجی (OBJECTIVE) دونوں پہلو کے مضامین بندی پر یکساں باکمال رہنا چاہیئے۔ جس شاعر کو ان دونوں پہلوؤں مضامین بندی پر اختیار حاصل نہیں ہے اس سے رزمی شاعری کا مرحلہ طے نہیں پاسکتا ہے۔ ہومر جس جہاں اندرونی معاملات کو حوالہ قلم کرتا ہے وہاں اندرونی معاملات کی تصویر پیش نظر کردیتا ہے اس کے بیان سے غضب، غصہ، رحم، محبت، عداوت، رشک وغیرہ وغیرہ جو اندرونی کیفیتیں ہیں سامع کی نظر میں متشکل ہوجاتی ہیں اسی طرح جب یہ شاعر نامی اشیائے خارجیہ کو زیب رقم کرتا ہے تو خارجی چیزیں تمام تر آنکھوں کے سامنے حاضر ہوجاتی ہیں اس کی صورت نگاری لڑائی کے میدانوں کو اور بہادران جنگ کی نبرد آزمائیوں کو فوٹو سے بھی زیادہ واضح طریقہ آنکھوں کے آگے قائم کردیتی ہے یہی حال میر انیس کی شاعری کا بھی ہے میر صاحب کے حسن بیان سے معاملات خواہ اندرونی ہوں خواہ بیرونی یکساں طور پر پیش نظر ہوجاتے ہیں اس کی توضیح آیندہ آئے گی داخلی اور خارجی پہلوؤں پر قدرت رکھنے کے علاوہ رزمی شاعر کو ان دونوں پہلوؤں کی آمیزش پر بھی اختیار حاصل رہنا چاہیئے رزمی شاعر کو اس آمیزش کی اکثر حاجت ہوتی

ہے اِس آمیزش کی صلاحیت حسبِ مراد طور پر نہیں حاصل کرنے سے شاعر کا کلام
سیٹھا اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے ہومر کو اس کی بڑی صلاحیت مودعہ تھی اور میر صاحب بھی
اس کی بے حد قابلیت رکھتے تھے مثلاً ہر خیمہ گاہ کا مضمون خارجی پہلو کے سوا داخلی پہلو
نہیں لکھ سکتا ہے اور جب کسی خیمہ گاہ کا بیان قابلیت کے ساتھ انجام پائے گا تو اُس
خیمہ گاہ کا فوٹو پیشِ نظر ہو جائے گا مگر خیمہ گاہ امام حسین علیہ السلام کا بیان ایسا ہونا چاہیئے
کہ مجرد ظاہری فوٹو کی کیفیت نہ پیدا کرے بلکہ ایسا ہو کہ رنج و ملال بے چارگی بے بسی
مظلومیت وغیرہ کے داخلی پہلوؤں کو بھی لیے ہو جس سے امام حسینؑ کی خیمہ گاہ اور
خیمہ گاہوں سے صرف ممیز نہ ہو سکے بلکہ دل پر حسبِ مراد حزن و نیت کا عالم بھی پیدا کر سکے
اب ہم ذیل میں کچھ خارجی اور کچھ داخلی مضامین کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ یہ تو
ناممکن ہے کہ اس کتاب کے تنگ دائرہ میں تمام ایسے ایسے مضامین کو جگہ مل سکے جو
جن کو میر صاحب حوالۂ قلم فرما گئے ہیں تاہم ذیل کی مثالوں سے کسی قدر اس کا اندازہ
ہو سکے گا کہ آپ کو واہبُ العطایا نے کس درجہ کا شاعر بنایا تھا اور آپ کی قوتِ
شاعری کیا عدیم المثال پیرایہ رکھتی ہے جو خارجی اور داخلی دونوں قسم کی مضمون بندی
کا کمال یکساں طور پر دکھلاتی ہے ۔

خارجی مضامین کی مثالیں : پہلے راقم خارجی مضامین کی مثالیں پیش کرتا ہے

نمبر ۱ :- شام سے عمر سعد کا کربلا میں آنا اور امام کے فوجی معاملات کا دریافت حال کرنا

اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم ۔ آ پہنچا شام سے پسرِ سعدِ نحس و شوم
جس کے جلو میں لاکھ سوار و پیادے ہیں ہجوم ۔ اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا

اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوا نشاں
امڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علَم مثل بادباں
ہلتا تھا دشت کیوں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و بدشعار و دغاباز و پر دغل
شکلیں مہیب دیو سے قد ابرؤں پہ بل
بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلوار کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار
آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں ہزاروں غلام تھے

اترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر
سر پہ لگایا دوڑ کے خادم نے چتر زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر
خیمہ ہے کس طرف کو فتنہ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اترنے کو خاطر امام دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر
ہم نے اٹھا دیا انہیں لیکن بہ جبر و قہر

عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیرؓ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

دو دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاری حسینؓ — راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پہروں علیؑ کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین — آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نورِ عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سائے میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ امم — سنتے تھے واں سپاہ حسینی کی دھوم ہم
اس نے کہا حسینؓ کے یاور بہت ہیں کم — فاقوں کے مارے مر گئے کیسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں — یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہے گراں — غلہ کی ہے کمی ہے کہ ہے قحطِ آب واں
اسوار بھی قلیل ہیں پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

بندہائے بالا پر ریویو: بندہائے بالا ارضِ کربلا میں عمر ابن سعد کی آمد کا سین پیش کرتے ہیں ابن سعد شام سے ایک لاکھ سوار لے کر میدان کربلا میں پہنچتا ہے اس کی فوج کے نشانات نمودار ہوتے ہیں اس کا لشکر عظیم پیکر ہے بالظلم کا ایک موج زن سمندر جنگی باجے اس کے لشکر کے بادل کی طرح گرجتے ہیں ان کے لشکری رومی اور شامی ہیں یہ ایسے ہیں کہ نہ خدا سے ڈرتے ہیں اور نہ موت کی پرواہ کرتے ہیں اطوار ان کے نامحمود شکلیں ان کی مہیب اور قد ان کے

دلیے کے سئے یہ سب کے سب خاندان پیمبر سے عداوت رکھنے والے ہیں جس وقت ابن سعد آپہنچا اسلامی
کے باجے بجنے لگے رنڈیاں تمام گھوڑوں پر اس کے گرد وپیش تھے اور ہزاروں غلام زریں کمر جلو میں
سبحان اللہ کیا سچی تصویر میر صاحب نے ایک ایشیائی میر لشکر کی کھینچی ہے خاص کر ایک ایسے میر لشکر
کی جو خلیفۂ وقت یعنی یزید کی طرف سے امام حسینؑ کے انسداد اور مقابلہ کو بھیجا گیا ہے خیر اپنے خیمہ
کے قریب گھوڑے سے ابن سعد اترتا ہے حسب دستور خادم اس کے سر پہ چتر زر لگاتا ہے چونکہ یہ
شخص میر لشکر ہے پہلے اپنی فوج کی طرف نظر کرتا ہے اس کے ساتھ ہی فرات کی طرف دیکھ کر کسی
سے پوچھتا ہے کہ امام حسینؑ کا خیمہ کدھر ہے اور فرات پر تو ان کا کہیں قبضہ نہیں ہے یہاں میر صاحب
ایک ہوشیار جنرل کا فوٹو اپنے ناظرین مراثی کے سامنے پیش کرتے ہیں لاریب کیمپ پہ پہنچ کر نپولین
اور ویلنگٹن بھی غنیم کی نسبت اسی طرح پر دریافت حال کرتے ہوں گے جیسا کہ ابن سعد سے ظہور میں
آیا، المختصر حاضرین سے خولی نے فوراً ابن سعد کا اطمینان کر دیا کہ دریا لشکر یزید کے ہاتھ میں ہے
اس کے بعد اس نے خبر دی کہ امام علیہ السلام دریا کے کنارے اترا چاہتے تھے مگر اترنے نہیں پائے
اس پر عباس مستعد جنگ ہوئے مگر ان کے بھائی امام حسینؑ انھیں سمجھا کر پھیر لے گئے اب خیمہ
امام حسینؑ کا دھوپ میں استادہ ہے انھیں اور اُن کے تمام لوگوں کو نہ دن کو راحت اور نہ رات کو
چین نصیب ہے، ان کے بچوں کا پیاس سے برا حال ہے اُن کا خیمہ دھوپ میں ہے اور ان سے
دریا دور پر واقع ہے اس امر سے اطمینان پاکر کہ دریا امام حسینؑ کے قبضہ میں نہیں ہے اب ابن سعد
لشکر امام علیہ السلام کا حال پوچھتا ہے کہ آپ کی فوج کتنی ہے شام میں تو فوج حسینی کی بڑی دھوم
سنتے ہیں، یہ سن کر خولی جواب میں کہتا ہے کہ امام علیہ السلام کے مددگار بہت تھوڑے ہیں وہ بھی
فاقوں سے تباہ حال ہو رہے ہیں نہ کچھ ایسی فوج ہے اور نہ کچھ ایسے نشان ہیں گنتی کے فقط کاستی
جو ان ہیں لشکر میں صرف ایک علم ہے جس سے ہویدا ہے کہ فوج کم ہے لشکر کا حال لیتے ہوئے

کارواں کا حال ہو رہا ہے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے سوار پیادے بہت تھوڑے ہیں سترہ اونٹ اور بیس گھوڑے ہیں سبحان اللہ کیا اسلوبِ کلام ہے میر صاحب کے تناسب کلام کا کوئی جواب نہیں ہے یہی تناسب جو کسی مرثیہ نگار کو اب تک نہیں ہوا ہے یہ تناسب اگر کہیں ہے تو پھر مرزا ہی کے کلام میں دیکھا جاتا ہے میر صاحب کے کسی پورے مرثیہ پر نظر ڈالئے یا اُس کے کسی جزو کو ملاحظہ کیجیے تو اس کے کل یا جزو کو تناسب سے خالی نہیں پائے گا یہ تناسب کی خوبی میر صاحب کے حصہ کی ہے جاننا چاہیئے کہ دوسرا امر تناسب کا اعتدال ہے واقعی جو اعتدال میر صاحب کے مراثی میں موجود ہے کسی شاعر کے مراثی میں نہیں ہے میر صاحب کی تشبیہوں میں اعتدال ہے میر صاحب کے استعارات میں اعتدال ہے اور میر صاحب کے مبالغوں میں اعتدال ہے یہی اعتدال ہے جس نے میر صاحب کو جمیع مرثیہ نگاران عالم سے علیحدہ کر رکھا ہے جاننا چاہیئے کہ تمام عالم کا انتظام اعتدال پر موقوف ہے حکیم کی نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو کہ نظامِ شمسی اور جمیع نظام فلکی کا مدار اعتدال پر ہے یہ نظامِ شمسی جس سے ہم کو تمام تر تعلق ہے ہیں کا مرکز آفتاب ہے، اس کے گرد بہت سے سیارے گھوما کرتے ہیں اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آفتاب اور سیارات میں جسمی تناسب نہ ہوتا تو یہ نظامِ شمسی حالت موجودہ پر نہیں رہتا۔ آج جسامت آفتاب کی دونی ہو جائے تو سب سیارے کھنچ کر آفتاب سے چپاں ہو جاتے ہیں پھر یہ سال و ماہ کسوف و خسوف وغیرہ وغیرہ سب کو نذرا دہی سمجھے گا صرف یہ تناسب ہی ہے جس سے روز آفتاب طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے چاند نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہتا ہے یہ تناسب ہی ہے جس سے حسن کو وجود حاصل ہے یہ تناسب ہی ہے جس سے ہر ذی حیات زندہ ہے اگر تناسب نہیں تو کچھ نہیں اسی طرح یہ تناسب ہی ہے جس نے میر صاحب کے کلام کو لاجواب بنا رکھا ہے بند ہائے بالا از ابتدا تا انتہا سبحان اللہ

کس طرح زیبا تناسب سے آراستہ ہیں کہ خط و خال کو بھی بے اعتدالی کہیں پر نظر نہیں آتی ہے یہ طرز بیان لاریب عین تناسب ہے، اور اسی لیئے کمال حسن کا مظہر اتم ہے حضرات ناظرین آخر کے ٹیپ کے دونوں مصرعوں کو ملاحظہ فرمایئے کہ تناسب کے پورے نمونے اور بے تکلفی کی پوری تصویر ہیں۔

نمبر ۲:- لشکر اعدا سے حضرت قاسم علیہ السلام کی جنگ

کیونکر تمام فوج سے وہ تشنہ لب لڑے　　اک اک لڑا نہ آہ بہم ہو کے سب لڑے
کھا کھا کے زخم مثل امیر عرب لڑے　　جانبازیاں غضب کی دکھائیں غضب لڑے
جلوہ میان تشنہ دہانی دکھا دیا
بچپن میں لڑکے زور جوانی دکھا دیا

للکار اجس نے بس وہیں گھوڑا ڈپٹ کے آئے　　یوں آئے جیسے شیر دلاور جھپٹ کے آئے
بجلی گری اُدھر کو جدھر کو پلٹ کے آئے　　صف کو بچھا کے سکئے پسے کہ پلٹ کے آئے
منہ سرخ تھا کھلے ہوئے تھے زخم سینے کے
بن کر لہو ٹپکتے تھے قطرے پسینے کے

کاٹے رسالے تیغ سے کار قلم لیا　　دست یمیں نے جنگ سے آرام کم لیا
پھر دست چپ میں تیغ دو سر کو بہم لیا　　تیورا کے سنبھلے منہ سے لہو پوچھا دم لیا
یاں بند ہو کے آنکھ کھلی جتنی دیر میں
سو تیر دل کو توڑ گئے اتنی دیر میں

آخر اسپاہ میں وہ چودھویں کا ماہ　　روکے تھی فوج تیروں سے اور برچھیوں سے راہ
لشکر کے ساتھ تھا پسر سعد روسیاہ　　تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ

غل تھا کہ روند ڈالا ہے لشکر کے باغ کو
ہاں غازیو بجھا دو حسن کے چراغ کو

تیغیں چڑھائی تھیں جو لعینوں نے سان پر — پڑتی تھیں وہ قریب سے اُس ناتوان پر
تیروں پہ تیر تھے تو کمانیں کمان پر — حملہ تمام فوج کا تھا ایک جان پر
یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

غش میں جھکا فرس پہ جو وہ غیرت قمر — مارا کسی نے فرق پہ اک گرز گاؤ سر
برچھی لگی جو سینہ پہ ٹکڑے ہوا جگر — گرتے تھے اسپ سے کہ کمر پہ پڑا تبر
طارق کی تیغ کھا کے پکارے امام کو
فریاد یا حسین بچاؤ غلام کو

بندہائے بالا پر ریویو: یہ بین دکھلا رہا ہے کہ حضرت قاسم علیہ السلام لشکر اعدا میں گھرے ہوئے ہیں اور تن تنہا بڑی بہادری کے ساتھ ایک فوج کثیر سے لڑ کر زخمی ہوئے ہیں اور آخر کار زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرتے ہیں۔ لاریب یہاں بھی تناسب کلام وہی ہے جو میر انیس کی شان ہے تناسب سے تو آپ کا کلام کبھی خالی نہیں ہوتا۔ ان بندوں میں بھی وہی اعتدال ملحوظ رہا ہے جس سے آپ کی شاعری ہمیشہ ممتاز نظر آتی ہے کوئی شک نہیں کہ تبعیت فطرت میر صاحب کا کام ہے یہی تبعیت فطرت آپکے کلام میں تناسب اور اعتدال پیدا کرتی ہے جس سے آپ کی شاعری مصوری کی داد دیتی ہے واضح رہے کہ میر صاحب کے مراثی کے بند ایسے نہیں ہیں کہ صرف فرداً فرداً خوب ہیں بلکہ اجمالی حیثیت سے ان کے تناسب اور اعتدال کا جلوہ اور بھی واضح طور پر دکھلائی دیتا ہے تناسب کی خوبی عجب

خوبی ہوتی ہے بغیر تناسب کے حسن کا وجود ناممکن ہے اگر کسی شخص کے جسم کے اعضا فرداً فرداً خوبصورت ہوں مگر ان میں تناسب موجود نہ ہو تو ایسا شخص حسین نہیں کہا جا سکتا۔ تناسب کی معدومی علیحدہ علیحدہ ہر جزو بدن کی خوبصورتی دہ اجمالی حیثیت نہیں پیدا کر سکتی ہے جس کو حسن کہتے ہیں میر صاحب کا ہر مرثیہ جو اس قدر حسین انداز رکھتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ حضرت کا مرثیہ مطلع سے مقطع تک تناسب کی خوبی سے خالی نہیں پایا جاتا ہے یہ وہ خوبی ہے کہ ان کے صاحبزادے میر نفیس صاحب مرحوم کے مراثی میں بدرجہ اتم نہیں پائی جاتی ہے اس لیے میر نفیس صاحب کے مراثی میر انیس صاحب کے مراثی کے درجہ کو نہیں پہنچتے ہیں۔

میر انیس صاحب کا اعتدال کلام ایک حیرت انگیز انداز رکھتا ہے سبحان اللہ آپ کے مبالغے تشبیہات اور استعارے بھی اعتدال سے خالی نہیں ہوتے ہیں آپ بالا میں ایک بند کی ٹیپ یوں رقم فرماتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے ‏ ‏ ‏ جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

اس تشبیہ کا اعتدال قابل لحاظ ہے اور صنعت اس تشبیہ میں رکھی گئی ہے کہ یہ تشبیہ اپنی ذاتی حیثیت سے مدح کا ایک نفیس پہلو پیدا کرتی ہے لاریب میر صاحب کا کلام بے حد بلیغ ہوا کرتا ہے یہ عوام کی لاعلمی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ میر صاحب صرف فصیح تھے - بلیغ نہ تھے کس قدر یہ قول بے معنی ہے فصاحت بلاغت سے جدا نہیں ہوتی چونکہ میر صاحب کی بلاغت ہمیشہ احاطۂ اعتدال میں رہتی ہے اس لئے آپ کا کلام بادی النظر میں بلیغ نہیں معلوم ہوتا ہے عوام غیر معتدل بلاغت کو بلاغت جانتے ہیں اس لئے انہیں میر صاحب کے کلام کی بلاغت بلاغت نہیں معلوم ہوتی ہے

نمبر ۳ :- تلوار کی تعریف :-

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق
وہ برق کہ خود مانگتی ہے جس سے اماں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں ابر تو واں برق
منہ زہر بہ پرستش قہر بدن آگ زباں برق
سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اُسی کو
لو ہے پہ بھی گرتی تھی تو کھاتی تھی اُسی کو

اُٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی لچکی کبھی چمکی
سر گر گئے گردن جدھر اُس تیغ نے خم کی
سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی
سیفی تھی کہ گویا دمِ شمشیر پہ دم کی
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گروں کی
تھی مینہ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

کسکے سرو گردن میں جدائی نہ دکھائی
صف کون سی تھی جس کو صفائی نہ دکھائی
کس کو اسدِ حق کی لڑائی نہ دکھائی
مقتل میں کسے عقدہ کشائی نہ دکھائی
ریلا جو ہوا ناریوں کا رول کے نکلی
شیرازۂ اجزائے بدن کھول کے نکلی

اک ضرب میں ہاتھ اس کے اڑائے تو سر اُسکا
شاخیں کبھی اس نخلِ ستم کی ثمر اس کا
دل اس کا دو پارہ کیا کاٹا جگر اُس کا
دم ہو گیا آخر ادِھر اُس کا اُدھر اس کا
جس جا پہ جھکے خون کی ندی وہیں بہ جائے
کیا دخل تھا اس کا کہ کسی بات پہ رہ جائے

تھا صورتِ آئینہ تمام اس کا بدن صاف
خوں پیتی تھی پر دیکھو تو منہ صاف دہن صاف
چلتی تھی جو گن گن پہ نکلتا تھا سخن صاف
ہوں میں تو وہ جادہ کہ کہہ دیتی ہوں لن صاف
نااہل ہیں نامراد ہیں ناپاک ہیں اعدا

ہیں برق غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

پُرخم سے ہلالِ فلکِ نیلوفری تھی　　مارا تھا ہزاروں کو مگر خوں سے بری تھی
شوخی بھی نئی اور نئی جلوہ گری تھی　　تھی تیغ کہ قبضہ میں سلیماں کے پری تھی

اک آگ لگی وار جدھر چل گیا اس کا
جو آ گیا سایہ میں بدن جل گیا اس کا

ایک اور ٹیپ تلوار کی تعریف میں نہایت لاجواب ہے وہ یہ ہے

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے　　شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

واقعی یہ کیا سچی تعریف تلوار کی ہے سچ یہ ہے کہ واقعہ نگاری میر صاحب پر ختم ہے
بندہائے بالا پر ریویو۔ واضح ہو کہ کسی زبان میں تلوار کی تعریف ان ترکیبوں سے نہیں لکھی جاتی ہے اہل عرب ہمیشہ سے شمشیر دوست رہے ہیں مگر ذکر شمشیر کے سوا کوئی خاص تعریف شمشیر کی عربی زبان میں راقم کی نظر سے نہیں گزری ہے ہومر کی ایلیڈ اور ورجل کی اینیڈ میں بھی ایسی تعریفات بعید النظر آئی ہیں۔ خیر فطری حد تک ہر شے کی تعریف کوئی مضایقہ نہیں رکھتی۔ مگر جب تلوار کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے جاتے ہیں تو ایسی تعریفوں کا مطلق اثر دل پر نہیں ہوتا ہے بلکہ ایسی تعریفیں موجب نفرت ہو جاتی ہیں جو ممدوح کے ہاتھی گھوڑے اور تلوار کو عجائب المخلوقات بنا دیتی ہیں قصیدہ گو شعرا کا ایک خاص شیوہ ہے مگر بعض مرثیہ گویوں نے بھی وہی روش اختیار کی ہے اور یہ تتبع نہایت ناپسندیدہ ہے بہر حال میر انیس صاحب نے ہر چند تلوار اور گھوڑے کی تعریفیں اکثر نظم کی ہیں لیکن فطری انداز سے آپ کے بیانات چنداں علیحدہ نہیں رہتے ہیں اس لیے دل آویزی سے بھی چنداں خالی نہیں پائے جاتے ہیں

نمبر ۴۔ گھوڑے کا بیان :۔ مضامین خارجیہ کی چوتھی مثال

لکھتا ہے ادہم قلم اب سرعت عقاب — نعل اس کی ماہ نو ہیں تو سُم رشک آفتاب
پستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب — سُرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب
اُڑنے میں اِس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہے

افزوں ہے زلف حور سے خوشبو ایال کی — دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی — غصہ میں ہیبت شیر کی شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

نازک مزاج و نسترن اندام و تیز رو — گردوں مسیر بادیہ پیما و برق دو
اس کا نہ اک قدم نہ زغندیں ہرن کی سو — دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے نہ جو
رفتار میں ہوا تھا اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند بو سے سبک رو ہوا سے تیز — چالاک فہم و فکر سے ذہن رسا سے تیز
طاؤس و کبک و قمر و عقاب و ہما سے تیز — جانے میں اڑ کے ہدہد شہر سبا سے تیز
ذی جاہ تھا سعید تھا فیروز بخت تھا
رہوار کیا ہوا یہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا۔ اُدھر گیا — چمکا۔ بڑھا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

کوئی شک نہیں کہ گھوڑے کی تعریفیں شعرائے عرب کے کلام میں حسبِ مراد طور پر دیکھی جاتی ہیں جیسا کہ کچھ اشعار گھوڑے کی تعریف میں اِس کتاب کی جلد اول میں جہاں امرءالقیس کے قصیدہ لامیہ نے جگہ پائی ہے درج ہوتے گئے ہیں میر صاحب کے اشعار بالا بھی قابل توجہ ہیں اِس لیے کہ اُن میں بہت سے فطرتی مضامین پائے جاتے ہیں اور جہاں جہاں میر صاحب نے مبالغوں سے کام لیا ہے اُن کے اسلوب لطف سے خالی نہیں دکھائی دیتے ہیں، عموماً فارسی گو اور اُردو گو شعراء جو قصیدہ نگاری کا پیشہ کرتے ہیں اُن کے ممدوح کے گھوڑے عجب حالات کے گھوڑے نظر آتے ہیں اِس ابتذال سے تو یقیناً میر صاحب نے اپنے بیانات کو محفوظ رکھا ہے یہ کم قابل قدر بات نہیں ہے، ایشیائی بدمذاقی سے تھوڑا اجتناب بھی ایشیائی شاعر کے لئے ایک بڑا سرمایہ امتیاز متصور ہے ؏

بعد پیش کرنے خارجی مضامین کی مثالوں کے راقم ذیل میں داخلی مضامین کی مثالیں نذر ناظرین کرتا ہے ؏

نمبر ۱:- میر انیس صاحب کی التجا درگاہ باری تعالیٰ میں واسطے بخشش مضامین اور حصول حسن کلام کے :-

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیق کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جبتک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے

اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری — بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری — پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گُل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی — ہو جن کی جگہ تاج سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی — عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی
کسب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کی یہ ہوں گے جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درجِ دہاں کو — دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو — عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حُسنِ بیاں کو
تحسیں کا سماوات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلیں جام — جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیتِ انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام — صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام
ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آ گئی ہے خلدِ بریں سے

آؤں طرفِ رزم بھی چھوڑ کے جب بزم — خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم — دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکن ماہی ۔۔۔ عالم کو دکھا دی بُرِشِ سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی ۔۔۔ لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی
ہر روم پہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اِس طبل و علَم کا

بند ہائے بالا پر ریویو: یہ مناجات طولانی ہے یہاں صرف چند بند ابتدائے مطلع سے نمونہ کے طور پر درج کیے گئے ہیں۔ لاریب شاعر کی مناجات اس سے زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم نہیں ہو سکتی ہے یہ ایسی ہی مناجات ہے کہ یقیناً درگاہ مجیب الدعوات میں قرین اجابت ہوئی میر صاحب جس نعمت کے طالب ہوئے لاریب اُس سرکار واہب العطایا سے انھیں مل گئی ورنہ عنایت ایزدی کے بغیر ایسے کلام کا نصیب ہونا توقع سے باہر ہے۔

سبحان اللہ داخلی مضامین پر بھی میر صاحب کی طبیعت عالی کس قدر اختیار رکھتی ہے۔ اس مناجات کے مضامین تمامتر داخلی پہلو رکھتے ہیں اور کس قدر حُسنِ قبول کی شان اُن سے آشکارا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ کوئی شاعر رزمی شاعر نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسے خارجی اور داخلی مضامین کی بندش پر یکساں قدرت حاصل نہیں رہتی۔ اب ذیل میں اور بھی دو مثالیں داخلی مضامین کی ہدیۂ ناظرین ہوتی ہیں:۔

نمبر ۲: حالت قلب امام حسین علیہ السلامؑ حضرت بانوؓ کی بوقت رخصت علی اکبرؓ

مضامین داخلی کی دوسری مثال:

ہتھیار پسر سجتا ہے گھبراتے ہیں ماں باپ ۔۔۔ سر تا بہ قدم بید سے تھرّاتے ہیں ماں باپ

زخم اُس نے نہیں کھائے پہ غم کھاتے ہیں ماں باپ
اکبرؓ ابھی جیتے ہیں موئے جاتے ہیں ماں باپ
اللہ ری الفت پسرِ ماہ لقا کی
دل سینے میں کٹتا ہے دہائی ہے خدا کی

سر پیٹ کے جب گرد پسر پھرتی ہے مادر
ہیں بال کھلے سر سے گری پڑتی ہے چادر
آہستہ اشارہ ہے کہ یا سبطِ پیمبرؐ
روکو انھیں ہاتھوں سے چلے اب علی اکبرؓ
ہیں صاحبِ الفت انھیں رحم آئیگا تم پر
تم بیٹے کو روکو نہیں گرتی ہوں قدم پر

صاحب مرے فرزند کو چھاتی سے لگاؤ
روٹھے ہوں جو مجھ سے علی اکبرؓ کو مناؤ
ماں ان کی ہیں زینب انھیں اس وقت بلاؤ
اس داغ سے لونڈی کے کلیجے کو بچاؤ
اٹھارہ برس سامنے آنکھوں کے رہے ہیں
پالا ہے بڑے دکھ سے بڑے رنج سہے ہیں

بانو سے اشارے میں یہ فرماتے ہیں شبیرؓ
اس وقت کلیجے پہ مرے چلتی ہے شمشیر
ہے ہے میں کروں کیا کوئی بنتی نہیں تدبیر
بابا سے چھڑاتی ہے ترے لال کو تقدیر
کس طرح میں بیٹے روک لوں اس ماہ لقا کو
تنہائی شبیرؓ ہے منظور خدا کو

اتنے میں کمر باندھ چکے اکبرؓ جرار
سینے میں دھڑکنے لگا بانوؓ کا دلِ زار
فرزند کا منہ تکنے لگے سیدِ ابرارؓ
ہم شکلِ پیمبرؐ ہوئے رخصت کے طلبگار
ہاتھوں سے کلیجہ شہِ بے پر نے سنبھالا
گرنے جو لگی ماں علی اکبرؓ نے سنبھالا

فرمایا پدر صدقے ہو اے اکبرِ ذی شان　　کیا کہتے ہو رخصت کسے کہتے ہیں مری جان
دم کس میں ہے دے کون تمہیں رخصتِ میدان　　دنیا سے یہ شبیرؑ کی رحلت کا ہے سامان
ماں باپ چراغِ سحری ہیں علی اکبرؑ
ہم تم سے بھی پہلے سفری ہیں علی اکبرؑ

کس طرح بھلا داغِ جوانی ہو گوارا　　سہرا ابھی تو دیکھا نہیں بابا نے تمہارا
عباسؑ سے قوت تھی وہ دنیا سے سدھارا　　اب کوئی نہیں ہے مری پیری کا سہارا
میدانِ بلا میں یہ وغا کرنے کے دن ہیں
بتلا علی اکبرؑ یہ ترے مرنے کے دن ہیں

اکبرؑ نے کہا شرم سے گردن کو جھکا کر　　ہیں قبلہ و کعبہ کی رضا سے نہیں باہر
ہے آپ سے انصاف طلب آپ کا دلبر　　سب قتل ہوں اور جان بچائے علی اکبرؑ
فرزندِ حسنؑ کی تو شجاعت کا بیاں ہو
اور جوہرِ شمشیرِ حسینی نہ عیاں ہو

جوہر ہمیں خالق نے شجاعت کا دیا ہے　　مردوں سے عوض خونِ عزیزاں کا لیا ہے
مولا کوئی دنیا میں ہمیشہ بھی جیا ہے　　دو روز سے پانی نہیں خادم نے پیا ہے
اب جانِ حزیں جسم میں گھبراتی ہے بابا
کوثر پہ ہمیں پیاس لئے جاتی ہے بابا

ٹکڑے ہوا تقریر پسر سے دلِ سرورؑ　　کچھ بس نہ چلا رو دیئے گردن کو جھکا کر
فرمایا کہ پانی مجھے ہوتا جو میسر　　تم کا ہے کو بابا سے بچھڑتے علی اکبرؑ
کوثر پہ چلے تشنہ دہاں باپ کے گھر سے

افسوس تمہیں پیاس چھڑاتی ہے پدر سے

اکبر نے کہا میں نے بہت پیاس کو مارا — حضرت کی قسم ہے نہیں اب ضبط کا یارا
شہ نے کہا یہ داغ بھی کرلیں گے گوارا — رونا تو ہے اس کا کہ نہیں کوئی ہمارا
آفت کا کبھی دکھ میں نہ شکوا کیا ہم نے
عباس علی مر گئے تب کیا کیا ہم نے

تم ہوتے تو یہ ہوتا کہ لاشے کو اٹھاتے — اور قبر ہماری اسی جنگل میں بناتے
ہم غسل و کفن ہاتھ سے فرزند کے پاتے — اس دشت میں مرتے تو بھلا دھوپ کھاتے
مرضی جو تمھاری نہیں بس باپ کا کیا ہے
کچھ غم نہیں پیر خیر ہمارا ابھی خدا ہے

بند ہائے بالا پر ریویو: بند ہائے بالا میں عجب درد انگیز سین میر انیس صاحب کی فطرت نگاری نے پیش نظر کر دیا ہے حضرت علی اکبرؑ شکریہ پدر سے سامنا کرنے کے لیے تشریف لے جارہے ہیں امام حسین علیہ السلام دو بھانجوں حضرت عون و محمد بھائی حضرت عباسؑ اور بھتیجے حضرت قاسم کے داغ غم اٹھا چکے ہیں اور اب آپ کے بیٹے علی اکبرؑ کی شہادت کی باری آرہی ہے حضرت شہر بانو کے دم میں دم نہیں ہے حضرت امام علیہ السلام کے دل پر جو گذر رہی ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا، مادر و پدر کی جو حالت ایسے وقت میں تقاضائے فطرت سے ہو سکتی ہے اُسے میر صاحب کی قابلیت شاعری نے خوب دکھلایا ہے مادر و پدر کے فراق غم کی تصویر نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ کھینچی گئی ہے اضطراب مادر اور استقلال پدر کے بیانات ایک حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں لاریب حضرت علی اکبرؑ کی رخصت کا سین بند ہائے بالا میں اس قوت ڈرامانگاری کے ساتھ حوالہ

قلم ہوا ہے جو شکسپیئر اور کالی داس کو واہب المعطایا نے بخشی تھی۔

نمبر ۳: حال استقلال حضرت زینب علیہا السلام وقت رخصت حضرت عون و محمد

مضامین داخلی کی تیسری مثال:-

ناگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا
پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
منہ سرخ ہوا غیظ سے ہمشکل نبیؐ کا
رایت بھی بڑھا فوجِ رسولِ عربی کا
حیدرؑ کے نواسوں کے بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پردے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو انھیں سید ابرار
بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار
کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار
ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار
بیتاب ہیں دل جان مصیبت میں پڑی ہے
اے نور خدا ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر پہلے گئے قاسمؑ و اکبرؑ
یا شاہ ہمیں دودھ نہ پھر بخشیں گی مادر
شبیرؑ کی وہ تصویر یہ ہمشکل پیمبرؐ
توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقہ ہوں ان پر
مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں
ہم ان کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں

بسمل جو ہوئے مسلم مظلوم کے پیارے
ہم خیمہ میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
اماں نے کہا ہوگا کہ اب تک نہ سدھارے
جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
قاصر ہیں جو توقیر شہادت نہیں ملتی
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادا　　سن کم ہیں پہ ہمت ہے جوانوں سے زیادا
نانا تو علیؑ جعفرؓ طیار ہے دادا　　ہم ڈھونڈتے ہیں صبح سے فردوس کا جادا

شیروں کی طرح بیشۂ حیدرؑ میں پلے ہیں
تلواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی　　دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی
نانا تھے جو کرار تو جرار ہیں ہم بھی　　مرنے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی

ہے جوش وفا عمر کے پیمانے بھرے ہیں
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں

ہم آپ سے مرنے کے لئے جا نہیں سکتے　　زخم تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے
بے حکم جو مطلب ہے اسے پا نہیں سکتے　　آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے

ہم پیچھے رہیں سب سے یہ تقدیر ہماری
ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری

ہم دونوں غلام اکبرؑ و اصغرؑ کے ہیں یا شاہ　　الفت کو بس اب دل سے اٹھا دیجیے للہ
اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ　　بنت اسد اللہ حضرت باری ہیں وہ ذی جاہ

پوچھیں گی خفا ہو کے تو کیا ان سے کہیں گے
آزردہ ہوئیں وہ تو کہیں کے نہ رہیں گے

عورت ہیں پہ خو بو شہ مرداںؑ کی ہے ساری　　شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
تم یہ نہ سمجھیو کہ میں عاشق ہوں تمہاری　　بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری

کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے

تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مرو گے

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند   حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضامند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند   کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند
تنہائی کا دکھ فاطمہؑ کا لال سہے گا
لاشے کے اٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا

اکبرؑ کو تو ہمشیر نے میں نے تمہیں پالا   ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا
اب کون ہے غربت میں مرا تھامنے والا   دل کا کوئی ارماں نہیں تم سے نکالا
دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں
دنیا سے اجل لے چلی بچپن کے دنوں میں

دونوں سے یہ فرما کے ادھر روتے تھے شبیرؑ   چپ بیٹھی تھی رانڈوں میں ادھر شاہ کی ہمشیر
سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر   محجوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر
میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

آتا ہے دم صبح سے یاں لاشے پہ لاشا   ان کے لیے اعدوں کی لڑائی ہے تماشا
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا   باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا
رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسینؑ ابن علیؑ کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا   نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا
میداں کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہ والا   آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصہ کی نہیں جا

سن لیجیے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے
حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے
جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ وہ لائے
کیا جانیے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل ہیں کہاں ہوں
اب وہ مرے فرزند نہیں دونوں کی ماں ہوں

یہ ذکر تھا فضہ جو خبر لے کے یہ آئی
فرمایا کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی
اے بنت علیؑ رو رہے ہیں آپکے بھائی
بچے بھی شریک شہدا ہوتے ہیں لوگو
دو بھانجے ماموں پہ فدا ہوتے ہیں لوگو

فضہ سے یہ سننا تھا کہ بس رونے لگے سب
اور خاک پہ سجدے میں جھکیں حضرت زینبؓ
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب
عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یارب
بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیاسے گئے دونوں
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں

بند ہائے بالا پر ریویو:- فطرت نگاری میر انیس صاحب کا حصہ ہے بند ہائے بالا تمام تر ڈراما کی خوبیوں کا انداز رکھتے ہیں حضرت زینبؓ کا کیریکٹر خوب ہی حوالۂ قلم ہوا ہے جو جو صفتیں شہنشاہ لافتیٰ کی بیٹی میں ہونی چاہیئں آپ میں موجود تھیں چونکہ بھائی کی فدائی تھیں بیٹوں کو بھی بھائی پر تصدق کر دینا آسان سمجھی تھیں ظاہر میں تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ امام علیہ السلام کی محبت میں اپنے لڑکوں کا خیال بھی آپکو باقی نہیں رہا تھا۔ مگر اصل وجہ اس شیفتگی کی یہ تھی کہ بالیقین آپ

اپنے بھائی کو امام من جانب اللہ جانتی تھیں اس لیے بیٹوں کی شہادت کی بھی آپ کو پروا نہیں رہی تھی، یہ بات آپ ہی کے ساتھ مختص نہ تھی جتنے ذکور واناث حضرت امام علیہ السلام کے شریک حال تھے، ان سب افراد کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں من جانب الناس نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے ساتھ کون کمبخت ایسا ہو سکتا تھا کہ امام علیہ السلام کا فدائی نہ ہوتا۔ خاندان پیمبرؐ کے حضرات اور اُن کے تابعین جو شریک واقعۂ کربلا تھے، یہ سب حضرات تو امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ جانتے ہی تھے مگر یہی سمجھ حضرت حر کو بھی لشکر یزید سے نکال لائی، ورنہ حضرت امام علیہ السلام کا طرفدار ہو جانا ایک ایسے غیر شخص کا جس کو دنیاوی فائدہ کی خس برابر امید نہ ہو محض خلاف فطرت ہوتا لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حُر نے امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ مانا اور حضرت کے لئے مر جانے کو ایک آسان امر جانا، ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے بغیر کوئی شخص اپنی ہلاکت گوارا نہیں کر سکتا ہے پس حضرت زینبؑ اس یقین کے ساتھ کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں کیونکر اپنے بیٹوں کو حضرت پر تصدق کر ڈالنا ایک امر ضروری نہیں سمجھتیں، واضح ہو کہ حضرت زینب کے کیریکٹر کے علاوہ حضرت امام علیہ السلام حضرت بانوؑ حضرت عون حضرت محمد اور حضرت فضہ رضؓ کے پارٹ (PART) یعنی اُن کے قولی اور فعلی معاملات میر صاحب نے ڈرامانگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ احسن نہج پر حوالۂ قلم فرمائے ہیں ہومر اور شکسپیئر بھی اس سے زیادہ ڈرامانگاری کا جوہر نہیں دکھلا سکتے تھے۔

میر صاحب کے مراثی کس طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں، واضح ہو کہ میر صاحب کے مراثی عموماً ایسے ایسے مضامین ہیں جیسے حمد و احکام خداوند تعالیٰ جل شانہٗ ثنا و کلام حضرت رسالتمآب صلعم مناقب و کلام حضرت امیر علیہ السلام۔ مدح و کلام حضرت خاتون جنت علیہا السلام مدح جناب امام حسن رضؓ

مدح جناب امام حسین علیہ السلام، مدح حضرت عباس علمدار علیہ السلام، مدح حضرت علی اکبرؑ حضرت قاسمؑ حضرت عون و حضرت محمد سلام اللہ علیہم، مدح حضرت زینب علیہا السلام، مدح حضرت شہر بانو علیہا السلام۔ ذکر ولادت حضرت امام حسن علیہ السلام، ذکر ولادت امام حسینؑ وصایا و کرم و اخلاق و مناجات و کلمۂ صبر و رضائے آنحضرت، حال روانگی آنحضرتؐ از مدینہ منورہ بجانب مکہ معظمہ، بحال روانگی آنحضرت جانب کوفہ از مکہ معظمہ، حال زحمت سفر، ذکر انصار جناب امام حسین علیہ السلام، تیاری ہائے جنگ فریقین در مقام کربلا، رجز حضرت امام حسینؑ، مع کلمات وعظ و پند و جنگ امام علیہ السلام با اعدائے دین، رجز و جنگ علی اکبر علیہ السلام رجز و جنگ حضرت عباس علیہ السلام رجز و جنگ حضرت قاسم علیہ السلام، رجز و جنگ حضرت عون و محمد علیہما السلام رجز جنگ حضرت حر علیہ السلام، حالت قلب حضرت امام حسین علیہ السلام وقت رخصت و شہادت حضرت علی اکبر علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت شہادت علی اصغر علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت رخصت و شہادت حضرت عباس علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت شہادت حضرت قاسم علیہ السلام، وفاداری حضرت عباسؑ جلال حضرت عباس علیہ السلام و وفاداری و دلیری حضرت حُر علیہ السلام۔ قدردانی و عزت افزائی حضرت حر علیہ السلام از جانب امام حسین علیہ السلام استقلال حضرت زینب وقت رخصت حضرت عون و حضرت محمد علیہما السلام، اضطراب حضرت زینبؓ وقت روانگی امام حسین علیہ السلام جانب میدان جنگ و شہادت آنحضرت جنگ امام علیہ السلام با اعدائے دین و شہادت آنحضرت ہنگامہ میدان جنگ، صبر و استقلال حضرت امام زین العابدینؑ در حالت مصیبت، روانگی اہل حرم جانب شام در بار یزید، زندان شام، سامان مہمانداری از جانب شیرین اکنیز آزاد کردہ حضرت امام حسین علیہ السلام، بیانات مناظر قدرت۔

بیانات صبح و شام، بیانات امور خارجیہ، بیانات امور ذہنیہ، تعریف اسپ، تعریف شمشیر، بیان لشکر یزید، بیان مبارزان لشکر یزید، بیانات بے ثباتی دنیا و انقلابات عالم۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مختصر فہرست میر صاحب کے مضامین مراثی کی ہے۔ ان میں سے کچھ بند جو مضامین بالا سے تعلق رکھتے ہیں ذیل میں درج پاتے ہیں :-

نمبر ا :- حضرت عباس علمدار کی وفاداری ۔ (مضامین بالا کا پہلا نمونہ)

گھبرا کے بڑھا خود پسر سعد بد انجام
عباس سے کی عرض کہ اے صاحب صمصام
سن لیجئے کچھ شام کے حاکم کا ہے پیغام
پر آپ تک آتے ہوئے گھبراتا ہے اندام
جھنجھلائے ہوئے شیر سے اندیشہ ہے جان کا
میں چند نفس آپ سے طالب ہوں اماں کا

کی چین بہ جبین ہو کے یہ عباس نے تقریر
پیغام مجھے بھیجے گا کیا حاکم بے پیر
بندہ ہوں میں حاکم ہیں مرے حضرت شبیرؑ
شیوہ ہے تمھیں لوگوں کا یہ حیلہ و تزویر
ہے کام وفا سے ہمیں اور ہم سے وفا کو
فرزند علیؑ ننگ سمجھتے ہیں دغا کو

وہ تم ہو جو کرتے ہو دغا اہل وفا سے
مطلب ہے محمدؐ سے تمھیں کچھ نہ خدا سے
سادات کا سر کاٹتے ہو تیغ جفا سے
مہماں ہیں یہ کس کے جو ہیں دو روز سے پیاسے
کھا کھا کے قسم پھر گئے تم اپنے سخن سے
ہم وہ ہیں کہ کھنچتے ہیں چلے آئے وطن سے

گر صلح کا پیغام بھی لایا ہے تو بے کار
میں کہتا ہوں مانیں گے نہیں سید ابرار
دو بھائی مجھے مارے گئے اک بھائی کا دلدار
صدمہ یہ اٹھایا ہے کہ ہے زیست سے بیزار

کھل جائے گا شمشیر و سپر باندھ چکے ہیں
وہ دیر سے مرنے پہ کمر باندھ چکے ہیں

کچھ سوچ کے یہ کہنے لگا ظلم کا بانی — سچ ہے کہ نہ بچے گا یداللہ کا جانی
پر آپ گنواتے ہیں عبث اپنی جوانی — کوئی تو رہے خلق میں حیدرؑ کی نشانی
غصہ کے نہ اندوہ کے نہ طیش کے دن ہیں
راتیں ہیں یہ آرام کی یہ عیش کے دن ہیں

کیوں کرتے ہو بے فائدہ جینے سے کنارا — چھوٹا ہے ابھی عمر میں فرزند ہمارا
جب آپ نے دی جان تو گویا اسے مارا — عباسؑ جدائی کرو بھائی کی گوارا
مابین لحد ساتھ برادر نہیں جاتا
بھائی کوئی بھائی کے لئے مر نہیں جاتا

یہ سنتے ہی تھرا گیا اس شیر کا اندام — غصہ کے سبب سرخ ہوئی چشم سیہ فام
قبضہ کو جو دیکھا تو اُگلنے لگی صمصام — فرمایا کہ ظالم مجھے دیتا ہے یہ پیغام
شاید نہیں آگاہ مرے جد و پدر سے
ایسا ہوں کہ پھر جاؤں گا زہراؑ کے پسر سے

بس دُور ہو لگے نہیں سننے کی مجھے تاب — سر تن سے اتاروں ترا او ظالم کذاب
میں بھائی کا دشمن ہوں یہ ہے کونسا آداب — کیا قدر پھر اس کی ہے جو موتی کی گئی آب
رتبہ ہے یہ سب شاہ ولایت کا تصدق
ہم جانتے ہیں جان کو عزت کا تصدق

آگے مرے تو ذکر پسر کا مرے لایا — شبیرؑ کے بچوں پہ تجھے رحم نہ آیا

اصغر سے تو ہے سن میں زیادہ مرا جایا — پانی تو کہاں دودھ بھی جس نے نہیں پایا
دل سینہ میں ٹکڑے ہو کہ صدمہ ہو جگر پر
سو بیٹے ہوں تو صدقہ کروں ان کے پسر پر

ہوتا ہے چمن فاطمہؑ کا ظلم سے برباد — موسم یہ مرے عیش کا ہے اے ستم ایجاد
مارا گیا بیوہ کا پسر قاسمؑ ناشاد — روتے ہیں نبیؐ شبرؑ جدا کرتے ہیں فریاد
ہم سے جنھیں الفت ہے وہ ماتم میں رہیں گے
تا حشر اسے حشر کا دن لوگ کہیں گے

بھائی کے لئے جی سے گزر جاتا ہے بھائی — جاتا ہے برادر بھی جدھر جاتا ہے بھائی
کیا بھائی ہو تیغوں میں تو ڈر جاتا ہے بھائی — آنچ آتی ہے بھائی پہ تو مر جاتا ہے بھائی
نعشیں بھی بہم زیر زمیں ہوتی ہیں اکثر
قبریں بھی پس از مرگ قریں ہوتی ہیں اکثر

بھائی نے مرے کون سی کی مجھ سے برائی — پالا ہے مجھے جانتی ہے ساری خدائی
کیا کچھ نہ ملا کون سی عزت نہیں پائی — جاں ان پہ تصدق ہے اجل آئی تو آئی
ہم پائیں گے جو شرط محبت کی جزا ہے
نافہم اسی موت میں جینے کا مزا ہے

کافر ہوں کہ منہ قبلۂ ایماں سے پھراؤں — تو کوہ طلا دے تو میں لالچ میں نہ آؤں
فاقے ہوں تو بھائی کے عوض برچھیاں کھاؤں — مقتل سے تڑپتا ہوا ان قدموں پہ جاؤں
کس منہ سے کہوں میں کہ قرابت میں قریں ہوں
بھائی سے بھتیجے حسن میں تو غلام شہ دیں ہوں

بلبل کو کبھی ہجر گل تر نہیں بھاتا | پروانہ کہیں شمع کو ہے چھوڑ کے جاتا
ہے موت جو معشوق کو عاشق نہیں پاتا | قمری کو سوا سرو کے کچھ خوش نہیں آتا
شبیر جہاں ہے دل فرزانہ وہیں ہے
محفل میں جہاں شمع ہے پروانہ وہیں ہے

کہنے پہ چلوں تجھ سے جفاجو کے نہ ہے فہم | دوں رنج میں دل کو شہ خوش خو کے نہ ہے فہم
پہنچے انھیں دکھ ہاتھ سے بازو کے نہ ہے فہم | آنکھوں کی بدی سامنے ابرو کے نہ ہے فہم
ہٹ جا نہیں تیغ اب مری واللہ چلے گی
شیروں سے نہ یہ بازی روباہ چلے گی

جرأت کو جری نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے | آقا کو کسی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے
شبر کو اخی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے | احمدؐ کو علیؑ نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے
وہ ہم نہیں کرتے جو زمانے کا چلن ہے
دنیا میں وفا اپنے گھرانے کا چلن ہے

ہیں حشمت دنیا کی تمنا نہیں رکھتا | قطرہ کی طمع فیض کا دریا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا | پتے سے علاقہ سر طوبیٰ نہیں رکھتا
کافر کی طرف صاحب ایماں نہیں جاتے
بتخانہ کو کعبے سے مسلماں نہیں جاتے

بند ہائے بالا پر ریویو: واضح ہو کہ بند ہائے بالا میں میر انیس صاحب نے داخلی شاعری کے پہلو کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے اور ڈرامانگاری کا لطف بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ دکھلایا ہے ہر چند میر صاحب رزمی شاعری برتتے ہیں مگر بیان محبت

ہے کہ اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعری سے ڈرامانگاری نے وجود پکڑا ہے پس کوئی جائے
تعجب نہیں ہے کہ میر صاحب کے مراثی اعلیٰ درجہ کے ڈراما کا حسن انداز رکھتے ہیں ہومر
کی رزمی شاعری ڈرامانگاری کی موجد گزری ہے جیساکہ سابق میں عرض ہوچکا ہے لاریب
میر صاحب کی رزمی شاعری سے بھی یہ صنف شاعری وجود پذیر ہوسکتی تھی اگر اس عہد
کے عوض میر صاحب ہومر یا ہومر کے پہلے کا زمانہ اپنے ظہور کے لئے پائے ہوتے بہر
بحالت موجودہ میر صاحب کی رزمی شاعری بہت کچھ ڈراما کی اعلیٰ درجہ کی خوبیاں رکھتی ہے
اور اس پہلو سے بھی اہل مذاق صحیح کیلئے بہت کچھ قابل توجہ ہے اہل واقفیت سے پوشیدہ
نہیں ہے کہ ڈرامانگاری کی کامیابی کے لئے شاعر میں نہ صرف داخلی اور خارجی امور کی
بندش کی بڑی صلاحیت درکار ہے بلکہ ان دونوں کی آمیزش کی بھی بڑی قوت حاصل رہنی
چاہیئے میر صاحب کو یہ قوت بھی واہب العطایا نے بہ درجہ اتم بخشی ہے آپ کے تمام
مراثی آپ کی اس قوت کی شہادت دیتے ہیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اس قوت کے
بغیر کوئی شاعر رزمی شاعری کی داد نہیں دے سکتا ہے کما لایخفی علی اہل التحقیق ٭

جاننا چاہیئے کہ بندہائے بالا میں میر صاحب نے ابن سعد کی ترغیب دہی کے مضمون
کو حوالہ قلم فرمایا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ یزیدیوں کی طرف سے یہ کوشش عمل
میں لائی گئی تھی کہ آل مرتضیٰ ؑ سے کوئی آدمی بھی یزیدیوں کا ساتھ دیتا ۔ یہ ایسی ترکیب تھی
کہ کوئی بھی آل مرتضیٰ ؑ سے ان کا ساتھ دے دیتا تو واقعہ کربلا کا اور ہی نقشہ پیدا ہو
جاتا ۔ بالفرض اگر حضرت عباس علمدار عمر ابن سعد کے کہنے سے لشکر امام علیہ السلام
سے کنارہ کش ہوجاتے تو دنیا کو یہ کہنے کو ہوجاتا کہ یہ واقعہ ایسا تھا کہ حسین علیہ السلام کے
مخالفوں میں خود حضرت کے بھائی بھی تھے ۔ مگر حضرت عباس ؓ کب امام علیہ السلام سکے

مخالفت بن سکتے تھے یا کوئی بھی آل ہاشم سے حضرت کی مخالفت گوارا کر سکتا تھا اس وقت کے علویین کسی حالت میں اپنے خاندانی تعلقات سے علحدہ نہیں ہو سکتے تھے اور خاندانی دینی اور دنیوی تعلقات سے علحدہ ہونے کو ننگ جانتے تھے جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

اذا العلوی تابع ناصبیاً بمذہبہ فما ہو من ابیہ
وان الکلب خیر منہ طبعاً فان الکلب طبع ابیہ فیہ

یعنی جو علوی سید ناصبی کا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس سے کتا بہتر ہے اس لیے کہ کتا اپنے باپ کا طور قائم رکھتا ہے اس وقت کے آل مصطفیٰؐ اور اولاد مرتضیٰؑ جو طریقہ آبائی سے علحدگی اختیار کرتے گئے وہ ہیں ان چار مصرعوں پر نظر غور ڈال کر اپنی موجودہ حالت کا موازنہ فرمائیں۔ خیر۔ میر انیس صاحب اسی ترغیب دہی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں کہ عمر ابن سعد ضرورت وقت دیکھ کر حضرت عباس سے کہتا ہے کہ کچھ حاکم شام کا پیام ہے سن لیجئے۔ اگر حضرت عباس اس کا پیام سننے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حاکم شام مجھے کیا پیام بھیجے گا میں حضرت شبیرؑ کا بندہ ہوں مجھ سے بیوفائی ممکن نہیں تو اور تیری قوم کا شیوہ مکر اور بیوفائی ہے میں فرزند علیؑ ہوں فرزند علی دغا کے مرتکب نہیں ہو سکتے بالفرض اگر تو صلح کا پیام بھی لایا ہے تو اب صلح کا وقت نہیں رہا حضرت شبیرؑ کے دو بھانجے اور ایک بھتیجا مارے جا چکے ہیں حضرت امام ہرگز صلح پر راضی نہ ہوں گے۔ حضرت والا شمشیر و سپر باندھ کر جنگ کے لئے مستعد ہو چکے ہیں۔ اس تقریر کو سنکر ابن سعد بولا کہ لڑائی میں شبیرؑ تو مارے ہی جائیں گے آپ اپنے کو کیوں تباہ کرتے ہیں آپ جوان ہیں اور ابھی آپ کا لڑکا صغیر سن ہے آپ اپنی ہلاکت کیوں گوارا کرتے ہیں کوئی تو جہان میں حیدرؓ کی نشانی رہے آپ اپنی جان نہ کھوئیں ؎

حضرت عباسؑ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ سراپا وفا شعاری سے مملو نظر آتا ہے لاریب ان بند ہائے بالا میں حضرت عباسؑ کا کیریکٹر جس خوبصورتی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے احاطہ توصیف سے باہر ہے حضرت عباسؑ کی اخلاقی قوتیں از قسم شجاعت وفاداری استقلال خودداری بے غرضی انکسار وضعداری آزادی استغنا وغیرہ وغیرہ اس ندرت کے ساتھ دکھلائی گئی ہیں کہ اس کا جواب شاہنامہ تو کیا ایلیڈ کے کسی حصہ میں بھی نہیں پایا جاتا ہے، یہ چند بند حضرت عباس کے کیریکٹر کو اس صفائی کے ساتھ دکھلاتے ہیں کہ آپ دیگر شجاعان لشکر امام علیہ السلام سے ایک علیحدہ رنگ کے شجاع دکھائی دیتے ہیں آپ کے کردار سے آپ کا ایک خاص طرح کا جلال نمایاں ہے اور آپ کی گفتار سے آپکا ایک خاص طرح پر حضرت امام علیہ السلام کے ساتھ متمسک ہونا ظاہر ہوتا ہے واہ کیا حسن بیان ہے آپ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے کو امام علیہ السلام کا بھائی بھی دکھلاتے ہیں پھر امام حسنؑ کے مقابلہ میں اپنے کو امام علیہ السلام کا ایک بندہ بھی قرار دیتے ہیں یہ فرق مراتب کا مضمون نہایت عمدہ انداز سے حوالہ قلم ہوا ہے مختصر یہ ہے کہ اپنے زور قلم سے میر صاحب نے حضرت عباس علمدار کی ایک ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ دیکھنے والا ہزار شجاعوں میں آسانی کے ساتھ آپ کو پہچان لے سکتا ہے اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہی کیریکٹر نگاری رزمی شاعری کی جان ہے یہی طرح ہومر بھی بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ بہادران ٹرائی و یونان کے مختلف انداز کی ایسی تصویریں کھینچتا ہے کہ ہر بہادر ایک دوسرے سے علیحدہ دکھائی دیتا ہے مثلاً اس کے بیان سے اکیلیز اور ہکٹر ایسے دو بہادر نظر آتے ہیں۔ جن کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے کوئی بڑی صلاحیت درکار

نہیں ہے، اکیلیز ایک سفاک بے باک پر غیظ و غضب نبرد آزما کی تصویر پیش کرتا ہے اس کے برخلاف ہکٹر ایک متین، رحمدل مستقل مزاج اور مآل اندیش مرد میدان کا فوٹو سامنے لا کر رکھ دیتا ہے اس کیریکٹر نگاری نے ہومر کو جس کا ذکر ابو الفدا مورخ اپنی کتاب المختصر فی احوال البشر میں پیش کرتا ہے، ابو الشعراء کہلایا ہے اور لاریب اب اس خطاب کے تمامتر مستحق میر صاحب ہیں کیا کسی کو معلوم تھا کہ زمانہ ہومر سے سیکڑوں صدیوں کے بعد ہندوستان میں پھر ایک ایسا شاعر گرامی اُرندہ جان کا پیدا ہوگا جس کو ابو الشعراء نہیں کہنا ایک عظیم حق تلفی کا حکم رکھتا ہے، مگر افسوس ہے کہ جس قدر ہومر کی شہرت دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اسی قدر میر صاحب کی شہرت دنیا کے ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو رہی ہے میر صاحب کی قوت شاعری سے یورپ کو بے خبر نہیں رہنا چاہیئے، مسلمانوں میں ماشاء اللہ اس وقت نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی صاحب بالقابہ ایک ایسے جوہر یکتا موجود ہیں کہ اگر نواب ممدوح میر صاحب کی قابلیت شاعری سے انگلستان کو باخبر کرنا چاہیں تو اُن صاحب سے یہ کار دشوار کسی حد تک انجام پا سکتا ہے میں نواب ممدوح کی تخصیص اس لیئے کرتا ہوں کہ وہ صاحب انگریزی زبان کے پورے ماہر ہیں، انگریزی میں جو ان کی نظمیں فقیر کی نظر سے گزری ہیں وہ اس کی شاہد ہیں کہ نواب ممدوح انگریزی زبان پر غیر معمولی طور سے قادر ہیں اور انگریزی شاعری کا عمدہ مذاق بھی رکھتے ہیں علاوہ عربی، فارسی وغیرہ کے اُردو ان کے لیے زبان مادری کا حکم رکھتی ہے اگر نواب ممدوح میر انیس کی روح کو خوش نہ کر سکیں تو پھر ہم مسلمانوں میں ظاہر اً نواب ممدوح کے بعد مسٹر حامد علی خانصاحب بیرسٹر لکھنؤ کو مستثنی کر کے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا ہے جو اردو اور

انگریزی پر یکساں قدرت اور اس کے ساتھ اچھا مذاق شاعری بھی رکھتا ہو۔

نمبر ۲:- صبح شب عاشورہ اور نماز صبح کا بیان :-

مضامین بالا کا دوسرا نمونہ

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے — سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے — مڑ کر رخ اکبرؑ پہ نظر کی شہ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

دنیا میں ازل سے سحر ایسی نہیں آئی — یہ صبح دکھائے گی بھرے گھر کی صفائی
دولت نہ رہے گی نہ بضاعت نہ کمائی — بیٹے سے جدا ہوگا پدر بھائی سے بھائی
آج احمدؐ و حیدرؑ کے گریبان پھٹیں گے
اٹھارہ بنی فاطمہؑ کے حلق کٹیں گے

بندہ وہی جو دکھ میں رہے صابر و شاکر — اک جاں ہے سو موجود ہے اک سر ہے سو حاضر
بہتر ہے اٹھے جتنا سبک بار مسافر — یہ مرحلۂ عمر کی ہے منزل آخر
خلقت ہمیں سر پیٹے گی روئے گی جہاں میں
اب صبح کوئی ہم کو نہ ہووے گی جہاں میں

جو اہل حرم پردۂ عصمت میں ہیں مشہور — کھل جائیں گے انبوہ میں ان کے سر پر نور
جلے سے نئی رانڈ نہ نکلے یہ ہے دستور — ان رانڈوں کا خیمہ بھی جلاوینگے یہ مقہور
غش ہوگی کبھی اور کبھی بستر سے گرے گی
زہراؑ کی بہو شام میں سر ننگے پھرے گی

مرنا ہے پدر جس کا اُسے دیتے ہیں پرسا　　ہووے گی یتیموں پہ مرے قید کی ایذا
آزار میں عابد پہ ستم ہوئیں گے کیا کیا　　لے جائیں گے تا شام اُسے کانٹوں پہ اعدا
اک حشر بپا تخت میں اور فوق میں ہوگا
بیڑی میں قدم ہوں گے گلا طوق میں ہوگا

یہ کہہ کے بجھے بحر یتیم شہ صفدر　　جنگل میں اذاں دینے لگا دلبر سرور
وہ صورت حسن اور خوش الحانی اکبرؑ　　ہر شخص کو یاد آ گئی آواز پیمبر
ہر نخل کو اک وجد تھا اس ظلم کے بن میں
تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اکبرؑ کی صدا سنتے ہی زینبؑ یہ پکاری　　تا حشر رہے خلق میں آواز تمہاری
قربان موذن کے نمازی کے میں واری　　قائم یہ جماعت رہے یا حضرت باری
ہر شام یوں ہی طاعت معبود ادا ہو
ہر صبح کو اس دین کے ڈنکے کی صدا ہو

آگے تھا عبا اوڑھے ہوئے شاہ حجازی　　پیچھے تھے صفیں باندھے ہوئے سارے نمازی
ابرار جہاں فخر زماں صفدر و غازی　　تھی ان پہ خدا کو نظر بندہ نوازی
دنیا میں یہ رتبے نہ کبھی ہوں گے کسی کے
معراج میں تھے ساتھ حسینؑ ابن علی کے

وہ چاند سے چہرے تھے سپید اُن کی عبائیں　　وہ خشک لبانوں پہ اثر دار دعائیں
لیجے وہ عرب کے وہ خوش آئند صدائیں　　مشتاق تھیں حوریں کہ یہ جلدی ادھر آئیں
اک جوش محبت انھیں دکھلاتا تھا کوثر

گیا سب کی ملاقات پہ لہراتا تھا کوثر

تسبیح و وظائف سے ہوئی جبکہ فراغت　　حضرت نے پڑھی اُٹھ کے محمدؐ کی زیارت
بس ہو گئی اک مجلس ماتم وہ جماعت　　فرما کے یہ اُن سب سے گئے خیمہ میں حضرت
باہر علم فوج خدا لاتے ہیں جلدی
سب لوگ مسلح ہوں کہ ہم آتے ہیں جلدی

حضرات ناظرین میر انیس صاحب کے کن کن کلام کی داد دی جائے، جہاں سے جس مرثیہ کو پڑھیئے اس کا ہر شعر ہر مصرع داد طلب ہے، بند ہائے بالا صبح عاشورہ اور نماز صبح کی کیفیتوں سے خبر دیتے ہیں، ان بندوں میں مضامین کے خارجی اور داخلی (SUBJECTIVE AND OBJECTIVE) دونوں پہلو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوتے گئے ہیں مگر اُن کی آمیزش نے اور بھی زیادہ مزہ پیدا کر دیا ہے مضامین بند ہائے بالا یہ ہیں؛ کہ حضرت امام علیہ السلام رات عبادت میں بسر کر چکے ہیں، صبح ہوتی آتی ہے معلوم ہے کہ آج شہادت کا دن ہوگا حضرت علی اکبرؑ کی طرف مُڑ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بیٹا اُٹھو اذان صبح دو، یہ کام کہ روز قتل کے پہلے کی رات اس اطلاع کے ساتھ کہ روز قتل آنے کو ہے، انسان عبادت میں بسر کرے، سوا اس کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنی جانب سے شہ دین اور امام المومنین بنایا ہے، اللہ اکبر، خدایا! آپ کا یہ اطمینان اور تکیہ اس طرح پر راضی برضا رہنے کی توفیق، پھر جب وقت فریضۂ سحری کا آتا ہے تو امام عالی مقام اپنے صاحبزادے کو اذان صبح کی ہدایت فرماتے ہیں، غرض کسی وقت عبادت کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں ہے، یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ صرف امام من جانب اللہ کے لئے مختص

کی گئی ہیں، امام کو جیسا ہونا چاہیئے اور امام کو جیسا کرنا چاہیئے اس بات کو میر صاحب کا بندلاول نہایت خوش اسلوبی سے دکھا رہا ہے پھر امام علیہ السلام بیٹے کو خبر دیتے ہیں کہ یہ عاشورہ محرم کی سحر ہے اولاد پیمبر کے قتل کا دن ہے، اٹھارہ بنی فاطمہؓ کو پھر نماز سحر نصیب نہ ہوگی ایسی سحر جو بھرے گھر کی صفائی دکھلائے گی، پھر دکھلائی نہ دے گی مگر بندہ کو صابر و شاکر رہنا چاہیئے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ اس کے بعد آپ کے اہل حرم کا کیا حال ہوگا اور کیا کیا مصیبتیں انھیں لاحق ہوں گی، ان باتوں کو ارشاد فرماکر حضرت امام علیہ السلام تیمم کے لیے بڑھے، پانی تو بنا ہی تھا، وضو کس سے فرماتے - خیر علی اکبر اس صحرا میں اذان دینے لگے خوش الحان بہت تھے ہر شخص کو آواز پیمبرؐ یاد آگئی، سامعین کا جو حال ہوا ہوگا محتاج بیان نہیں ہے حضرت علی اکبرؓ کی صدائے اذان سن کر حضرت زینبؓ دعائیں دینے لگیں، یہ تعلق حضرت زینبؓ کا حضرت علی اکبرؓ کے ساتھ ایک خاص وجہ رکھتا تھا وہ یہ کہ آپ نے انھیں پالا تھا، میر صاحب اپنی فطرت نگاری سے کہیں چوکتے نہیں ہیں، اذان ہونے کے بعد امام علیہ السلام نے امامت فرمائی، نماز جماعت کے ساتھ انجام پائی، امام اور نمازیوں کی تصویر جیسی میر صاحب نے کھینچی ہے کب کسی سے کھینچ سکتی ہے بعد نماز حضرت خیمہ اطہر میں یہ فرماکر تشریف لے گئے، کہ سب لوگ مسلح ہو جائیں ہم خدا کا علم لے کر آتے ہیں، سبحان اللہ سبحان اللہ کیا شاعری کا انداز ہے، خیالات کا سلجھاؤ، بیانات کا بے ساختہ پن، مضامین کا ارتفاع - فطرت کی تبعیت، طبیعت کی روانی، ادائے خیالات کا زور، کلام کا تناسب اور ان خوبیوں کے ساتھ مرثیت کا قیام، یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں کہ غیر موید من اللہ شاعر کا حوصلہ پست کر دینے والی ہیں، واضح ہو کہ بند ہائے بالا تمام تر مذہبی پہلو رکھتے ہیں

جو اشخاص نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ عبادت خدا کی توفیق رکھتے ہیں اُن کو ایسے کلام سے کیا حظ نصیب ہو سکتا ہے صبح کی نماز کیا دولت ہے اس کو وہ کیا جانے جس نے نہ پڑھی نہ قضا کی، افسوس ہے کہ نماز کی قید اُن حضرات میں نہیں دیکھی جاتی ہے جو ہندوستان میں اب تعلیم یافتہ مسلمانان کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اس وقت شاید ہزار تعلیم یافتہ اشخاص میں ایک ایسا شخص نکلے گا جو فریضہ پنجگانہ کو ادا کیا کرتا ہوگا، یورپ کی تعلیم عجیب ملحد خیز انداز رکھتی ہے عیسائی عیسائیت سے آزاد اور مسلمان مسلمانیت سے دُور ہو جاتا ہے پھر کالے گورے سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں معاد کا مضمون ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے واہ ری تعلیم یورپ تیرا کیا کہنا ہے ؎

کفر و اسلام کے جلوے تم سے ایک کیا ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا

مضامین بالا کا تغیر المونہ :-

وہ صبح اور وہ چھپا نو ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا اگلوں سے قدرت اللہ کا ظہور وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزہ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعت قلم آفریدگار   تھی ہر ورق پہ صنعت ترصیع آشکار
عاجز ہے فکر شعرائے ہنر شعار   ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار
عالم تھا محو قدرت رب عباد پر
مینا کیا تھا وادی مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا   دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار   بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زہر گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم   کو کو کا شور نالۂ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم   جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار   اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار   تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کردگار
طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں

جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کانوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول
خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

دنیا کی زیب و زینت کاشانۂ بتولؑ
وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسولؐ

ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

بند ہائے بالا پر ریویو :- اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مناظرِ قدرت کے بیانات فارسی کی شاعری میں گویا مفقود ہیں۔ اس زبان کی شاعری کا مدار تشبیہ استعارہ اور مبالغہ پر معلوم ہوتا ہے۔ خاقانی کو دیکھئے یا قاآنی کو پڑھئے کہیں بھی نہ صبح نہ شام نہ کسی سینری یا سین کا بیان فطرتی انداز پر دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے شعراء کو بھی مناظرِ قدرت کی طرف میلانِ طبعی نہ تھا یا اُن کی شاعری کی ضرورتیں اُن کو اِن دلآویز معاملات کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی تھیں۔ اُردو کے شعراء کا بھی یہی حال دیکھا جاتا ہے مگر مناظرِ قدرت کی طرف حسبِ مراد طور پر توجہ کرنے کی پہلی مثال میر انیس صاحب ہیں۔ بند ہائے بالا میں میر صاحب نے صبح کی کیفیت کو صراحت کے ساتھ نہایت دلکش انداز پر زیبِ رقم فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے صبح کی ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے۔ صبح کا نور ستاروں کی چھاؤں کلیوں کی نمود طیور کی تسبیح خوانی پھولوں کی بو سے جنگل کا بسنا، ہوا کی ٹھنڈک سبزۂ صحرائی کی لہک درختوں کا جھومنا پھولوں کی مہک برگِ گل پر قطرۂ شبنم کی جھلک دشت کا سہانا پن دراج و کبک و تیتر و طاؤس کی آوازیں کثرتِ وحوش مرغانِ خوش الحان کے نالے گلہائے گوناگوں کی کثرت جگر کو خنکی پہنچانے والی صبح کی ہوا پھولوں کے سبز سبز درخت اُن پر لال لال پھول النسیم کے جھونکے سبزہ زار کا عالم شاخوں کا جھوم جھوم کر بار بار اٹھنا قمریوں کا شور اور ان کے

نارحق شرہ کی دھوم زبان حال سے صرف گلوں کا مدح خداوند تعالیٰ نہیں کرنا بلکہ خاروں کا بھی نوکِ زبان سے خدمت حمد بجالانا، چیونٹی تک کا ہاتھ اٹھا اٹھا کر ادائے سپاس آلٰی کرنا ہر طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدا، طیور کی محویت ہوا کے ساتھ، ہرن کی محویت سبزہ زار سے جنگل کے شیروں کا پچھاڑیں ہونکنا یہ سب کے سب صبح کے متعلق ایسے مضامین ہیں کہ کسی فارسی یا اردو کے شاعر کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکے ہیں واقعی اس جگہ میر صاحب نے اپنی خارجی شاعری کا کمال دکھلایا ہے پھر ان خارجی مضامین سے داخلی اثر جو نفس ذہن پہ پیدا ہوتا ہے وہ ایسا عالم رکھتا ہے جو بیان سے باہر ہے، اگر یہ کمال فن نہیں کہیں گے تو کسے کہیں گے ایسی صبح فردوسی کو تو کیا ہومر کو بھی نصیب نہیں نہیں ہوئی ہے واقعی میر صاحب ایک حیرت انگیز شاعر گزرے ہیں، تبعیت فطرت کے ساتھ آپکے مضامین کی پرواز ہمیشہ اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے پستی کی طرف تو طبیعت کبھی رخ ہی نہیں کرتی اس شاعری کو اعجاز نہیں کہیں تو کیا کہیں الحق میر صاحب کی شاعری ایک الہامی شاعری تھی کسی کی مجال ہے کہ اس لاویزی کے ساتھ بڑے بڑے نازک اور بلیغ خیالات کو اس رواں دواں طور پر سامعین کے گوش قبول تک پہنچا سکے بند ہائے بالا سے ظاہرا یہی معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو معاملات فطرت پر بڑی نظر حاصل تھی اور علم حیوانات وغیرہ میں بھی پورا دخل تھا مگر کب حضرت دشت و صحرا میں قیام پذیر ہوئے صحرائی گل ولالہ کی سیر کی وحوش و طیور پر محققانہ نظر ڈالی، یا کب آپ نے علم حیوانات کی تحصیل فرمائی اس کا کوئی پتا راقم کو نہیں ملتا ہے، لاریب تائید غیبی کے بغیر ایسے اشعار کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکل سکتے ہیں، راقم کو تو میر صاحب کی نسبت پورا یہ عقیدہ ہے کہ آپ ملہم اور موید من اللہ تھے ۔

واضح ہو کہ بند ہائے بالا سے پورے طور پر وہی شخص لذت یاب ہو گا جس نے صحرا نشینی اور دشت نوردی میں اپنی عمر کا ایک کافی حصہ بسر کیا ہے خانہ نشین کیا جانے کہ صحرا جنگل و دشت وغیرہ کا کیا عالم ہوتا ہے، کیونکر گل صحرائی پھولتے ہیں، جنگل کی ہوا کیسی ہوتی ہے طیور و وحوش کیا عالم رکھتے ہیں، اس طرح کی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں صحرا نشین اور دشت نوردی جانتے ہیں اور دوسرا نہیں جانتا، اس وقت میر صاحب کے ان بندوں نے راقم کو کیا کیا گذشتہ سیریں یاد دلادی ہیں، کیا کیا دشت و صحرا دل کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں، کیا کیا مناظر قدرت جو اس وقت چشم ظاہر کے سامنے نہیں ہیں دیدہ باطن کے پیش نظر ہو رہے ہیں واہ میر صاحب کیا کہنا ہے، سبحان اللہ، آپ بڑے پُر تاثیر فطرت نگار ہیں مگر آپ کے کلام سے لذت یاب ہونے کے لئے ضرور ہے کہ انسان خود بھی فطرت پسند اور فطرت فہم طبیعت رکھے اور معاملات فطرت سے بقدر طاقت بشریہ خوب واقف بھی ہو۔ کوپر (COUPER) اور ٹامسن (THOMPSON) یہ دو انگریزی شاعر ایسے تھے جو خلقت سے صحرا پسند تھے اور آبادی سے ویرانہ کو زیادہ دوست رکھتے تھے، ان دونوں کے کلام ان کی افتادِ طبیعت کا پورا رنگ دکھلاتے ہیں ظاہر البیانی معلوم ہوتا ہے کہ اگر صحرا پسندی ان کی سرشت میں داخل نہیں ہوتی تو ان کے کلام کا رنگ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ دیکھا جاتا ہے، تعجب ہے میر صاحب سے کہ نہ جنگل میں رہے نہ صحرا میں، مگر جنگل صحرا وحوش و طیور سب کی تصویریں ہو بہو کھینچ لیں۔ کسی طرح کا مضمون ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے ذاتی متعلقات کے اندر ہے، یہ الہامی شاعری نہیں ہے تو کیا ہے، اگر یہ شاعری الہامی نہیں ہے اور اس حیثیت سے ہر شخص برت سکتا ہے تو دنیا کے مولانا، پیر، فقیر، عابد، زاہد، عالم فاضل، ناظم، نثار سے کیوں کوئی حضرت چار بند میر صاحب کے انداز کے تحریر فرما کر سخن سنجی کا جلوہ نہیں دکھلاتے ہیں۔

نمبر ۴: رجز امام حسین علیہ السلام

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا — سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا — قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھر طور تجلّے ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلّا ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے — کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے — تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے

تھا کون جو ایمان نہ صمصام نہ لایا
اُس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

اصنام بھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے — طاقت تھی کہ عزیٰ کو کوئی لات سے مارے
ہر کیشوں نے سجدے بھی کیے ہاتھ بھی جوڑے — بلے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے

کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے
نکلے اسد اللہ اذاں دے کے حرم سے

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار — کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار — بجلی کی ہے بجلی ہے تو تلوار کی تلوار

قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

گر فیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا — بالائے زمین گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا — ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا

یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب بھیجتے تو یہ اسلام کہاں تھا

حضرت عباسؑ کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو — لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو — آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علی کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں — شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
طاقت نہ ایک کو دم جنگ و جدال دیں — پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منہ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے
لیجائیں گھر یہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر — دادا شجاع باپ جوانمرد ہم دلیر
جب رن پڑا ہے کر دیئے ہیں زخمیوں کے ڈھیر — لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں جو چوٹیں ہماری ہیں
بیرالعلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں — سر کاٹتے ہیں پیر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں خیروں کے حملے کتاب میں — فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

بند ہائے بالا پر ریویو: واضح ہو کہ بہادران عرب کا یہ دستور تھا کہ میدان جنگ میں اپنے ہم نبرد کے آگے مفخریہ کلام بیشتر نظم کی شکل میں پڑھا کرتے تھے اور بعد ازاں مشغول پیکار ہوتے تھے اس خودستائی کو رجز کہتے ہیں۔ رجز خوانی کا دستور مومنین اور ملاحدہ دونوں میں تھا مثلاً میں خیبر کی جنگ کی مثال پیش کرتا ہوں اس جنگ کی سرگذشت یہ ہے کہ خیبر کا قلعہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور اس کے سردار مرحب اور اس کا بھائی حارث تھے یہودیوں نے رسول اللہ کے ایلچی کو مار ڈالا تھا اس لیے آنحضرتؐ نے ان پر لشکر کشی کی تھی۔ مدینہ سے رسول اللہ کی روانگی کے وقت علی علیہ السلام کی آنکھیں جوش کر گئی تھیں جس کے باعث آپ مجبوراً مدینہ میں رہ گئے تھے جب یہودیان خیبر سے مسلمانوں کا سامنا ہوا تو مرحب اور اس کے بھائی نے دو روز تک پیہم مسلمانوں کو شکست دی دو دن تک یہ حالت گذرا کی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جو لشکر اسلام کے تھے ان دونوں بھائیوں سے شکست کھاتے رہے اور وہ دونوں بھائی ان دونوں علم برداران لشکر اسلام کا تعاقب خیمہ رسول تک کرتے رہے یہ یہودی فتح کے قریب ہو چکے کہ مرحب اور اس کا بھائی سنخان تمام مسلمانوں کو ستاتے تھے مگر لشکر اسلام میں کوئی ایسا بہادر نہ تھا کہ ان ملعونوں کا سامنا کرتا ایسی نازک حالت میں علیؑ حضرت رسولؐ کی پیشین گوئی کے مطابق حضور رسالتمآب میں آ پہنچے رسول اللہ نے لشکر اسلام کا علم علیؑ کو تفویض فرمایا ابھی تک فاتح خیبر کی آنکھوں کا جوش کم نہیں ہوا تھا۔ مگر رسول اللہ نے اپنا لعاب دہن علی مرتضیٰؑ کی آنکھوں پر لگا دیا جس سے وہ جوش چشم جاتا رہا علی مرتضیٰ نے قلعہ خیبر کے سامنے مرحب سے مقابلہ فرمایا۔ وقت مقابلہ مرحب نے یہ شعر رجز کا پڑھا:-

قد علمتنی خیبر انی مرحب   شاکی السلاح بطل مجرب

اس پر علی مرتضٰے نے جواب میں فرمایا :-

انا الذی سمتنی امی حیدرہ   نکیلہم بالسیف کیل السندرہ

الحاصل ذوالفقار حیدر کرار نے دونوں بدبختوں کو فی النار کر دیا ، خیبر کا قلعہ فتح ہو گیا اور رسول اللہ نے کامیابی کے ساتھ مدینہ کو معاودت فرمائی ، معلوم ہوتا ہے کہ علی مرتضٰے نصرت دین خدا کے واسطے مخصوص ہوتے تھے ، لاریب اگر علی کی تلوار نہ ہوتی تو بدر خندق اور خیبر اور حنین کی فتحیں دین خدا کو نصیب نہیں ہوتیں (دیکھو جلد اول اس کتاب کی) اور بھی اسلام کو کسی طرح کا استحکام حاصل نہیں ہو سکتا ، پیغمبر خدا کے زمانہ کا اسلام بلا شبہ بے شک بہت کچھ علی کی تلوار کا منت کش نظر آتا ہے ؛

شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب حنفی رئیس عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطلع کس قدر قرین حق ہے ، آپ فرماتے ہیں ؎

جوہر نصرت عیاں از تیغ ابروے علی   شد قوی دین نبی از زور بازوے علی

بالمختصر رجز خوانی مبارزان عرب کا عام طریقہ تھا ، فارس کے بہادروں میں اس کا رواج کمتر دیکھا جاتا ہے شاہنامہ فردوسی میں ایک مقام پر رجز خوانی کا انداز پایا جاتا ہے وہ اس طرح پر ہے کہ جب رستم نے گیو کو شاہزادہ کیخسرو کے ملک افراسیاب سے لے آنے کے لیے روانہ کیا تھا تو گیو اپنی تعریف میں اپنے دشمن کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ میں رستم سے نبرد آزمائی سے کم نہیں ہوں میری قوت اور میری بہادری کا امتحان پہلے رستم لے کر لیا تھا تب مجھے اپنی بیٹی دی وغیرہ وغیرہ ؛

دونوں رجز بالا جو ایک منسوب امام علیہ السلام اور دوسرا حضرت عباس کی طرف ہے

کیا خوب پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں، دونوں رجز کا بین فرق یہ ہے کہ ایک امام وقت کا رجز ہے اور دوسرا اُس بہادر کا جو قریب بہ نشتۂ منا ہے پیرو اور جاں نثار امام علیہ السلام کا ہے میر انیسؔ صاحب کو کیریکٹر نگاری اور فرق مراتب کے دکھلانے میں ایک حیرت انگیز دستگاہ حاصل تھی ظاہر ہے کہ یہ باتیں رزمی شاعری کی جان ہیں انھیں باتوں نے ہومر کو ابو الشعراء کہلایا ہے اور انھیں باتوں سے ملٹن نے رزمی شاعری میں ایک بڑی شہرت حاصل کی ہے؛

نمبر ۵: شیریں امام علیہ السلام کی آمد کی خبر پاکر مہمانی کا سامان کرتی ہے :-

یہ کہہ کے اُس نے فرش کیا گھر میں سر بسر
مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہرِ شہنشاہِ بحر و بر
تکیوں کو صاف کرکے لگایا ادھر ادھر
کہتی تھی پھر کے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغر کے واسطے
یہ گھر شاہِ دین کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشین پہ امامِ زمن رہیں
حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولھا دولھن رہیں

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی
تختوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجاتے میں بہرِ شکر کبھی سر جھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزندِ فاطمہ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام
کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امام

بھر بھر کے آبِ سرد کے رکھوا ہوا ہیں جام   لبریز آبِ گرم کے کر دو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤں گی
ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دھلاؤں گی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار   اب کیجیو زیارتِ سلطانِ نامدار
ہے باغِ فاطمہ پہ عجب حُسن کی بہار   رشکِ ریاضِ خلد ہے ایک ایک گلعذار
سب نونہالِ گلشنِ دیں لاجواب ہیں
قد سروِ باغِ حسن ہیں رُخ آفتاب ہیں

شمشادِ بوستانِ پیمبر کو دیکھیو   سروِ ریاضِ حضرتِ شبر کو دیکھیو
کیا نوجواں ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو   سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو
ہوگا کبھی یہ حُسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اُس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اُسے صد سالہ برقرار   نامِ خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار   سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیرِ تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیری کا چاند ہے

اب خیریت سے گذرے گا وہ اٹھارہواں جو سال   شادی کریں گی بیٹے کی بانوئے خوش خصال
زینب کو اس کے بیاہ کا ارماں ہے کمال   ہر دم یہی دعا ہے کہ دولہا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہووے گی دھوم سے

جب ڈھل گئی اسے انہیں باتوں میں دوپہر　　شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکو سیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر　　اُترے ہیں کہاں کسی سے مفصل سنی خبر
بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم　　لونڈی کو سرفراز کرو یا شہِ اُمم
کرتے ہیں اغنیا غربا پر سدا کرم　　اب بے حضور چین نہیں مجھ کو ایک دم
کچھ آج ہے طپش سی دل بے قرار میں
آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دُور　　خاصہ تناول آن کے یہاں جا کریں حضور
ہم لوگ مشت خاک ہیں حضرت خدا کے نور　　ہوگا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشک طور
کہنا حضور راہ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عرصہ ابھی ہے آپ کے آنے میں کچھ اگر　　آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اس قدر
ڈیوڑھی پہ بند و بست ہے یا شاہ بحر و بر　　گڑوا رکھی ہیں میں نے قناتیں ادھر اُدھر
محمل میں گھٹتی ہوئیں گی زہرا کی پیاریاں
عباس لے کے آئیں زنانی سواریاں

عوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب اہل حرم میدان کربلا سے قید ہو کر شام کو روانہ ہوئے تو راہ میں ان حضرات کو قلعہ شیریں جو ایک کوہ پر واقع تھا ملا، وہاں شیریں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ شیریں ایک آزاد کردہ لونڈی حضرت امام علیہ السلام کی تھی۔ آزاد ہونے

پہاسی قلعہ دار سے اس کا بیاہ ہو گیا تھا شیریں اپنے شوہر کے ساتھ نہایت آرام سے زندگی بسر کرتی تھی اور اس کو پوری خوش حالی نصیب تھی جب اہل حرم کی آمد کی خبر شیریں کو ہوئی تو اس نے مہمانی کا سامان کیا، یہ خبر اسے نہیں پہنچی تھی کہ امام علیہ السلام مع علی اکبر و قاسم و عباس و عون و محمد شہید ہو چکے ہیں، وہ سمجھ رہی تھی کہ امام علیہ السلام اپنے لوگوں کو لیئے ہوئے اس کی جانب تشریف لا رہے ہیں بند ہائے بالا شیریں کی مہمانداری کے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں میر انیس صاحب کے بیانات ہمیشہ فطرتی انداز کے ساتھ ادا قلم ہوتے ہیں کس قابلیت شاعرانہ کے ساتھ مہمانداری اور اس کے متعلقات کی تصویر کشی آپ نے فرمائی ہے میر صاحب کس قادر الکلامی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی مہمانداری کے سامان لیے محترم مہمانوں کی آمد کی خوشی جو شیریں کو تھی ہمسائیوں سے اس کا اظہار پھر یہ کیسے مہمان ہیں اس کے پر جوش محبت آگین اور عقیدت مندانہ بیانات پھر مہمانان عالی مقام کی تشریف آوری میں جو دیر ہوئی تو شیریں کا شوہر سے یہ کہنا کہ تو جا اور دیکھ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اب تک کیوں نہیں تشریف لائے یہ انتظار اور اضطراب کا عالم پھر شوہر کو حضور امام علیہ السلام میں پیام لے جانے کی ہدایت وغیرہ وغیرہ ایسی ایسی خوبصورت مصوریاں ہیں کہ جن کا انجام میر صاحب ہی کے قلم کا کام تھا حقیقت یہ ہے کہ ہر مرثیہ میں مرثیت کا قائم رکھنا تناسب کلام کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا اور ہر قدم پر فطرت کا پیرو رہنا یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے یہی خوبصورت تصویر کشیاں ہومر کی ایلیڈ میں دیکھی جاتی ہیں اور ورجل اور ملٹن نے بھی ہومر کے تتبع میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھلایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دونوں شاعروں نے اپنی اپنی تصنیف میں ابو الشعراء کی تبعیت سے بہت سی مدد پائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جہر تنہ ہے میر انیس کے کلام

پر کہ جو یقیناً ان تینوں شعراء نامور سے مطلق خبر نہیں رکھتے تھے مگر فطرت نگاری اور شاعرانہ معلومات میں کم سے کم اپنی استعداد خاص کی بدولت خود ہومر کے ہم پلہ نکلے یا اس سے بھی گرامی تر ثابت ہو سکے

مرزا دبیر صاحب کے کمالات: واضح ہو کہ ایک مرثیہ سلطان الذاکرین جناب مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کا فقیر کی نظر سے گزرا ہے جو بندہائے بالا کے مضامین سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب اہل حرم واقعہ کربلا کے بعد حالت اسیری میں دمشق کو جا رہے تھے تو قلعہ شیریں تک جس وقت پہونچے، شیریں اس کی اُمیدوار ہوئی کہ جناب امامؑ اس کے مہمان ہوں جناب مرزا صاحب غفران مآب کے مرثیہ کا پہلا مصراع یہ ہے کہ

جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے

یہ مرثیہ لاریب بے بدل ہے اس مرثیہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی جناب ممدوح بڑے خلاق سخن اور عالی طبیعت تھے، لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے، آپ کی مرثیہ نگاری کا بکا ہے اور کوئی شک نہیں یہ مرثیہ حضرت کا بہت مبکی ہے اسی طرح حضرت کے بہت سے اور بھی مراثی ہیں جو نہایت مبکی ہیں، میری دانست میں حضرت کو سلطان الذاکرین نہیں کہنا ایک بڑی حق کشی ہے جناب غفران مآب ایک بڑے مذہبی شاعر تھے، حضرت کو اس کی بھی بقدر استعداد پابندی تھی کہ بالکل وضعی روایات سلسلہ نظم میں دخل نہ پائیں، لاریب میر انیس صاحب مرحوم ایک بڑے رزمی شاعر تھے اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہومر یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ کا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جا سکتا ہے، مگر میر صاحب کا موازنہ مرزا صاحب کے ساتھ جبکہ یہ دونوں شاعری کے جداگانہ پہلو دل کو برتتے ہیں کوئی معقول شکل نہیں رکھتا ہے رزمی شاعر کا موازنہ رزمی شاعر کے ساتھ اور

مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی شاعر کے ساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا مگر بے جوڑ موازنہ سے نہ کوئی معقول نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے اور نہ اہل مذاق کو ایسے موازنہ سے کوئی حظ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ شاعری سے علیحدہ ہو کر جناب مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ فی الجنۃ کا درجہ جو حوصلۂ انسانی کو پست کر دینے والا نظر آتا ہے آپ تمام تر صفات ملکوتی سے متصف اور ارباب خاصان خدا سے تھے اولیاء خدا کی خوبیاں واہب العطایا نے حضرت کو بخشی تھیں، آپ کی سخاوت و ایثار شہرہ آفاق ہے علم و فضل کے ساتھ توفیق عبادت بہت کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی، اخلاق محمدی کے آپ پورا نمونہ تھے جود و سخا بذل و عطا میں اپنے جواب آپ تھے۔ طبیعت بے حد شریف اور غیور پائی تھی منکسر مزاجی خاکساری اور فروتنی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے خوش مزاجی خوش اخلاقی خوش اوقاتی آپ پر ختم تھی عمر بھر کبھی کسی کی غیبت نہیں کی تا زیست کسی سے ترش ہو کر نہ بولے رفتار گفتار کردار سب میں یکتائے وقت تھے، بالمختصر حضرت کی خوبیاں حضرات اہل بیت علیہم السلام کی خوبیوں کا تمام تر پرتو تھیں حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کے آپ مداح تھے اُن کے تفضلات آپ کے شامل حال تھے، جناب ممدوح فقیر کے والد ماجد شمس العلماء سید حمید الدین خاں بہادر مرحوم و مغفور کے بڑے دلی دوست تھے راقم الحروف کو بڑی عقیدت مندی جناب غفران مآب سے تھی اور آج تک ہے خدایا تو مجھ بندہ گنہگار کے جرائم کو اس سلطان الذاکرین کے صدقہ میں معاف فرما اور اس کے ممدوحین معصومین کے طفیل میں مجھ مبتلائے عصیاں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

نمونہ کلام مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ

بانو کا ہوا عقد جو سلطان امم سے ہمراہ کنیزیں کئی آئی تھیں عجم سے

ایک ایک کو آزاد کیا فرطِ کرم سے — شیریں رہی خدمت کو پر آزاد تھی غم سے
کیا بانوئے شبیر کی شیریں کو ولا تھی
دل اُن پہ تصدق تھا تو جاں اُن پہ فدا تھی

اک دن لبِ شیریں سے کہا شہ نے یہ ناگاہ — کیا چشم ہے شیریں کی نہ ہے صنعتِ اللہ
آراستہ بانو نے کیا اس کو بصد جاہ — اور عرض کی لاریب یہ خوش چشم ہے یا شاہ
سب خاک ہیں تم فاطمہ کے نورِ بصر ہو
ہے عین خوشی میری جو منظورِ نظر ہو

شیریں تو ہے کیا چیز بھلا تم پہ ہیں واری — ہے جان جو شیریں وہ نہیں آپ سے پیاری
شیریں مری لونڈی ہے میں لونڈی ہوں تمہاری — لو نذر میں کرتی ہوں یہ اے عاشقِ باری
مطلب تو ہے خوشنودی شاہِ دو جہاں سے
بخشا دل و جاں سے اسے بخشا دل و جاں سے

شہ نے کہا تم دل سے خیال اور رکھو دور — کی مدح جو آنکھوں کی فقط مدح تھی منظور
ہے خلق پیمبر کے گھرانے کا تو مشہور — اور چشمِ کرم اپنے گھرانے کا ہے دستور
واللہ بدن پر بھی مجھے نیک نظر ہے
دو آنکھیں ہیں پر سب پہ مری ایک نظر ہے

پھر پوچھا کہ بخشا اسے وہ بولی کہ بخشا — شہ بولے ہم آزاد اسے کرتے ہیں اچھا
کچھ خرچ دو اس کو نہ کرے راہ میں فاقا — پوشاک بھی پہنا دو کہ حق تم پہ ہے اس کا
شیریں کوئی چیز اُن کے اب ہم سے نہ لے گی
ایک روز وہ ہوگا کہ یہ چادر تمہیں دے گی

تب دوڑ کے بانو نے گلے اُس کو لگایا — شبیر کی بہنوں نے لباس اُس کو پہنایا
پھر اپنے برابر اُسے زینب نے بٹھایا — تعظیم کی تکریم کی اور ہنس کے سنایا

فطرس کا شرف آج تجھے حق نے دیا ہے
شہزادۂ جبریل نے آزاد کیا ہے

شیریں نے تب اندوہ جدائی سے بھری آہ — اور شہ کے قدم چوم کے بولی وہ حق آگاہ
ہے عرض جو مجھ کو کبھی قابل کرے اللہ — تو ہدیہ شیریں ہو قبول حرم شاہ

بھجواؤں جو سوغات نہ رد کیجیو میری
مشکل میں پکاروں تو مدد کیجیو میری

تب حضرت سجاد پہ شیریں ہوئی قربان — اور بولی خونہاد سے ترا اللہ نگہبان
بابا سے سفارش مری تم کیجیو ہر آن — میں نے تمھیں پالا ہے ذرا اس کا رہے دھیان

عابد سے عجب طرح جدا ہوتی تھی شیریں
یاں روتے تھے سجاد وہاں روتی تھی شیریں

گہوارے سے شیریں نے تب اکبر کو اٹھایا — آنکھوں سے بہت ننھے سے تلووں کو لگایا
پھر جھولے کے اندر یہ دعا دے کے لٹایا — اللہ نبی کا مرے شہزادے پہ سایا

دنیا کا تجھے سب حشم و جاہ ہو اکبر
اور سونے کے سہرے سے ترا بیاہ ہو اکبر

اب عرض ہے شیریں کی تم اقرار یہ فرماؤ — ایسا نہ ہو تم بیاہ میں لونڈی کو نہ بلواؤ
یہ خادمہ بھی دیکھے دلھن بیاہ کے تم لاؤ — آباد رہو چین کرو زیست کا پھل پاؤ

ہاتف کی ندا آئی یہ مظلوم ازل ہے

تعزیہ میں اکبر کی فقط برچھی کا پھل ہے

القصہ گئی شاہ کے مجرے کو جو شیریں ۔ تب ہچکیاں لے لے لگی رونے غم دیں
گروشہ دیں پھر کے لگی کہنے وہ غمگیں ۔ قربان گئی روتے ہو کیا دو مجھے تسکیں

یا شاہ میں صدقے میں فدا پھر نہ ملو گے
اس طرح جو روتے ہو تو کیا پھر نہ ملو گے

اب دوسرے مقصد میں خدا اس کا ہے آگاہ ۔ یا تو مجھے قدموں سے لگا رہنے دو یا شاہ
یا گھر میں مرے آنے کا وعدہ کرو للّٰہ ۔ فرزند نبی کی میں ضیافت کروں دلخواہ

میراث نبی پائی ہے فرزند علی نے
فضہ کی ضیافت تو نہ روکی تھی نبی نے

شیریں سے مخاطب ہوئے یوں سید ابرار ۔ اچھا ترے گھر آنے کا میں کرتا ہوں اقرار
اس دن تجمل نہ تجھے بھوے گا زنہار ۔ عابد تو پیادہ مرا ہووے گا میں اسوار

پیاسا کئی دن کا ترے گھر آوے گا شبیر
پیاسا ہی ترے گھر سے چلا جاوے گا شبیر

وہ بولی بھلا جانے میں دوں گی تمہیں پیاسا ۔ حضرت نے کہا خیر سمجھ لیں گے جو ہوگا
پہونچانے کو شیریں کے گئے وہ تک آقا ۔ رستے سے کہا لے تجھے اللہ کو سونپا

کیجیو یہ دعا جین ملے غم سے ہمیں بھی
آزاد خدا کرے جہنم سے ہمیں بھی

قلعہ پہ غلام کے تھا مسکن شیریں ۔ ہمسایہ عزیزہ ایک یہودی تھا خوش آئین
جس شب یہ عجمی سوتا تھا وہ بندۂ حق بیں ۔ پھر عقد کو شیریں لی کیا خواب تھا شیریں

دیدار پیمبر کا ملا دین خدا کا
روشن کیا شیریں نے گھر اس اہلِ وفا کا

شوہر سے وہ ذکرِ شہِ دیں کرتی تھی اکثر
پہونچا ہے مجھے دور تلک آئے تھے سرور
کہتی تھی کبھی دو مری بی بی کے ہیں دلبر
نام ایک کا سجاد ہے اور ایک کا اکبر
دونوں سے عیاں قدرتِ ربِ ازلی ہے
بس نام خدا ایک نبی اور ایک علی ہے

گاہے یہ بیاں کرتی تھی وہ عاشقِ مولا
مولا مرے آئیں تو ذرا شرم نہ کرنا
میں لونڈی اوتی تو غلام ان کا ہے گویا
خدمت میں کمر بستہ سدا رہیو مہیا
وہ کہتا تھا تو ان کی ہیں ان کا یہ گھر ان کا
تقدیر یہ کہتی تھی کہ آئے گا سر اُن کا

دن پوچھتا تھا آمدِ مولا کے جو شوہر
تب کہتی تھی شوہر سے یہ وہ عاشقِ سرور
یہ پوچھنا میں بھول گئی وائے مقدر
تاریخ مقرر نہیں آنا ہے مقرر
کہتا ہے یہ دل آئیں گے مولا مرے گھر میں
یا ماہِ محرم میں و ماہِ صفر میں

شیریں کو عجب لذتِ سلطانِ امم تھی
ہر دم شہِ والا کی وہ مشتاقِ قدم تھی
آنکھ اس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی
پتلی صفتِ قبلہ نما سوئے حرم تھی
غش کرتی تھی اقرارِ امامِ دو جہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سدا دوڑ کے تڑکے اُسے آنا
اور شام کو دروازے سے روتے ہوئے جانا

گہ صبح سے مولا کے لئے فرش بچھانا اور شام کے نزدیک بصد یاس اٹھانا
شہ کے لیے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا جانا کیا فرزند پیمبر کا ستانا
مسلم کا مدینہ سے ہے کوفہ کو آنا آخر کو ہوئے شاہ بھی خیر سے روانا
واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں در بدر آقا کو پھراتی شیریں یہاں در پہ کبھی آتی کبھی جاتی
گھبرا کے کبھی کوہ کے نیچے اتر آتی رہ گیروں کو جا جا کے سر راہ سناتی
دنیا میں میں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمہیں کچھ دلبر زہرا کی خبر ہے

پائی جو نہ اس نے خبر سبط پیمبر رنج سے ہوئی تارک لذات وہ مضطر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر سونے کے لیے فرش و زمیں دونوں برابر
اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غم شہ میں چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بتا یہ ہے کیا حال پوشاک جو میلی ہے تو الجھے ہوئے ہیں بال
وہ کہتی تھی نیرنگ نظر آتا ہے امسال دریافت مجھی کو نہیں ہوتا مرا احوال
پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی
اللہ بس اب خیر کرے آل عبا کی

•
•

بند ہائے بالا حضرت مصنف کے زور بیان خلاقی سخن اور عالی خیالی سے
پورے طور پر خبر دیتے ہیں بلاشبہ جناب مرحوم اپنے جواب آپ تھے +

خاموشی ثنا ہے تو محو ثنا ہے تو

الحمد للہ کہ یہ دوسری جلد بھی بہارستان سخن کی تمام ہوئی، مگر مرثیہ نگاری کے لگاؤ سے راقم کا فرض منصبی تھا کہ اُستاد فن جناب فضیلت مآب مرزا اوج صاحب ادام اللہ تعالیٰ فاداتہ کے نمونہ کلام سے بھی اپنی تصنیف کو زینت دیتا، لیکن نہایت جائے حسرت ہے کہ حضرت ممدوح کا کوئی کلام اس ہیچمدان کو دستیاب نہ ہو سکا حالانکہ اِس ناچیز کو حضرت کے کلام بلاغت نظام سے مشرف ہونے کا اتفاق بارہا ہوا ہے آپ جناب سلطان الذاکرین مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہٗ فی الجنۃ کے ایسے خلف الصدق ہیں کہ ماشاء اللہ جنھوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت شاعری سے اپنے پدر بزرگوار کے نام نامی کو اوج بالائے اوج بخشا ہے پدر نامدار و پسر نامجو جناب اوج لاریب ایک بڑے رزمی شاعر ہیں آپ کا ندرت کلام تناسب مضامین اور فلسفانہ انداز بیاں بہت کچھ قابل قدر ہے آپ جناب میر انیس صاحب اور اپنے والد عالی مقام کی ترکیب شاعری سے بالکل ایک جداگانہ رنگ رکھتے ہیں اور یہ ایسا رنگ ہے کہ سخن فہم اسے آسانی کے ساتھ تمیز کر سکتا ہے مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ کوئی نمونہ حضرت شاد مدظلہ کی مرثیہ نگاری کا عدم دستیابی کی وجہ سے فقیر کی اس تصنیف میں داخل نہیں کیا جاسکا، آپ کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور نہایت قابل توجہ ہے۔ فقط

افکارِ غالب

اثرِ خامہ
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب

غالب نے ایک شعر میں دعویٰ کیا ہے کہ :-

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ہر چند مرزا کا ہمہ گیر تخیّل اس قابل ہے کہ شاید علم کو ہفت خوانِ شوق طے کرنے کے بعد بھی اس تک رسائی حاصل نہ ہو سکے تاہم اِن فن کاروں کی طرح بعض شخصیات بھی لطیف قوتِ حاسّہ کی کی مالک ہوتی ہیں اور قدرت نے انھیں ایسے دل و دماغ سے نوازا ہوتا ہے کہ وہ ہر بڑے صاحبِ علم و فن کے تخیّل و تفکّر کا احاطہ کر کے حتیٰ المقدور معنی کو آگہی کے دام میں مقید کر دیتی ہیں خلیفہ عبدالحکیم انھیں حضرات میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے متذکرہ بالا کتاب میں غالب کے فلسفیانہ اشعار کی شرح اس انداز سے کی ہے اور اس چابکدستی سے شعری پیکروں کو بے نقاب کیا ہے کہ بعض مقامات پر وہ شاعر سے زیادہ داد کے خود مستحق نظر آتے ہیں۔ غالب پر جس قدر بلند پایہ کتابیں تا حال لکھی جا چکی ہیں ان میں یہ کتاب اپنی انفرادیت اور افادیت کے لحاظ سے غالباً سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ غالب کے فن کو سمجھانے میں اہلِ قلم حضرات سے جو کوتاہیاں رہ گئی تھیں، انھیں خلیفہ صاحب نے بہ طریقِ احسن رفع کر دیا ہے اور غالب کی شاعری کا یہ تشنۂ تکمیل پہلو مکمل ہو کر منصّۂ شہود پر آگیا ہے ان معنوی خوبیوں کے علاوہ کتاب کی ظاہری ہیئت بھی جاذبِ نظر ہے۔

ناشر- مکتبہ معین الادب ۰ لاہور

نورِ وزیر پریس اردو بازار۔ لاہور